یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

اِنسانِ کامِل

اُستاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

اِنسانِ کامِل

استاد شہید مرتضیٰ مُطہریؒ

یکے از مطبوعات
جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی ۲

تالیف	آیۃ اللہ شیخ مرتضیٰ مطہری
ترجمہ	محمد فضل حق
اصلاح ونظر	کاظم علی گجراتی
کتابت	اشرف راحت
طباعت	مقصود پیکیجز کراچی

طبع ہفتم ۲۰۰۸ء مطابق ۱۴۲۹ھ

اسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدد ندیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اس نے اسے اعلیٰ احکام، بلند اصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمہارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو اس کے معتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اسے اس کا مناسب مقام دو۔

امام علی علیہ السلام

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ سید ابوالقاسم موسوی خوئیؒ کا قائم کردہ یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان اب حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی حسینی سیستانی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں دنیا بھر میں معتبر اسلامی لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو، انگریزی اور دیگر زبانوں میں متعدد کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوب بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ انسانیت کو صراط مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ ادارہ ہذا تقریباً ۵۰۰ مدارس و مکاتب میں زیر تعلیم بچوں اور جوانوں کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

دعوت اسلام ایک ایسا کام ہے جس کو فروغ دینے کے لئے ہم سب کو باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کار خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں عام کیا جاسکے۔

دعا ہے کہ خداوند منان بحق محمدؐ و آل محمدؐ ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

شیخ یوسف علی نفسی

وکیل حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیستانی دام ظلہ العالی

فہرست

کامِل اور غیر کامِل انسان ۹

اسلام کی رُو سے کامِل انسان کو پہچاننے کا معیار ۱۰

کامِل سے کیا مُراد ہے ؟ ۱۳

اَکْمَلْتُ اور اَنْعَمْتُ میں فرق ۱۴

آفاتِ رُوح ۲۳

مختلف موجودات کا کمال ۳۶

اِنسان کی ماہیت ۷۴

خُودشناسی خدُاشناسی کی تمہید ہے ۱۰۱

انسان کو کِس چیز سے نجات چاہیے ؟ ۱۱۰

کمال اور اَخلاق کا رابطہ ۱۳۸

مَکتبِ اِنتِفَاع ۱۶۲

کامِل انسان اور مختلف نظریات (۱) ۱۷۰

کامِل انسان اور مختلف نظریات (۲) ۱۹۳

کامِل انسان کے بارے میں اسلامی نظریہ ۲۲۰

انسان کا فِطرت سے رابطہ ۲۳۵

کامِل انسان اور مختلف نظریات (۳) ۲۴۶

مختلف مکاتبِ فِکر کے نظریات کی تفصیل (۴) ۲۷۴

مختلف مکاتبِ فِکر کے نظریات کی تفصیل (۵) ۳۰۲

دنیائے مغرب میں ایثار و محبّت ۳۲۰

حرفِ ناشر

زیرِ نظر کتاب میں "انسانِ کامل" کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی ۱۱ تقاریر کا مجموعہ ہے جو ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل کی گئی تھیں۔

ان تقاریر میں استاد شہید نے "انسانِ کامل" کے بارے میں مختلف مکاتبِ فکر کے افکار و نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلام کے "انسانِ کامل" کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔ آپ نے امام علی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس کو اسلام کے "انسانِ کامل" کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ استاد شہید کی تقاریر کو حرف بہ حرف لکھا جائے، اس لیے آپ کو کہیں کہیں جملہ بندی میں خامی محسوس ہوگی اگرچہ ہم نے بعض جگہ پر بہ اقتضائے ضرورت معنی میں تبدیلی کیے بغیر جملہ بندی میں تبدیلی کی ہے

ادارہ

پہلی نشست

کامل اور غیر کامل انسان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ بَارِئِ الْخَلَائِقِ اَجْمَعِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عَبْدِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَحَبِیْبِہٖ وَصَفِیِّہٖ وَحَافِظِ سِرِّہٖ وَمُبَلِّغِ رِسَالَاتِہٖ سَیِّدِنَا وَنَبِیِّنَا وَمَوْلٰنَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَمِیْدُ فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ: وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ.

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ انہوں نے پوری کر دیں تو خدا نے فرمایا: میں تمہیں لوگوں کا امام بناتا ہوں انہوں نے عرض کیا کہ بارالہا! میری ذریت میں سے بھی امام مقرر فرما۔ خدا نے فرمایا کہ میرا یہ عہدہ ستمگروں کو نہیں ملے گا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

ہمارا موضوع بحث ہے اسلام کے نقطۂ نگاہ سے کامل انسان۔ کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ اور ان کے مقابلے میں اعلیٰ اور ارفع ہو۔ اب آپ اسکو جن الفاظ سے بھی چاہیں تعبیر کریں۔ بہت سی دوسری چیزوں کی طرح انسان بھی کامل اور غیر کامل بلکہ معیوب اور

سالم ہوتا ہے۔ یعنی انسان معیوب بھی ہوتے ہیں اور سالم بھی ہوتے ہیں۔ پھر سالم انسان کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) سالم انسان جو کامل ہوتا ہے

(۲) سالم انسان جو غیر کامل ہوتا ہے

اسلام کے نقطۂ نگاہ سے کامل یا مثالی انسان کا پہچاننا ہم مسلمانوں پر اس لیے واجب اور لازم ہے کیونکہ وہ عالم انسانیت کے لیے نمونے اور مثال کا حکم رکھتا یعنی اگر ہم کامل مسلمان بننا چاہیں (کیونکہ اسلام ہمیں کامل انسان بنانا چاہتا ہے) اور اپنے آپ کو انسانی کمال کے درجے تک پہنچانا چاہیں تو فقط اسلامی تعلیم و تربیت کے تحت ہی ممکن ہے۔

چنانچہ ہمیں جاننا چاہیے کہ کامل انسان کیسا ہوتا ہے؟ کامل انسان کا چہرہ (یعنی اس کا روحانی اور معنوی چہرہ) کیسا ہوتا ہے؟ کامل انسان کا معنوی وجود کیسا ہوتا ہے اور کامل انسان کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ —— تاکہ ہم اپنے معاشرے، اپنے افراد اور خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی بنائیں۔ لیکن اگر ہم اسلام کی نظر میں ایک کامل انسان کو نہ پہچانیں تو ہم اسلام کی رو سے قطعاً ایک تام اور کامل مسلمان یا دوسرے لفظوں میں ایک کامل انسان نہیں بن سکتے، خواہ وہ کاملیت اعتباری ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کی رو سے کامل انسان کو پہچاننے کا معیار

اسلام کے نقطۂ نگاہ کے مطابق کامل انسان کو پہچاننے کے دو طریقے ہیں:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں قرآن نے اور پھر سنت نے جو بیانات ہیں

کامل انسان کی تعریف کیسے کی ہے۔ اگرچہ قرآن اور سنت میں "کامل انسان" کا نہیں بلکہ "کامل مسلمان" اور "کامل مومن" کا ذکر آیا ہے لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ کامل مسلمان کے معنی ایک ایسے انسان کے ہیں جو اسلام میں کمال کو پہنچا ہو اور کامل مومن سے مراد وہ انسان ہے جو ایمان کی بدولت کمال کو پہنچا ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن اور سنت نے کامل انسان کی کیا خصوصیات بیان کی ہیں اور اس کے چہرے مہرے کے لیے کونسے خطوط کھینچے ہیں؟ حسن اتفاق سے قرآن اور سنت میں اس موضوع پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم انسانوں میں سے معیاری افراد کو پہچانیں اور انہیں اپنے لیے نمونہ بنائیں —— ان افراد کو جن کے بارے میں ہمیں اطمینان ہو کہ وہ درجۂ کمال پر پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو اسی انداز میں ڈھالا ہے جیسے خدا چاہتا ہے اور جیسے اسلام چاہتا ہے یعنی وہ معیاری شخصیت کے مالک اور کامل انسان بن گئے ہیں۔ اسلام کا مطلوبہ کامل انسان فقط ایک تصوراتی، خیالی اور ذہنی انسان نہیں کہ جس کا کوئی ظاہری وجود نہ ہو ایسا اس لیے نہیں کہ بہت سے افراد ایسے گزرے ہیں جو انسانیت کے بلند ترین مدارج پر فائز ہوئے یا اس سے ایک یا دو درجے نیچے تک پہنچے۔ خود حضرت رسول اکرمؐ اسلام کے کامل انسان کا ایک نمونہ ہیں۔

اور امام علیؑ کامل انسان کا ایک اور نمونہ ہیں۔

اس لیے علیؑ کی پہچان —— اسلام میں کامل انسان کی پہچان ہے لیکن یہ علیؑ کی پہچان ہونی چاہیے نہ کہ یہ ان کے نام و نسب سے ان کی رسمی پہچان ہو۔

بعض اوقات ایک انسان علیؑ کو شناختی کارڈ کے اندراجات کی حد تک ہی پہچانتا ہے یعنی ــــ ان کا نام علیؑ تھا ــــ وہ ابوطالب کے بیٹے تھے اور ابوطالب ــــ عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ مزید یہ کہ علیؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن عبدالعزیٰ تھیں۔ وہ فاطمہ زہراؑ کے شوہر اور حسنؑ و حسینؑ کے والد تھے۔

بہت ہوا تو یہ جان لیا کہ علیؑ کس سال میں پیدا ہوئے ــــ کس سال میں شہید ہوئے اور انہوں نے کون کونسی جنگیں لڑی تھیں۔ یہ سب باتیں شناختی کارڈ کی سی پہچان میں آتی ہیں۔ یعنی اگر ہم علیؑ کے لیے ایک شناختی کارڈ جاری کرنا چاہیں تو اس کے لیے ان کے یہی کوائف معلوم کرنا ضروری ہوں گے۔ لیکن یہ علیؑ کی یعنی اسلام کے کامل انسان کی پہچان نہیں ہوگی۔ کیونکہ علیؑ کی پہچان کے معنی ان کے "شخص" ــــ کی پہچان نہیں بلکہ ان کی "شخصیت" ــــ کی پہچان ہے۔ گویا کہ ہمارے لیے علیؑ کی جامع شخصیت کا جس حد تک پہچاننا ممکن ہو اتنا ہی ہم نے اسلام کے ایک کامل انسان کو پہچانا ہے۔ پھر جہاں تک ہم اس کامل انسان کو اپنے لیے نمونہ قرار دیں اس کی راہ پہ چلیں اور (زبانی نہیں) عملی طور پر اسے اپنا امام اور پیشوا قرار دیں، خود اس کے تابع اور پیرو بنیں اور ہمیشہ کوشش کریں کہ اپنے آپ کو اس نمونے کی طرح پہ ڈھالیں تو پھر ہم اس کامل انسان کے شیعہ کہلا سکتے ہیں کیونکہ بقول شہید ثانیؒ:

"شیعہ وہ ہے جو امام علیؑ کی متابعت کرے۔" (لمعہ ــــ کتاب الوقت)

کوئی انسان فقط زبانی تعریفیں کرنے اور تعلق جتانے سے شیعہ نہیں بن جاتا بلکہ شیعہ تو امام علیؑ کی متابعت سے بنتا ہے۔ متابعت کے معنی ہمراہ ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ کوئی کہیں جانے لگتا ہے تو آپ اس کی متابعت کرتے ہیں، اس کے ہمراہ ہوتے اور اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ کسی کے ہمراہ ہو کر اس طرح چلنے کو

مشایعت کہتے ہیں۔ شیعہ علیؑ کے معنی بھی علیؑ کی عملی طور پر مشایعت کرنے والے کے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ کامل انسان کو پہچاننے کے دو طریقے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اس پہچان کے مفاد کا بھی علم ہو گیا ہے لیکن یہ فقط ایک فلسفیانہ اور علمی بحث نہیں ہے کہ اس کا ماحصل محض ایک علمی نکتہ ہو۔ بلکہ اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے اور اگر ہم اسلام کے کامل انسان کو قرآن کے بیان سے یا قرآن کی پروردہ شخصیتوں کی شناخت کے ذریعے سے نہ پہچانیں تو ہم اسلام کے معین کردہ راستے پر نہیں چل سکتے، حقیقی اور سچے مسلمان نہیں بن سکتے اور ہمارا معاشرہ ـــــ ایک اسلامی معاشرہ نہیں بن سکتا۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے کامل اور بلند مرتبہ انسان کو پہچانیں۔

"کامل" سے کیا مراد ہے؟

یہاں ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ درحقیقت ـــ "کامل" ـــ کے معنی کیا ہیں؟ بعض چیزیں بہت واضح ہوتی ہیں۔ لیکن جب انسان غور کرتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ دراصل ایسا نہیں ہے اور اس "واضح چیز" کے لیے بہت سی مشکل اور غیر واضح چیزوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے۔

عربی زبان میں "کمال" ـــ اور ـــ "تمام" ـــ دو الگ الگ الفاظ ہیں جو اپنے مفہوم میں ایک دوسرے کے نزدیک تو ہیں لیکن بعینہٖ ایک جیسے نہیں ہیں۔ البتہ ان دونوں الفاظ کی ضد میں ایک ہی لفظ آتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں ان کی ضد کے مفہوم میں ایک سے زیادہ لفظ موجود نہیں اور وہی لفظ کبھی ان

میں سے ایک کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے اس میں خود یہ دو الفاظ بھی نہیں ہیں۔ اس لیے فارسی میں بھی یہی عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ عربی کے ان دو الفاظ میں سے "کمال" اور دوسرا "تمام" ہے۔ پھر عربی میں بھی ان دو الفاظ کی بجائے بعض اوقات "کامل" کہا جاتا ہے اور بعض اوقات "تام" کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں اور ان کے برعکس جو لفظ بولا جاتا ہے وہ ہے "ناقص"۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ کامل ہے اور وہ ناقص ہے یا کہا جاتا ہے کہ یہ چیز تام (تمام) ہے اور وہ ناقص ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں :

ترجمہ: آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۳)

قرآن مجید نے یہ نہیں فرمایا کہ "اَتْمَمْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ" کیونکہ اگر "اَتْمَمْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ" فرماتا تو یہ عربی قواعد کی رو سے درست نہ ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی نہیں فرمایا کہ "اَكْمَلْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي" بلکہ فرمایا ہے کہ "اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي"۔

اَکْمَلْتُ اور اَتْمَمْتُ میں فرق

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں الفاظ میں فرق کیا ہے؟ اگر ہم ان دونوں کا باہمی فرق بیان نہ کریں تو اپنی بحث شروع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہماری بحث کی ابتدا ان دو لفظوں کے معانی سمجھنے ہی سے ہوتی ہے۔

تمام

"تمام" ۔ اس موقع پر کہا جاتا ہے جب ایک چیز میں وہ سب کچھ وجود میں آچکا ہو جو بنیادی طور پر اس کے لیے لازم ہو۔ یعنی اگر اس میں بعض چیزیں وجود میں نہ آئی ہوں تو بنیادی طور پر یہ چیز اپنی ماہیت میں ناقص ہے کیونکہ اس کا تمام (پورا جسم) وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کا کچھ حصہ وجود میں آیا ہے اور اس میں کچھ کسر باقی ہے یعنی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نصف وجود ہے" اس کا تہائی حصہ موجود ہے یا اس کا دو تہائی حصہ موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔ مثلاً اگر ایک بلڈنگ یا مسجد ایک نقشے کے مطابق تعمیر کی جاتی ہو اور اگر مسجد بنائی جائے تو اسکے لیے ایک ہال کی ضرورت ہوگی۔ پھر اس ہال کو دیواروں، دروازوں، چھت اور بہت سی چیزیں درکار ہونگی۔ اسی طرح جب تک ایک بلڈنگ کو وہ تمام چیزیں میسر نہ ہو جائیں جن کی اسے حاجت ہے، اس سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن چیزوں کے نہ ہونے سے وہ بلڈنگ مکمل نہیں ہوتی جب وہ مہیا ہو جائیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ بلڈنگ تام یا تمام ہے اور تمام کے بالمقابل صورت کو ناقص کہتے ہیں۔

کمال

"کمال" ۔ اس موقع پر کہا جاتا ہے جب ایک چیز "تمام" ہو جانے کے بعد ایک درجہ بلند تر جا سکتی ہو اور پھر اس بلند تر درجے سے بھی ایک درجہ بلند تر جا سکتی ہو وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس میں یہ کمال نہ بھی ہو تو بھی "تمام" اپنی جگہ پہ

موجود رہتا ہے اور اگر کمال ہو تو وہ چیز ایک درجہ بلند تر ہو جاتی ہے۔

"کمال" کو عمودی سمت میں اور "تمام" کو افقی سمت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ یعنی جب کوئی چیز افقی سمت میں اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ تمام ہوگئی اور اگر عمودی سمت میں حرکت کرے اور آخر تک پہنچے تو کہا جاتا ہے کہ وہ کمال کو پہنچ گئی۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی عقل کامل ہوگئی ہے' یعنی وہ پہلے بھی عقل رکھتا تھا لیکن اب اس کی عقل ایک درجہ بلند تر ہوگئی ہے یا کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا علم کامل ہوگیا ہے' یعنی وہ پہلے بھی علم رکھتا تھا اور اس سے استفادہ کرتا تھا لیکن اب اس کا علم ایک درجہ بلند تر اور کامل ہوگیا ہے اور اس نے کمال کا ایک [illegible] مرحلہ طے کر لیا ہے۔

پس ہمارے معاشرے میں کوئی تو "تمام" انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک انسان وہ ہوتا ہے جو افقی نقطۂ نگاہ سے ناتمام ہے۔ یعنی اس میں کسر ہے اور در حقیقت وہ نیم انسان ہے' تہائی انسان ہے' چوتھائی انسان ہے یعنی وہ ایک "تمام" انسان نہیں ہے۔ لیکن ایک "تمام" انسان اس آخری حد تک کامل اور کامل تر ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان اس سے بلند تر نہیں ہو سکتا۔ اسے ہم "انتہائی کامل انسان" کہتے ہیں جو انسانیت کی بلندی کی آخری حد ہے۔

"کامل انسان" کی اصطلاح اسلامی ادبیات میں ساتویں صدی ہجری سے استعمال ہونے لگی ہے۔ اس سے پہلے اسکا کوئی وجود نہ تھا۔ اگرچہ موجودہ دور میں یہ اصطلاح یورپ میں بھی عام ہوگئی ہے۔ تاہم یہ سب سے پہلے دنیائے اسلام میں ہی ظاہر ہوئی تھی۔ وہ پہلا شخص کہ جس نے کامل انسان کا مسئلہ

اٹھایا اور اسے کامل انسان کی اصطلاح سے تعبیر کیا ـــــ وہ مشہور عارف محی الدین عربی اندلسی طائی ہے۔

محی الدین عربی اسلامی عرفان کا باوا آدم ہے یعنی اسلامی دنیا کے تمام عرفاء کہ جنہیں آپ جانتے ہیں، وہ سب کے سب محی الدین ہی کے مکتب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ایرانی اور فارسی بولنے والے عرفاء بھی شامل ہیں جو ساتویں صدی کے شروع میں اور کچھ ساتویں صدی کے بعد بھی ہوئے ہیں۔ مولوی معنوی کو ہی لیجیے ـــــ وہ اپنی تمام عظمت کے باوجود عرفان کے معاملے میں محی الدین عربی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

محی الدین ـــــ عربی نژاد اور حاتم طائی کی اولاد میں سے تھے اور اندلس (موجودہ اسپین) کے رہنے والے تھے لیکن انہوں نے تمام اسلامی ممالک کے سفر کیے اور آخر شام میں فوت ہو گئے، جہاں ان کی قبر اس وقت بھی موجود ہے۔

صدر الدین قونوی ـــــ محی الدین عربی کے ایک شاگرد تھے، جن کا شمار محی الدین کے بعد بڑے بڑے عارفوں میں ہوتا ہے۔

اسلامی عرفان کو بڑی دقیق علمی صورت میں پیش کرنے کا کام محی الدین نے کیا اور صدر الدین قونوی نے اس کی تشریح اور توضیح کرنے کا فرض انجام دیا۔ مولوی معنوی ـــــ صدر الدین قونوی کے ہم عصر تھے۔ صدر الدین قونیہ کی ایک مسجد میں امام جماعت تھے اور مولوی معنوی وہاں جا کر ان کی اقتدا میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔

محی الدین عربی کے نظریات و تصورات انہی صدر الدین قونوی کے وسیلے سے مولوی معنوی کو منتقل ہوئے۔ یہ انوکھی اور نرالی باتیں جو آپ اس بارے میں سنتے

ہیں ان کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے کیونکہ اسلامی عرفان کے اصول کچھ اور ہیں اور وہ ان ڈھکوسلوں سے بالکل الگ ہیں جو آجکل بعض لوگ گھڑ گھڑ کر روزناموں اور رسالوں میں چھپواتے ہیں۔

محی الدین عربی نے جو مسائل پیش کیے ہیں، ان میں سے ایک "کامل انسان" کا مسئلہ ہے۔ لیکن اس نے یہ مسئلہ عرفان کے نقطۂ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ (اگر آئندہ مجالس میں اس بارے میں بحث کرنا ضروری ہوا تو میں اس موضوع پر قدرے زیادہ مفصل گفتگو کروں گا)۔

اگرچہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے اپنے نظریے سے کامل انسان کے بارے میں گفتگو کی ہے لیکن محی الدین عربی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے انسان کامل کی اصطلاح کو استعمال کیا اور اسے خاص عرفانی نقطۂ نگاہ کے ساتھ بیان کیا۔

اب جب کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ "کامل انسان" قرآن کے نقطۂ نگاہ کے مطابق کیسا ہوتا ہے؟ لہٰذا مجبوراً اپنی بحث "تمام انسان" اور "ناقص انسان"... سے شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ جب تک ہم یہ مرحلے طے نہ کریں اس مرحلے تک نہیں پہنچ سکتے۔

کیا ہمارے معاشرے میں سالم انسان اور معیوب انسان موجود ہیں؟ ان میں سے ایک پورا اور ایک ادھورا ہے، اس کا تعلق انسان کے تن اور بدن سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض انسان جسم کے لحاظ سے سالم ہیں اور بعض دوسرے معیوب یا مریض ہیں یا ان کے کسی عضو میں کوئی نقص ہے ممکن ہے کہ ایک شخص اندھا وغیرہ ہو، لیکن ان چیزوں کا تعلق ذاتِ انسان (یعنی وجود) سے ہے

کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر ایک انسان اندھا ہو یا بہرا ہو یا مفلوج ہو یا بدشکل ہو یا پست قد ہو تو آپ اس چیز کو اس کے لیے خامی یا نقص نہیں سمجھتے؟ ہاں! ان خامیوں کو آپ اسکی شخصیت اور انسان کے لحاظ سے نقص شمار نہیں کرتے۔ مثلاً سقراط ہی کو لیجیے —— یونان کا یہ معروف فلسفی جسے پیغمبروں کے راستے پر چلنے والا سمجھا جاتا ہے، دنیا کے انتہائی بدصورت افراد میں سے تھا۔ لیکن کوئی بھی اس کی بدصورتی کو انسان کی حیثیت سے سقراط کے لیے عیب نہیں سمجھتا یا جیسا کہ ابوالعلا معری نابینا تھا اور خود ہمارے زمانے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین بھی نابینا تھے کیا یہ اندھا پن ان کے جسم اور شخص (وجود) کا عیب ہے؟ یا ان کی شخصیت کا عیب اور نقص بھی شمار ہوتا ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے —— تو پھر یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ انسان دو چیزیں رکھتا ہے —— ایک شخص اور دوسرے شخصیت! وہ ایک تن رکھتا ہے اور ایک روح —— ایک جسم رکھتا ہے اور ایک روان! روح کا نظام جسم سے الگ ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی روح اس کے جسم کی تابع ہے، یہیں انھوں نے سو فیصد دھوکا کھایا ہے۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ جب انسان کا جسم سالم ہو تو کیا اس کی روح بیمار ہو سکتی ہے یا نہیں؟ —— یہ چیز بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔ جو لوگ روح اور اس کی حقیقت کے منکر ہیں اور انسان کے تمام روحانی خواص کو اس کے سلسلۂ اعصاب کا براہ راست اور بلا واسطہ نتیجہ سمجھتے ہیں، ان کے نظریے کے مطابق ہر چیز جسم کے تابع ہے اور روح کوئی اختیار نہیں رکھتی۔ اگر روح بیمار ہو تو لازمی طور پہ جسم بیمار ہوگا کیونکہ روح کی بیماری جسم ہی کی بیماری ہے۔

خوش قسمتی سے موجودہ زمانے میں یہ بات بڑی حد تک ثابت ہو گئی ہے۔

یعنی ممکن ہے کہ ایک انسان ــــ جسم، خون، خون کے سفید اور سرخ خلیوں کی تعداد، سلسلۂ اعصاب، بدن کی حیاتین اور میٹابولزم MATABOLISM کے لحاظ سے بالکل صحیح و سالم ہو۔ یہاں تک کہ ماہر طب اور ماہر عصبیات کی رائے کے مطابق یعنی طبی اور عصبی لحاظ سے بھی رتی بھر بیماری نہ رکھتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے بیمار ہو۔ مثلاً آجکل کی اصطلاح میں اسے عقدۂ روانی (نفسیاتی گرہ) COMPLEX کا مرض لاحق ہو۔ جو انسان عقدۂ روانی رکھتا ہو، اس کے بارے میں آجکل کا علم بتاتا ہے کہ وہ واقعی بیمار ہے۔ یعنی بغیر اس کے کہ اس کے جسمانی نظام میں کوئی خلل واقع ہو اس کے نفسیاتی نظام میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔ اس بنا پر ایسے نفسیاتی مریضوں کا علاج مادی دواؤں سے نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ایک ایسے شخص کو لیجیے جو ــــ "تکبر" کا عقدۂ روانی رکھتا ہے۔ اس کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ واقعی یہ ایک بیماری ہے ــــ واقعی روح اور روان کا خلل ہے۔ کیا اس کے لیے دواخانے سے ایسی دوائی حاصل کی جا سکتی ہے کہ اگر وہ انسان اسے کھالے تو اس کا تکبر تواضع میں بدل جائے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایک قسی القلب انسان یا ایک جلاد کو ٹیکے لگا کر اور گولیاں کھلا کر ایک مہربان اور شفیق انسان میں تبدیل کر دیں؟ اس کا علاج تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کے علاج کا طریقہ مختلف ہے۔ جیسا کہ بعض اوقات جسمانی بیماری کا علاج نفسیاتی طریقے سے اور نفسیاتی بیماری کا علاج جسم کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب مسئلہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیماری تو جسمانی ہوتی ہے لیکن کچھ ذہنی تحریکوں اور روحانی تقویتوں کے وسیلے سے انسان دوبارہ تندرست ہو جاتا ہے۔

یہ اس بات پر قطعی دلائل ہیں کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو جسم اور رُوح سے مرکب ہے لیکن رُوح جسم سے آزاد ہے اور اس کا تابع مطلق نہیں ہے اور حکما کے قول کے مطابق یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

روح — جسم پر اثر کرتی ہے — اور جسم رُوح پر اثر ڈالتا ہے۔ یہ بات اس امر پر دلیل ہے کہ انسان کا نفسیاتی نظام بذات خود ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

ہم کامل انسان کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق مفصل بحث کرنے سے پہلے ہم نے سالم انسان اور معیوب انسان کا جو ذکر کیا ہے یہ اس بحث کی تمہید کے طور پر ہے اور یقیناً لازم اور ضروری تھا۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس عیب اور سلامتی کا روح اور جسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہاں طبی اعتبار سے بحث کریں اور پھر تجربے کے بعد معلوم ہو کہ کونسا انسان سالم ہے اور فی الواقع اس کے بدن کے تمام اعضاء سالم ہیں۔ کیونکہ اس بات کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں اور بنیادی طور پر ہماری گفتگو بدن سے متعلق نہیں ہے۔ پس واقع میں یہ ممکن ہے کہ انسان نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے مریض و معیوب ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صحیح و سالم ہو۔ قرآن نے بھی اس اصول کو پذیرائی بخشی ہے۔ جیسا کہ ایک مقام پر آیا ہے:

"ان کے دلوں میں مرض تو تھا ہی اب خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا ہے۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۰)

یعنی ان کے دل اور روح میں مرض ہے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ان کی آنکھیں بیمار ہیں۔ قرآن نے جس قلب کا ذکر کیا ہے وہ بھی وہ قلب نہیں جس کا

ذکر علم طب میں ہے۔ بلکہ اس مقام پر انسان کے قلب سے مراد اس کی روح اور نفس ہے۔

نیز خدا قرآن کے بارے میں فرماتا ہے:

ﷺ اور ہم تو قرآن میں وہی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔ مگر وہ نافرمانوں کیلئے تو گھاٹے کے سوا کچھ بڑھاتا ہی نہیں۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۲)

یعنی ہم نے قرآن مومنین کے لیے شفا اور رحمت کے طور پر بھیجا ہے۔

امیر المومنین فرماتے ہیں:

"تقویٰ تمہارے دلوں کے مرض کی دوا ہے۔"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۱۹۶)

نیز فرماتے ہیں:

"بلاؤں اور مصیبتوں میں سے ایک فقر ہے —— اور فقر سے بدتر بدن کی بیماری ہے —— اور بدن کی بیماری سے شدید تر انسان کے قلب کی بیماری ہے۔"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۳۸۸)

قرآن مجید کا ایک مقصد انسان کو سالم انسان بنانا ہے لیکن اس سے پیشتر کہ ہم اپنے متعلق کامل انسان ہونے کی توقع رکھیں یا ایک کامل انسان کے نزدیک ہونا چاہیں —— ہمیں اپنا محاسبہ کرنا اور یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم بنیادی طور پر سالم انسان ہیں یا معیوب انسان ہیں۔

آفاتِ روح

جو چیزیں انسان کی روح پر آفت لاتی ہیں ہم یہاں ان کے حقیقی مآخذ کا مختصر طور پر ذکر کرتے ہیں :

علم نفسیات کی رو سے انسان کی محرومیاں اس کی بیماریوں کا سبب بن جاتی ہیں۔ یعنی اپنی محرومیوں کا احساس انسان کی بہت سی نفسیاتی گرہوں اور نفسیاتی بیماریوں کا مآخذ ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں فرائیڈ نے بالخصوص جنسی امور میں زیادہ تر اسی محرومیت کے مسئلے پر انحصار کیا ہے۔ بہرحال یہ چیز بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہ انسان کی محرومیاں ان کے اندر بیماریاں پیدا کرتی ہیں بعض اوقات انسان اپنے دل میں کسی شخص کے بارے میں کینے کا احساس کرتا ہے، اس سے انتقام لینا چاہتا ہے اور جب تک اسے ملیامیٹ نہ کرلے آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ انسان کے اندر کینہ اور انتقام جوئی کی حس کیا چیز ہے ؟ یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔

ایک حاسد انسان جو دوسروں کے پاس کوئی نعمت دیکھتا ہے تو وہ اپنے لیے فکر نہیں کرتا، اس کی تمام تر آرزو یہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں سے وہ نعمت چھن جائے۔ سالم انسان حسد نہیں کرتا بلکہ وہ ہمیشہ اپنے بارے میں سوچتا ہے کہ کیونکر آگے بڑھے۔ اگر ایک انسان ہمیشہ اس فکر میں ہو کہ خود آگے بڑھے تو یہ اس کا عیب نہیں اور وہ سالم ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو ہمیشہ یہ فکر دامنگیر رہے کہ دوسرا اس سے پیچھے رہ جائے تو وہ نفسیاتی بیمار اور مریض ہے۔ حتیٰ کہ آپ دیکھیں گے کہ حاسد لوگ بعض اوقات اس مرحلے پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ خود

سو درجے نقصان اٹھائیں تاکہ دوسرے کو پچاس درجے نقصان پہنچے!

ایک مشہور تاریخی داستان ہے جو تاریخ کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی خلیفہ کے زمانے میں ایک دولتمند شخص نے ایک غلام خریدا۔ اس نے پہلے ہی دن سے اس کے ساتھ ایک غلام جیسا نہیں بلکہ ایک آقا جیسا سلوک کرنا شروع کیا۔ یعنی وہ اس غلام کو بہترین خوراک اور بہترین پوشاک دیتا اور ہر قسم کی آسائش بہم پہنچاتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اپنے بیٹے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر محبت سے پیش آتا تھا اور اسے وافر مقدار میں روپیہ پیسہ دیتا تھا۔

وہ غلام دیکھتا تھا کہ اس کا آقا ہمیشہ سوچ بچار میں اور پریشان پریشان رہتا ہے۔ آخر ایک دن اس نے اپنے غلام کو بہت سی رقم دینے اور آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تب ایک رات اس دولتمند شخص نے اپنے غلام سے اپنا دکھڑا بیان کیا اور کہا:

"اے غلام! میں چاہتا ہوں کہ تمہیں آزاد کر دوں اور اتنی ساری رقم بھی تمہیں دے دوں۔ لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارا اس قدر خیال کیوں رکھتا ہوں؟"

غلام نے پوچھا: "کس لیے؟"

دولتمند شخص نے جواب دیا: "فقط ایک فرمائش کی خاطر ——— کہ اگر تم وہ ایک فرمائش پوری کر دو تو جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے وہ تمہارے لیے حلال ہوگا۔ لیکن اگر تم میری وہ فرمائش پوری نہ کر دو گے تو میں تم سے راضی نہیں ہونگا۔ اگر تم مان جاؤ اور میری فرمائش پوری کر دو تو میں

تمہیں کچھ اور مال بھی دوں گا۔"

غلام نے کہا: "آپ میرے لیے ولیٔ نعمت ہیں ـــــ آپ نے مجھے خوشگوار زندگی دی ہے ـــــ آپ جو کچھ بھی کہیں گے میں وہ ضرور کروں گا۔"

اس نے کہا: "نہیں! بلکہ تمہیں قطعی وعدہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہارے سامنے اپنی تجویز پیش کروں اور تم انکار کردو۔"

غلام نے کہا: "آپ کی جو بھی تجویز ہے وہ بتائیے!"

جب آقا نے اس سے پختہ قول لیا تو کہا: "میری تجویز یہ ہے کہ ایک خاص مقام اور وقت پر جس کے بارے میں میں تمہیں حکم دوں۔ تم میرا سر تن سے الگ کردو اور ......"

غلام نے کہا: "کیا مطلب؟"

آقا نے کہا: "میں یہی چاہتا ہوں۔"

غلام نے کہا: "یہ تو ناممکن ہے۔"

آقا نے کہا: "بہرحال میں نے تم سے قول لے لیا ہے اور بات صرف اتنی ہی ہے اور ......"

چنانچہ اس نے غلام کو آدھی رات کے وقت جگایا ـــــ ایک تیز چھری اس کے ہاتھ میں دی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسے ہمسائے کے گھر کے پچھواڑے لے گیا۔ پھر وہ وہاں لیٹ گیا اور نقدی کی ایک تھیلی غلام کو دی اور کہا: "تم یہیں میرا سر کاٹ دو اور ـــــ جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔"

غلام نے پوچھا: "آخر کیوں؟"

اس نے جواب دیا: "اس لیے کہ اب جیتے جی میں اس ہمسائے کو نہیں

دیکھ سکتا۔ کیونکہ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے آگے نکل گیا ہے۔ بس اب میرے لیے زندہ رہنے کی بجائے مر جانا ہی بہتر ہے۔ میں اس کا رقیب تھا اور وہ میرا رقیب تھا۔ لیکن اس نے مجھ پر سبقت حاصل کر لی ہے اور میں گویا آگ میں جل رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے سے ایک قتل اس کے ذمے لگ جائے اور اس کے نتیجے میں وہ قید خانے میں پہنچ جائے تو مجھے سدا کا چین مل جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا رقیب وہی ہے۔ اگر میں یہاں مارا جاؤں گا تو کل پوچھا جائے گا کہ اسے قتل کس نے کیا ہے۔ تب کہا جائیگا لازماً اس کے رقیب نے ہی قتل کیا ہے۔ کیونکہ اس کی لاش بھی اسی کے پچھواڑے سے ملی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ پکڑا جائے گا اور بالآخر اسے پھانسی چڑھا دیا جائے گا۔ جب یہ صورت بن جائے گی تو میرا مقصد حاصل ہو جائے گا۔"

غلام نے سوچا: "یہ اتنا احمق آدمی ہے تو میں یہ کام کیوں نہ کروں؟
____ ہاں تم فقط قتل کیے جانے کے قابل ہو۔" (حاضرین کی ہنسی) یہ کہہ کر غلام نے اس احمق حاسد کا سر کاٹا اور نقدی کی تھیلی لیکر چلتا بنا۔

صبح ہوتے ہی قتل کی یہ خبر ہر جگہ پھیل گئی۔ اس دولتمند آدمی کے رقیب کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں کہا گیا کہ اگر یہ قاتل ہوتا تو اسے اپنے گھر کے پچھواڑے میں قتل نہ کرتا۔ اس طرح قتل کا معاملہ ایک معمہ بن کر رہ گیا۔ دوسری طرف اس غلام کے ضمیر نے اسے چین نہ لینے دیا۔ وہ حاکم وقت کے دربار میں حاضر ہوا اور حقیقت حال بیان کرتے ہوئے کہنے لگا:

"امر واقعہ یہ ہے کہ اسے میں نے قتل کیا ہے اور خود اس کے تقاضا کرنے پر قتل کیا ہے۔ وہ حسد کی آگ میں اس طرح جل رہا تھا کہ موت کو زندگی

پر ترجیح دینا تھا۔"

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اصل ماجرا کیا ہے تو غلام کو بھی چھوڑ دیا گیا اور اس پہلے قیدی کو بھی آزاد کر دیا گیا۔

ہاں! یہ ایک حقیقت ہے کہ حسد واقعی ایک بیماری ہے اور انسان حسد کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

قرآن فرماتا ہے :

"جس نے اپنے نفس کو پاک صاف رکھا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گناہ کر کے دبا دیا وہ نامراد رہا۔" (سورۂ شمس، آیت ۹-۱۰)

پس قرآن مجید کا پہلا مقصد تزکیۂ نفس ہے یعنی قرآن مجید نفس کو بیماریوں، گرہوں، تاریکیوں، پریشانیوں اور سرکشیوں سے الگ رکھنا بلکہ مسخ ہونے سے بچانا چاہتا ہے۔

نفس کے مسخ ہونے کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے، مگر سوال یہ ہے کہ مسخ ہونے سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ کہا جاتا ہے اور آپ نے سنا ہو گا کہ گزشتہ امتوں میں کچھ ایسے لوگ ہوئے کہ جنہوں نے بہت گناہ کیے۔ اس وقت کے پیغمبر نے ان پر لعنت کی اور اس کے نتیجے میں وہ مسخ ہو گئے۔ یعنی وہ حیوان کی صورت میں تبدیل ہو گئے ـــــ مثلاً بندر بن گئے یا بھیڑیے، ریچھ یا کسی دوسرے حیوان کی صورت میں بدل گئے اور اسے کہتے ہیں "مسخ ہونا" ـــــ

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی انسان مسخ ہو گئے۔ یعنی حیوان بن گئے؟ یہاں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ اگر انسان جسمانی لحاظ سے مسخ نہ ہو اور ایک حیوان کی شکل میں تبدیل نہ بھی ہو، تو بھی اس کا روحانی اور معنوی لحاظ سے مسخ

ہو جانا ممکن ہے۔ یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ روحانی طور پر ایک حیوان میں تبدیل ہو جائے۔ بلکہ ایک ایسے حیوان میں تبدیل ہو جائے کہ اتنا بڑا اور مکروہ حیوان ساری دنیا میں موجود نہ ہو۔

چنانچہ قرآن مجید بھی ان لوگوں کی بات کرتا ہے کہ جو چوپایوں سے بھی گھٹیا ہیں۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۷۹)

کیا یہ ممکن ہے کہ روح کے لحاظ سے انسان واقعی ایک حیوان میں تبدیل ہو جائے؟ جی ہاں ــــ انسان کی شخصیت اس کی اخلاقی اور روحانی خاصیتوں سے بنتی ہے۔ اگر انسان میں روحانی خاصیتیں نہ ہوں بلکہ اس میں ایک درندے اور ایک چوپائے کی عادتیں اور خاصیتیں ہوں تو وہ واقعی مسخ شدہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی روح واقعی مسخ ہو جاتی ہے اور وہ ایک حیوان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

حیوانوں میں سے سؤر ہی کو لیجیے ــــ اس کا جسم اس کی روح سے مناسبت رکھتا ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ایک انسان کی تمام خصلتیں سؤر کی سی ہوں۔ اگر ایسا ہو تو وہ انسانیت کے رتبے سے گر چکا ہے۔ یعنی اپنے باطن میں ــــ حقیقت کی نگاہ میں اور عالم بالا میں وہ سؤر ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

پس ایک معیوب انسان بعض اوقات مسخ شدہ انسان کے مرحلے پر پہنچ جاتا ہے۔ ہم ان مسخ شدہ لوگوں کے متعلق کم سنتے ہیں اور شاید بعض لوگ یہ خیال کریں کہ یہ مجازاً ایسا کہا گیا ہے اور اس پر انہیں دیر سے یقین آئے گا

______ لیکن یہ حقیقت ہے۔

ایک شخص کا بیان ہے:

ہم امام سجادؑ علیہ السلام کے ساتھ مکہ گئے۔ جب ہم نے صحرائے عرفات پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ وہاں زیادہ سے زیادہ تیس چالیس ہزار حاجی ہیں جب اس نے اس سے اوپر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ اس صحرا میں حاجیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس نے امام علیہ السلام سے عرض کیا: یعنی الحمد للہ کہ اس سال کتنے زیادہ حاجی ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: "شور کرنے والے کتنے زیادہ اور حج کرنے والے کتنے کم ہیں۔ (سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۱۷، اثبات الہداۃ جلد ۵ صفحہ ۳۹)۔

وہ شخص مزید کہتا ہے:

مجھے اس کا علم نہیں کہ امامؑ نے کیا کیا، مجھے کیسی بصیرت دی اور کونسی آنکھ میرے اندر بینا کر دی ______ پھر اچانک آپ نے مجھ سے فرمایا: "اب دیکھو! میں نے اچانک نگاہ کی اور دیکھا کہ صحرائے عرفات جانوروں کی ہنہناہٹ سے ایک چڑیا گھر بنا ہوا ہے، جہاں فقط چند انسان حیوانوں کے درمیان چل پھر رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا: "اب تم نے دیکھ لیا؟ یہ ہے اس معاملے کا باطن!"

اہلِ معنی اور اہلِ باطن کی نظر میں یہ چیز روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے۔ اب اگر ہمارے تجدد پسند اشخاص کا ذہن اسے قبول نہ کرنا چاہے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔

خود ہمارے زمانے میں ایسے افراد ہوئے اور ہیں جو انسانوں کی حقیقت

کا ادراک کر سکتے ہیں اور اسے دیکھ سکتے ہیں۔ جو انسان ایک چوپائے کی طرح کھانے، سونے اور جنسی عمل کے علاوہ کچھ نہ جانتا ہو، اس کی روح بنیادی طور پر ایک چوپائے کی طرح ہے اور اس کا باطن واقعی مسخ ہو چکا ہے۔ یعنی انسانی حقیقتیں اور انسانیت اس سے مکمل طور پر چھن گئی ہے اور اس نے خود اپنے لیے حیوانی خصلتیں اختیار کر لی ہیں۔

جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

> ﷺ جس دن صور پھونکا جائے گا اور تم لوگ گروہ در گروہ حاضر ہو گے۔ آسمان کھول دیے جائیں گے تو ان میں دروازے بن جائیں گے۔ پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہو کر رہ جائیں گے۔ (سورہ نبأ۔ آیت ۱۸ تا ۲۰)

قیامت کے دن لوگ گروہ در گروہ محشور ہوں گے۔ پیشوایانِ دین نے بار بار کہا ہے کہ لوگوں کا فقط ایک گروہ انسان کی شکل میں محشور ہو گا اور دوسرے گروہ حیوانات کی شکل میں محشور ہوں گے۔ چنانچہ کچھ گروہ چیونٹیوں کی شکل میں، کچھ گروہ سانپوں کی شکل میں، کچھ گروہ بچھوؤں کی شکل میں، کچھ گروہ بندروں کی شکل میں اور کچھ گروہ [illegible] کی شکل میں اٹھائے جائیں گے۔

کیوں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدائے تعالیٰ بلاوجہ ایک انسان کو حیوان کی شکل میں تبدیل کر دے؟ نہیں ـــــ بلکہ جو شخص دنیا میں بچھو بن کر رہا۔ سوائے ڈنک مارنے کے اس نے کوئی کام نہ کیا اور دوسروں کو ایذا پہنچانے میں ہی لذت محسوس کرتا رہا، وہ اپنی حقیقی شکل یعنی بچھو کی شکل میں محشور ہو گا۔ جو شخص اپنی خصلت میں بندر ہو اور اس نے دنیا میں بندروں جیسی حرکتوں کے علاوہ کچھ

نہ کیا ـــــــ وہ قیامت کے دن یقیناً ایک بندر کی شکل میں محشور ہو گا۔ نیز جو شخص اپنے طور طریقے میں ایک کتا ہے، وہ ایک کتے ہی کی شکل میں محشور ہو گا۔

قیامت کے دن لوگ اپنی نیتوں، مقصدوں، خواہشوں، خصلتوں اور اپنی حقیقی صفتوں کے ساتھ محشور ہوں گے۔ آپ اس دنیا میں کیا ہیں، کیا بننا چاہتے ہیں اور کس چیز کی خواہش رکھتے ہیں؟ کیا آپ کی خواہشات ایک انسان کی خواہشات ہیں یا ایک درندے یا ایک پرندے کی ہیں؟ آپ کی خواہشات جس حیوان کی سی ہیں آپ وہی ہیں اور جیسے کچھ ہیں، آپ ویسے ہی محشور ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں خدا کی پرستش کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ہم جس چیز کی پرستش کرتے ہیں وہی بن جاتے ہیں۔ اگر ہم زر پرست بن جائیں تو روپیہ پیسہ ہماری ذات اور ہمارے وجود کا جزو بن جاتا ہے۔ یہی روپیہ پیسہ قیامت کے دن کی وہ پگھلی ہوئی دھات ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ دھات دنیا میں جن کے وجود کا جزو بن گئی اور اس دھات کی ملکیت اور اس کی پرستش کے علاوہ ان کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ وہ آخرت میں بھی اس دھات کی شکل میں ہوں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

لہ "جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے جاتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے رسولؐ!) ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔ جس دن وہ مال جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پشتیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا، یہ ہے جسے تم نے اپنے

پیے جمع کر رکھا تھا" (سورۂ توبہ۔آیت ۳۴-۳۵)

آپ یہ نہ کہیے کہ اب دھات کے سکے تو ناپید ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ کرنسی نوٹوں نے لے لی ہے۔ کیونکہ دوسری دنیا میں ہر چیز کی ماہیت مختلف ہے اور وہاں کے نوٹ بھی ایسی آگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو انسان کو زرد اور سفید دھاتوں سے زیادہ جلاتی ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو مسخ کر دیتی ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ آج رات معیوب انسان اور سالم انسان کے مسئلے کی جانب مجمل طور پر اشارہ کرتے ہوئے بتاتا چلوں کہ جو انسان اپنے اندر کوئی نفسیاتی عقدہ اور بیماری رکھتا ہو' وہ معیوب انسان ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو کسی مادی چیز کی پرستش کرتا ہے یعنی وہ اسے اپنے استعمال میں نہیں لاتا ــــــ بلکہ اس مادی چیز کو جمع کرنے میں لگا رہتا ہے۔ وہ ایک معیوب اور مسخ شدہ انسان ہے۔

ماہ رمضان کی یہ راتیں دعا اور احیاء کی راتیں ہیں' بلکہ اس بابرکت مہینے کی تمام راتیں احیاء اور دعا کے لیے خاص ہیں۔ کیونکہ اس مہینے کا بنیادی مقصد انسان سازی ہے۔ یعنی اس مہینے کا مقصد یہ ہے کہ ان دنوں اور راتوں میں معیوب انسان اپنے آپ کو سالم انسانوں میں اور سالم انسان اپنے آپ کو کامل انسانوں میں تبدیل کریں۔

ماہِ رمضان کا مقصد تزکیۂ نفس کے ذریعے سے افراد انسانی کے عیوب اور نقائص رفع کرنے کے علاوہ معاشرتی خرابیوں کی اصلاح بھی ہے یہ وہ مہینہ ہے جس میں عقل' ایمان اور ارادہ نفسانی خواہشات پر قابو پالیتے ہیں۔ یہ خدا کی پرستش کرنے' دعائیں مانگنے' خدا کی جانب پرواز اور بالآخر

روح کی بلندی اور ارتقاء کا مہینہ ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ایک انسان ماہ رمضان کے تیس دن بھوک، پیاس برداشت کرے اور ایک سے دوسری مجلس میں شریک ہو، یہاں تک کہ عید الفطر آجائے۔ پھر ہم دیکھیں کہ مہینے کے آخر میں اس میں رتی بھر تبدیلی بھی نہیں آئی یا یہ کہ وہ پہلے سے بھی بدتر ہو گیا ہے تو ایسے روزے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ لوگ فقط اپنے منہ باندھے رہیں، بلکہ روزے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان اپنی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہماری روایات میں آیا ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں روزے سے سوائے بھوک کے کچھ نہیں ملتا۔ انسان کا حلال غذا کو چھوڑ دینا اس لیے ہے کہ وہ تیس دن تک ترک غذا کی مشق کرے تاکہ پھر وہ حرام باتیں کہنے سے اپنی زبان کو بند کر لے یعنی وہ غیبت نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، بدکلامی نہ کرے اور حلال غذا استعمال کرے۔

کیا آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا کہ ایک عورت رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئی اور وہ روزے سے تھی۔ رسول اکرمؐ نے اسے دودھ یا کوئی اور چیز اسے دی۔ اور فرمایا: اس کو پی لو!

اس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں روزے سے ہوں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں ـــــ تم روزے سے نہیں ہو۔ یہ پکڑو اور پی جاؤ۔

اس نے دوبارہ کہا: یا رسول اللہؐ! میرا روزہ ہے۔

آنحضرتؐ نے اصرار کیا اور فرمایا: لو یہ پی لو!

اس عورت نے پھر یہی کہا کہ میرا روزہ ہے۔ کیونکہ اپنے فہم کے مطابق وہ

واقعی روزے سے تھی۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: تم روزے سے کیسے ہو سکتی ہو جب کہ ایک ساعت پہلے تم نے اپنے مومن بھائی یا مومن بہن کا گوشت کھایا ہے، کیونکہ تم نے اس کی غیبت کی ہے ــــــ کیا تم چاہتی ہو کہ میں ابھی تمہیں دکھا دوں کہ تم نے اس کا گوشت کھایا ہے؟ تم یہاں ابھی قے کر دو!

جب اس عورت نے قے کی تو اچانک گوشت کا ایک لوتھڑا اس کے منہ سے گرا۔ اُف! ایک آدمی روزہ بھی رکھے اور غیبت بھی کرے! یعنی وہ اپنے جسم کا منہ تو حلال غذا سے بند کر لے اور اپنی روح کا منہ حرام غذا کے لیے کھول دے!

جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب کوئی انسان ایک جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے بدبو بلند ہوتی ہے جو ساتوں آسمانوں تک جاتی ہے اور اس سے فرشتوں کو تکلیف پہنچتی ہے لیکن یہ سات آسمان یہ ظاہری آسمان نہیں ہیں بلکہ وہ سب کے سب بطون عالم اور ملکوت عالم ہیں۔ بعض اوقات پوچھا جاتا ہے کہ جہنم میں اتنی بدبو کیوں ہے؟ ہاں تو جہنم میں بدبو وہی ہے جو ہم اپنی دنیا میں پیدا کرتے ہیں، وہ وہی جھوٹ ہیں جو ہم بولتے ہیں۔ یہی کیفیت گالی بکنے کی ہے۔ پھر تہمت لگانا تو سب سے بڑھ کر ہے۔ تہمت لگانے میں جھوٹ کی برائی کے ساتھ غیبت کی برائی بھی شامل ہے۔ جو آدمی غیبت کرتا ہے وہ لوگوں کی خامیاں جو ان میں موجود ہوتی ہیں بیان کرتا ہے۔ جس آدمی کا لہجہ سخت ہو وہ پیٹھ پیچھے برائی نہیں کرتا اور جو آدمی جھوٹ بولتا ہے وہ اس میں کسی کی بدگوئی نہیں کرتا لیکن جو آدمی تہمت لگاتا ہے وہ آنِ واحد میں جھوٹ بھی بولتا ہے اور غیبت بھی کرتا ہے یعنی وہ بیک وقت دو کبیرہ گناہ کرتا ہے۔

وائے ہے اس دن پر کہ ایک ماہِ رمضان گزر جائے اور اس میں ہم نے ایک دوسرے پر کئی ایک تہمتیں لگائی ہوں۔

ماہِ رمضان اس لیے آتا ہے کہ اس مدت میں زیادہ سے زیادہ مسلمان جمع ہوں اور اجتماعی عبادات انجام دیں، نہ یہ کہ ماہ رمضان تفرقہ کا باعث ہو۔

لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

و صلی اللہ علی محمد و آلہ الطاہرین

دوسری نشست

مختلف موجودات کا کمال

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ انھوں نے پوری کردیں۔ تب خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انھوں نے عرض کی اور میری اولاد میں سے ــــــ خدا نے فرمایا کہ ہاں مگر میرے اس عہدے پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہوسکتا۔

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

ہر موجود کا کمال دوسرے موجود کے کمال سے مختلف ہے۔ مثلاً "کامل انسان" "کامل فرشتہ" سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایک فرشتہ اپنے فرشتہ ہونے میں کمال کی ممکن اعلیٰ اور آخری حد تک پہنچ جائے تو وہ اس سے مختلف ہے کہ ایک انسان اپنے انسان ہونے میں کمال کی آخری حد تک پہنچ جائے۔ کیونکہ وہی ہستیاں جنھوں نے ہمیں فرشتوں کے وجود سے آگاہ کیا ہے، انھوں نے ہمیں بتایا ہے کہ

فرشتے وہ موجودات ہیں جو عقلِ محض، اندیشۂ محض اور فکرِ محض سے پیدا کیے گئے ہیں، یعنی ان میں خاکی، مادی، شہوانی، غضبی وغیرہ کیفیات وجود نہیں رکھتیں۔ ایسے ہی حیوانات ہیں کہ وہ محض خاکی ہیں اور جس چیز کو قرآن مجید روحِ خدائی کہہ کر متعارف کراتا ہے وہ اس سے بے بہرہ ہیں۔

پس انسان ہی ایک ایسا موجود ہے جو ان اوصاف سے مرکب ہے جو علوی (فرشتوں) اور خاکیوں میں وجود رکھتے ہیں۔ انسان ایک ایسا موجود ہے جو ملکوتی بھی ہے اور ملکی بھی ...... "علوی" بھی ہے اور "سفلی" بھی یہ تعبیر ایک حدیث کے متن سے ماخوذ ہے جو اصول کافی میں آئی ہے۔

> بے شک خدا نے فرشتوں کو عقل دی اور شہوت نہیں دی، حیوانوں کو شہوت دی اور عقل نہیں دی اور انسانوں کو عقل و شہوت دونوں دی ہیں ...... پس جس انسان کی عقل اس کی شہوت پر غالب ہو ...... وہ فرشتے سے بہتر ہے اور جس انسان کی شہوت اس کی عقل پر غالب ہو وہ حیوان سے بدتر ہے۔
>
> (علل الشرائع، باب ۶ صفحہ ۴۔ الوسائل جلد ۱۱ صفحہ ۱۶۴)

یہ روایت اہلِ سنت کے ہاں بھی اس سے ملتی جلتی عبارت کے ساتھ موجود ہے اور مولوی معنوی نے بھی مثنوی میں اس حدیث کو نظم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

(۱) حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے دنیا میں تین قسم کی مخلوق پیدا کی ہے۔

(۲) ایک گروہ کو پوری عقل اور وجود کا علم عطا کیا اور وہ فرشتہ ہے جو رکوع و سجود کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔

(۳) فرشتے کے عنصر میں حرص و ہوا نہیں ہے اور وہ نور مطلق ہے جو خدا کے عشق سے زندہ ہے۔

(۴) ایک دوسرا گروہ ہے جو دانش سے خالی ہے اور وہ حیوان ہے جو گھاس کھا کر موٹا ہوتا ہے۔

(۵) وہ اصطبل اور گھاس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا، وہ شقاوت اور شرافت سے بے خبر ہے۔

(۶) تیسرا گروہ آدم زاد اور بشر ہے۔ جس میں آدھے اوصاف فرشتے کے اور آدھے گدھے کے ہیں۔

(۷) گدھے کے آدھے اوصاف سے وہ پستی کی جانب مائل ہوتا ہے اور فرشتے کے آدھے اوصاف سے بلندی کی جانب مائل ہوتا ہے۔

(۸) دیکھیے اس بلندی اور پستی کی جنگ میں کون غالب آتا ہے اور ان دونوں میں سے کون بازی لے جاتا ہے۔

(مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۳۱۶)

پھر کہتے ہیں کہ ایک گروہ نورِ مطلق سے پیدا کیا گیا ہے اور ایک گروہ غصے اور شہوت سے کہ جس سے مراد حیوانات ہیں، لیکن انسان کو خدا نے مرکب پیدا کیا ہے۔ کامل انسان اور کامل حیوان میں فرق ہے۔ ایک اعلیٰ، مثالی اور کمال کی حد تک پہنچا ہوا گھوڑا ایک کامل انسان سے مختلف ہے۔ ایک کامل انسان ایک کامل فرشتہ بھی باہم مختلف ہیں۔ ان دونوں جنسوں سے کامل انسان کا فرق اس کی ذاتی ترکیب کی بنا پر ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

؎ "ہم نے انسان کو ایک نطفے سے پیدا کیا ہے۔ جس میں (آجکل کی اصطلاح کے مطابق) بہت سے اجزا ملے ہوئے ہیں۔

اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں بہت زیادہ صلاحیتیں ہیں اور وہ اس مرحلے میں پہنچ چکا ہے کہ ہم اسے آزما کر دیکھیں۔ یعنی وہ مرکب نطفہ انسان کی شکل میں کمال کی اس حد پر پہنچ گیا ہے کہ ہم نے اسے آزاد، مختار اور ذمہ داری اٹھانے کے لائق قرار دیا ہے۔ پھر اس کی اسی صلاحیت کی بدولت اسے امتحان اور آزمائش میں ڈالا اور سزا و جزا کے قابل ٹھہرایا ـــــ لیکن دوسری مخلوقات میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔

"پس ہم نے اسے سنتا، دیکھتا بنایا، ہم نے اس کو راستہ بھی دکھا دیا۔ اب وہ خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا ہو۔"

(سورۂ دہر۔ آیت ۲-۳)

انسان کی آزادی و اختیار اور اس آزادی و اختیار کی بنیاد کو اس سے بہتر اور زیادہ خوبصورت طریقے سے بیان کرنا ممکن نہیں کہ: "ہم نے اسے آزمائش کے قابل سمجھا ـــ "ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا اور جاننے والا قرار دیا" ـــ "ہم نے اسے راستہ دکھایا" ـــ اور ...... پس یہ خود انسان ہی ہے جسے اپنے راستے کا انتخاب کرنا چاہیے۔

لہٰذا کامل انسان وہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے کہ ہم نے اس کو ایک نطفے سے پیدا کیا ہے جس میں بہت سے اجزا ملے ہوئے ہیں یعنی اس کے کامل ہونے کی وجہ اس کا مخلوط نطفہ سے پیدا ہونا ہی ہے۔

کامل انسان اور فرشتے میں فرق ہے۔ کامل انسان کا کمال اس کے تعادل اور توازن میں ہے یعنی ان مختلف استعدادوں میں تعادل اور توازن جو اس میں موجود ہیں۔ ایک انسان اس وقت کامل انسان بنتا ہے جب اس کا جھکاؤ فقط ایک استعداد کی جانب نہ ہو اور دوسری استعدادوں کی طرف سے غفلت نہ کرے۔ بلکہ اس کے اندر جتنی صلاحیتیں اور استعدادیں ہوں وہ ان سب کو ترقی دے۔ یعنی ان میں تعادل اور توازن قائم رکھے۔ علماء کا کہنا ہے کہ حقیقی عدل ـــــ توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ یہاں ہم آہنگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی تمام استعدادوں کے ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ترقی ہم آہنگ ہو۔

اس نکتے کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ہم ایک سادہ مثال پیش کرتے ہیں مثلاً جب ایک لڑکا بڑھتا ہے تو اس کے ہاتھ ہوتے ہیں، پاؤں ہوتے ہیں۔ سر ہوتا ہے، آنکھیں ہوتی ہیں، ناک ہوتی ہے، منہ ہوتا ہے، دانت ہوتے ہیں اور اس کے اندرونی اعضاء اور آنتیں ہوتی ہیں۔

پس ایک سالم لڑکا وہ ہے جس کے تمام اعضاء بڑھیں اور ان کے بڑھنے میں ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہو۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک انسان ایسے بڑھتا ہے جیسے مضحکہ خیز کارٹون CARICATURE یعنی ایسا ہو کہ اس کے بدن کے باقی حصے تو نہ بڑھیں اور فقط اس کی ناک اتنی بڑھے کہ اس کے باقی بدن کے برابر ہو جائے یا اس کی آنکھیں یا سر بڑھے یا اس کے ہاتھ بڑھیں لیکن پاؤں نہ بڑھیں یا پاؤں بڑھیں مگر ہاتھ نہ بڑھیں تو ایسا شخص بڑھتا ضرور ہے لیکن اس کے بڑھنے میں ہم آہنگی نہیں ـــــ اس لیے وہ

سالم انسان نہیں ہوتا۔

کامل انسان وہ ہے جس کی تمام انسانی قدریں اکٹھی بڑھیں اور ان میں سے کوئی ایسی نہ ہو جو بڑھنے سے رہ جائے یعنی وہ سب ایک دوسری کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر بڑھیں اور بڑھ کر اعلیٰ درجے تک پہنچ جائیں۔ جب ایسا ہو جائے تو وہ انسان کامل ہو جاتا ہے اور یہ وہی شخص ہے جسے قرآن مجید امام سے تعبیر کرتا ہے اور فرماتا ہے:

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ انہوں نے پوری کر دیں۔ تب خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کی اور میری اولاد سے ــــ خدا نے فرمایا کہ ہاں مگر میرے اس عہدے پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام خدائے تعالیٰ کی جانب سے آنے والی بڑی بڑی آزمائشوں سے سرخرو نکلے، ان کاموں کو پورا کر دکھایا اور ان تمام امتحانوں میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ وہ کوئی ایک، دو، تین یا چار باتیں نہیں بلکہ وہ ایسے بڑے بڑے امتحان تھے کہ جن میں سے ایک امتحان خدا کی راہ میں اپنے ہاتھوں اپنے فرزند کا سر کاٹنے پر آمادہ ہو جانا تھا۔

انہوں نے خدا کی مرضی کے آگے یہاں تک سر تسلیم خم کیا کہ جب وہ سمجھ گئے کہ خدا اس بارے میں حکم دے رہا ہے تو بے چون و چرا ذبح فرزند پر تیار ہو گئے۔ بالآخر عمل کا وقت آ گیا۔

۸ پس دونوں نے ٹھان لی اور باپ نے بیٹے کو ماتھے
کے بل لٹایا۔ (سورۂ صافات۔ آیت ۱۰۳)

ابراہیمؑ بیٹے کو ذبح کرنے اور اسماعیلؑ ذبح ہونے کے
لیے جب مکمل طور پر آمادہ ہو گئے تو

۹ ہم نے آواز دی اے ابراہیمؑ! تم نے اپنے خواب کو سچ
کر دکھایا۔ (سورۂ صافات۔ آیت ۱۰۴۔ ۱۰۵)

یعنی اے ابراہیمؑ ہمارا مقصد پورا ہو گیا جو کچھ ہم چاہتے تھے وہ یہیں تک تھا۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ سچ مچ تم اپنے بیٹے کا سر کاٹ دو۔ جو کچھ ہم تم سے چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ ہمارے حکم اور ہماری مرضی کے مقابل تمہاری اطاعت کس حد تک ظاہر ہوتی ہے۔ یوں ابراہیمؑ آگ میں ڈالے جانے سے لے کر بیٹے کو قربان گاہ میں لے جانے تک تن تنہا تمام امتحانوں سے کامیاب گزرتے ہیں۔

۱۰ اس میں شک ہی نہیں کہ ابراہیمؑ ایک امت، خدا کے
فرمانبردار بندے اور باطل سے کترا کر چلنے والے تھے۔ وہ ہرگز
مشرکین میں سے نہ تھے۔ (سورہ نحل۔ آیت ۱۲۰)

انھوں نے اکیلے ہی ایک قوم اور ایک ملت سے مقابلہ کیا تو اس وقت ان سے کہا جاتا ہے:

۱۱ میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔
(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

یعنی اے ابراہیمؑ! اب تم اس مقام پر آ پہنچے ہو کہ تمہیں دوسروں کیلئے

مثال، نمونہ پیشوا اور امام ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اب تم ایک کامل انسان بن گئے ہو اور دوسرے انسانوں کو چاہیے کہ وہ کامل ہونے کے لیے تمہاری پیروی کریں اور تمہارے ساتھ مطابقت پیدا کریں۔

امام علی علیہ السلام بھی ایک کامل انسان ہیں ـــــ وہ اس لیے کامل ہیں کہ ان کے اندر تمام انسانی قدریں پروان چڑھیں۔ ترقی کے اعلیٰ درجے تک پہنچیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر پھلی پھولی ہیں۔ پس ان انسانی قدروں نے ان تین شرطوں کے ساتھ ان کی ذات میں اعلیٰ درجے تک اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ترقی کی ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہاں ہم آہنگی کے اس مسئلہ کی کچھ اور وضاحت کر دیں۔

آپ نے سمندر کا مدوجزر دیکھا ہوگا یا کم از کم اس کے بارے میں سنا ہوگا۔ چنانچہ سمندر ہمیشہ مدوجزر کی حالت میں رہتا ہے۔ یعنی کبھی اس طرف کھینچا جاتا ہے اور کبھی اس طرف کھینچا جاتا ہے۔ یہ بات زمانۂ قدیم سے ثابت ہو چکی ہے کہ چاند سمندروں کے مدوجزر میں بہت زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔ سمندر ہمیشہ اچھلتا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ عموماً مدوجزر کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ کبھی ادھر کو کھینچا جاتا ہے اور کبھی اُدھر کو کھینچا جاتا ہے۔ قدرتی طور پر انسان کی روح اور انسانی معاشرہ بھی سمندر کی طرح ہمیشہ مدوجزر کی حالت میں ہوتا ہے۔ انسان کی روح ہمیشہ مدوجزر کی حالت میں ہوتی ہے اور اس طرف سے اس طرف کو کھینچی جاتی ہے۔ معاشروں کا بھی یہی عالم ہے اور وہ بھی کبھی ادھر اور کبھی اُدھر کھینچے جاتے ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ معاشروں کے کھینچے جانے کا سبب افراد یا دوسرے واقعات ہوں لیکن صورت یہی ہے

اور بالفعل ہمیں ان حیوانی نشانیوں سے حتیٰ کہ انسانی قدروں سے کوئی واسطہ نہیں
خود انسان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یعنی آپ ایسے افراد کو دیکھتے ہیں جن کا میلان
واقعی انسانی میلان ہوتا ہے لیکن بعض اوقات وہ انسانی جبلتوں میں سے
کسی ایک کی جانب ایسا ہی چڑھاؤ پیدا کر لیتے ہیں جیسے اُدھر کو کھینچے جا رہے
ہوں۔ پھر وہ یوں لڑھکتے چلے جاتے ہیں کہ تمام دوسری قدریں بھول
جاتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ایسے آدمی کی مانند ہیں جس کا فقط کان یا ناک یا
ہاتھ بڑھتا جاتا ہے۔

معاشروں میں زیادہ تر انحراف ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔
تاہم بار معاشر کسی وقت بھی باطل کی طرف گمراہی کے سبب نہیں بڑھتا۔
بلکہ لوگ حق بات میں افراط کی وجہ سے بھی غلط راستے پر لگ
جاتے ہیں اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی قدروں میں سے ایک
ـــــ عبادت ہے کہ جس کی اسلام سو فیصد تائید کرتا ہے۔ گو عبادت سے اپنے
خاص معنوں میں خدا کا ذکر مراد ہے لیکن اسلام میں ہر وہ کام عبادت ہے جو ایک
انسان خدا کی خاطر انجام دیتا ہے۔ چنانچہ جب وہ کام کاج کرتا ہے اور اس
کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنا اور اپنے خاندان والوں کا پیٹ پالے اور اپنے معاشرے
کی خدمت کرے تو وہ عبادت میں مشغول ہوتا ہے لیکن عبادت اپنے خاص معنوں
یعنی خدا کے ساتھ خلوت کے معنوں میں نماز، دعا، مناجات اور تہجد وغیرہ
ہی ہے جو اسلام کے اجزا ہیں اور اس میں سے حذف نہیں ہو سکتے۔ یہ عبادت
بجائے خود ایک حقیقی قدر ہے ـــــ لیکن اگر اس میں احتیاط نہ برتی جائے
تو آپ دیکھیں گے کہ ایک معاشرہ فقط اس قدر کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے پھر

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ فقط عبادت کرنا، مسجد میں جانا، مستحب غسل کرنا، مستحب نماز پڑھنا، دعا مانگنا، تعقیب پڑھنا اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا ہی اسلام بن جاتا ہے۔ یعنی وہ معاشرہ فقط ان چیزوں کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور اگر وہ اس راستے پر حد سے زیادہ بڑھ جائے تو اس کی تمام دوسری قدریں مسخ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم تاریخ اسلام میں دیکھتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں اس قسم کا رجحان پیدا ہو گیا تھا اور خالصتاً بے غرض اشخاص کہ جن پر کوئی تہمت نہیں لگائی جا سکتی ـــــ وہ اس راستے پر چل کھڑے ہوئے اور پھر اس میں توازن قائم نہ رکھ سکے۔ ایک ایسا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں انسان ہوں کیونکہ اس نے صرف ایک ہی پہلو کی طرف توجہ دی ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو اپنے اندر مختلف خیالات کو ترقی دینا چاہیے اور وہ ان سب کو ایسی ترقی دے جس میں ہم آہنگی پائی جائے۔

رسول اکرمؐ کو اطلاع دی گئی کہ آپ کے کچھ اصحاب صرف عبادت میں محو ہو گئے ہیں۔ آنحضرتؐ یہ سن کر بڑے بے چین ہوئے ـــــ مسجد میں تشریف لائے اور باآواز بلند فرمایا:

> "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ میری امت میں کچھ ایسے افراد پیدا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ میں خود جو تمہارا پیغمبر ہوں ـــــ ایسا نہیں ہوں اور کبھی بھی رات سے صبح تک عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ رات کے کچھ حصے میں آرام کرتا ہوں، سوتا ہوں اور اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ اسی طرح میں ہر روز قطعاً روزہ بھی نہیں رکھتا، بلکہ کچھ دنوں کے روزے

رکھتا ہوں اور باقیماندہ دنوں میں غذا تناول کرتا ہوں۔
پس جن لوگوں نے (عبادت میں محو رہنے کا) یہ راستہ اختیار کیا ہے وہ میری سنت سے دور ہیں ....!

ہاں تو جب پیغمبر اکرمؐ بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلامی قدروں میں سے ایک دوسری قدروں کو اپنے اندر گم کر لینا چاہتی ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے کا رجحان ایک طرف ہو گیا ہے تو وہ اس کا سختی سے مقابلہ کرتے ہیں۔

عمرو بن عاص کے ایک بیٹے کا نام عبداللہ اور دوسرے کا نام محمد تھا۔ ان میں سے ایک (یعنی محمد) اپنے باپ کی مانند دنیا دار، دنیا پرست اور حکومت کا خواہش مند تھا ـــــ اور اس کے تیسرے بیٹے کا نام نجیب تھا۔

عمرو بن عاص جب کبھی اپنے اول الذکر دو بیٹوں سے کوئی مشورہ طلب کرتا تو پہلا یعنی عبداللہ اسے امام علیؑ کی جانب دعوت دیتا اور کہتا کہ علیؑ کی حمایت کرو۔ جبکہ اس کا دوسرا بیٹا محمد کہتا تھا: نہیں ـــ تمہیں علیؑ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا" لہٰذا معاویہ کی طرف ہو جاؤ۔

عبداللہ کو عبادت سے لگاؤ تھا۔ ایک دن رسول اکرمؐ اسے راستے میں ملے اور فرمایا: اے عبداللہ! مجھے بتایا گیا ہے کہ تم راتوں کو صبح ہونے تک عبادت کرتے ہو اور دن میں روزہ رکھتے ہو۔

اس نے جواب دیا: یا رسول اللہؐ! ایسا ہی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: لیکن میں ایسا نہیں ہوں، اس چیز کو پسند بھی نہیں کرتا اور نہ یہ درست ہے۔

بعض اوقات کسی معاشرے کا جھکاؤ زہد کی جانب ہو جاتا ہے جو

بجائے خود ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ زہد ایک ایسی قدر ہے جس کے اچھے اثرات اور فوائد ہوتے ہیں۔ اگر ایک معاشرہ خوش بختی کا منہ دیکھے یا کم از کم ہم اسے اسلامی معاشرہ کہہ سکیں تو یہ ناممکن ہے کہ اس میں یہ عنصر اور یہ قدر موجود نہ ہو لیکن بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ یہی قدر سارے معاشرے کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے اور پھر ہر چیز "زہد" کی نذر ہو جاتی ہے اور کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

ایک اور قدر خدمت خلق ہے جو انسان کی قطعی اور مسلم قدروں میں سے ہے ــــ یہ ایک انسانی قدر ہے جس کی اسلام بھی تائید کرتا ہے اور یہ خلق خدا کی خدمت گزاری ہوتا ہے

اس بارے میں رسول اکرمؐ نے بڑی سفارش اور حقیقتاً قرآن مجید میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ آیا ہے۔ جیسا کہ اس نے باہم تعاون کرنے اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے کے متعلق کہا ہے:

> نیکی یہی نہیں کہ تم نمازیں اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو بلکہ نیکی تو اس کی ہے جو خدا، قیامت، فرشتوں، خدا کی کتابوں اور انبیاء پر ایمان لائے ـــــ وہ خدا کی محبت میں اپنا مال قرابتداروں، یتیموں، محتاجوں، پردیسیوں اور لونڈی و غلام کی گلو خلاصی میں صرف کرے۔
>
> (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۷۷)

پھر اس آیت کے آخر میں اسی قدر یعنی خدمت خلق کا ذکر آتا ہے۔ یہ ایک ایسی قدر ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک زمانے میں

سعدی جیسا آدمی آتا ہے اور کہتا ہے :

ع "عبادت بہ جز خدمت خلق نیست"

یعنی فقط یہی ایک قدر ہے اور بس! اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔
تاہم شیخ سعدی عمل میں ایسے نہ تھے کہ خدمت کے علاوہ کوئی عبادت نہ کرتے ہوں۔ بلکہ یہاں انہوں نے شعر کی زبان میں خدمت خلق کی اہمیت واضح کی ہے۔
اس کے برعکس بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عبادت کی قدر کی نفی کریں، زہد کی قدر کی نفی کریں، علم کی قدر کی نفی کریں اور جہاد کی قدر کی نفی کریں ـــــ غرضیکہ ان تمام عظیم قدروں کی یکلخت نفی کر دیں جو اسلام میں موجود ہیں اور یہ نعرہ لگائیں کہ انسانیت ـــ یعنی خلق خدا کی خدمت ہی واحد انسانی قدر ہے۔

آجکل بالخصوص ہمارے کچھ روشن خیال حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک بہت ہی بلند منطق ان کے ہاتھ آ گئی ہے اور انہوں نے اسے انسانیت اور انسان دوستی کا نام دے رکھا ہے۔ انسان دوستی سے کیا مراد ہے؟ اس کے معنی خلق خدا کی خدمت کرنے کے ہیں۔ خلق خدا کی خدمت کرنا بڑی اچھی بات ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خلق خدا میں کون کون شامل ہے۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ہم نے خلق خدا کا پیٹ بھی بھر دیا اور اس کا بدن بھی ڈھک دیا، مگر بہرحال یہ کام کر کے ہم نے ایک حیوان کی خدمت کی ہے۔ اگر ہم خلق خدا کے لیے کسی بلند تر قدر کے قائل نہ ہوں اور تمام قدریں "خلق خدا کی خدمت" تک محدود ہوں تو نہ خود ہم میں اور نہ کسی دوسرے میں کوئی قدر موجود ہو گی۔ پھر

تمام خلقِ خدا "بھیڑوں کا ایک ریوڑ" یا "گھوڑوں کا ایک گلہ" بن جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے کچھ حیوانوں کا پیٹ بھر دیا اور انھیں ڈھانک دیا۔ اگرچہ یہ بھی ایک اچھا کام ہے لیکن کیا انسان کا انتہائی مقام یہی ہے کہ ہم اس کا پیٹ بھر دیں اور وہ اپنی حیوانیت پر برقرار رہے۔ کیا میری خدمت کرنے کی آخری حد بھی یہی ہے کہ ایک اپنے ہی جیسے حیوان کی خدمت کروں؟ کیا میرے جیسے دوسرے حیوانوں کی آخری حد یہ ہے کہ وہ کسی اپنے جیسے کی (مثلاً میری) خدمت کریں؟ نہیں ..... بلکہ بات یہ ہے کہ انسان کی خدمت ایک قدر تو ہے مگر اس انسان میں انسانیت کا ہونا شرط ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ پیٹرس لوممبا بھی انسان ہے اور موشے چومبے بھی انسان ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ خلق چاہے کیسی بھی ہو ـــــ مسئلہ فقط خلقِ خدا کی خدمت کا ہے۔ تو پھر پیٹرس لوممبا بھی اور موشے چومبے بھی ایک خلق ہے ـــــ آپ ان کے درمیان فرق کیوں کرتے ہیں؟ اگر سوال "خدمتِ خلق" ہی کا ہے تو پھر ابوذر اور معاویہ کے درمیان کیا فرق ہے؟ کیا ایسے مسائل میں یہ بھی ایک قسم کی افراط نہیں ہے؟

اس کے علاوہ مثلاً آپ آزادی کی قدر کو لیجیے۔ آزادی عظیم ترین اور بلند ترین قدروں میں سے ہے جو انسان کی حیوانیت کی حد سے بلند تر ہیں۔ انسان کے لیے آزادی مادی قدروں سے بڑھ کر ایک قدر ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ کہ جن میں معمولی سی بھی انسانیت ہوتی ہے وہ اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ چاہے بھوکے رہیں، ان کے تن پر کپڑا نہ ہو اور وہ بڑے مشکل حالات میں زندگی بسر کریں، لیکن یہ نہیں چاہتے کہ کسی دوسرے کے اسیر یا محکوم ہوں،

بلکہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ کتاب ــــــ "آیندہ دانشوراں" ــــــ میں ایک داستان نقل کی گئی ہے۔ یہ ایک بڑی عجیب داستان ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بو علی سینا کچھ مدت وزیر بھی رہا تھا، لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وزارت کے نتیجے میں اسے اپنا علمی کام چھوڑنا پڑا۔ اپنے غیر معمولی نبوغ کے باوجود اگر وہ اپنی زندگی وزارت وغیرہ میں صرف نہ کرتا تو اس نے جو کچھ بھی نوع انسان کیلئے کیا ہے اس سے کہیں بڑھ کر کارنامے انجام دیتا جیسا کہ ملا صدرا جیسے اشخاص ہمیشہ افسوس کرتے ہیں کہ یہ شخصیت وزارت کی اس وادی میں کیوں جا گری۔ ایک دن بو علی سینا بڑے جاہ و جلال اور وزارت عظمیٰ کے مخصوص داب کے ساتھ ایک جگہ سے گزر رہا تھا۔ اتفاقاً وہ ایک بیت الخلاء کے پاس سے گزرا جہاں ایک خاکروب صفائی کر رہا تھا۔ بو علی غیر معمولی ہوش کا مالک تھا اور اس کے قوائے حسیہ بھی بہت مضبوط تھے۔ اس نے خاکروب کی آواز سنی اور اسے پتہ چلا کہ وہ یہ شعر گنگنا رہا ہے:

گرامی داشتم اے نفس ازانت

کہ آسان بگذرد بر دل جہانت

وہ اپنے آپ سے خطاب کر کے کہہ رہا تھا کہ اے میرے نفس! میں تجھے اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ تیرا وقت اچھا کٹے۔

بو علی سینا کو یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی کہ یہ شخص سب سے گھٹیا کام انجام دے رہا ہے اور پھر اپنے نفس پر احسان دھر رہا ہے اور کہہ رہا ہے: ع

گرامی داشتم ای نفس ازانت   کہ آسان بگذرد بر دل جہانت

بوعلی سینا نے اپنا گھوڑا ایک طرف کھڑا کیا، آگے آیا اور اسے آواز دیکر کہا: انصاف تو یہ ہے کہ تم نے اپنے نفس کو اتنا عزیز رکھا کہ اس سے بہتر ممکن ہی نہیں تھا۔ جب خاکروب نے اس کا چہرہ بشرہ اور لباس فاخرہ دیکھا تو اس نے پہچان لیا کہ یہ وزیر اعظم بوعلی ہے۔ تب اس نے کہا: میں نے یہ پیشہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ تمہاری طرح کسی دوسرے کا محکوم بن کر نہ رہوں۔ تم یہ جو مال و متاع اور شان و شوکت رکھتے ہو۔ خاکروب کا کام کرنا اور آزاد رہنا اس سے بلکہ دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم محکوم اور تابع ہو اور ....

کہتے ہیں کہ بوعلی سینا شرم کے مارے پسینے پسینے ہو گیا اور سمجھ گیا کہ اس منطق کا کوئی جواب نہیں ہے۔

یہ ایک واقعیت اور حقیقت ہے ـــــ لیکن یہ ہے کیا؟ ہاں یہ چیز حیوانی اور خاکی منطق میں کوئی معنی نہیں رکھتی کہ آدمی مرغ اور پلاؤ، کنیز اور غلام، گھوڑے اور ہاتھی اور حکومت اور وزارت کو چھوڑ کر خاکروب بن جائے اور پھر آزادی کی باتیں کرے۔ کیا آزادی کوئی ایسی چیز ہے جسے چھوڑا جا سکے؟ نہیں! لیکن انسان اعلیٰ اور با جوہر کے لیے آزادی اتنی قیمت رکھتی ہے کہ وہ خاکروبی کو محکومی پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ آزادی واقعی ایک قدر ہے اور بہت بڑی قدر ہے۔ بعض اوقات انسان دیکھتا ہے کہ کچھ معاشروں میں یہ قدر بالکل بھلا دی گئی ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ انسان میں یہ حس بیدار ہو گئی ہے۔ پھر جب یہ حس بیدار ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ بشریت کے معنی "آزادی" کے ہیں! بشر کے معنی "آزادی" کے ہیں اور آزادی کے

علاوہ کوئی قدر وجود ہی نہیں رکھتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تمام قدریں اس ایک قدر میں گم ہو جاتی ہیں، جس کا نام آزادی ہے۔

ایک اور قدر "عدالت" ہے، ایک قدر "حکمت" ہے اور "عرفان" وغیرہ بھی ہے۔

بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ "عشق" پر بہت زیادہ تکیہ کرتے ہیں، مثلاً جو کچھ ہمارے عرفان و تصوف اور عرفانی غزلوں میں ہے وہ فقط ایک انسانی قدر "عشق" پر منحصر ہو کر رہ جاتا ہے جیسا کہ کہا گیا ــــ حسن ازلی نے اپنا جلوہ دکھایا، فرشتے نے اسے دیکھا، مگر وہ جذبۂ عشق سے عاری تھا:

فرشتہ عشق ندانست چیست، قصہ مخواند
بخور د جام و گلابی بہ خاک آدم ریخت

فرشتہ نہیں جانتا کہ عشق کیا ہے؟ کیونکہ اس نے یہ قصہ نہیں پڑھا۔ اس نے معرفت کا جام چڑھایا اور اس کی تلچھٹ خاک آدم پر ڈال دی۔

پھر وہ دیگر تمام قدروں حتیٰ کہ عقل کی جانب بھی توجہ نہیں دیتے جن عارفوں کا میلان "عشق" کی جانب ہوتا ہے، دراصل وہ عقل کے خلاف میلان رکھتے ہیں اور عقل کے ساتھ باقاعدہ جنگ کرتے ہیں۔

جیسا کہ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

عارف از پرتو می، راز نہانی دانست
گوہر ہر کس از ین لعل توانی دانست

شرح مجموعۂ گل مرغ سحر داند و بس
کہ نہ ہر کو ورقی خواند معانی دانست
ای کہ در دفتر عقل آیت عشق آموزی
ترسم این نکتہ بہ تحقیق ندانی دانست

ایک عارف شراب کی چمک میں رازِ حقیقت کو پا لیتا ہے۔ اس لیے تو بھی اس لعل کے ذریعے ہر انسان کی صلاحیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

مجموعۂ گل یعنی ذات جامع صفات (خدا) شان کو بس مرغ سحر ہی جانتا ہے کیونکہ ہر پڑھنے والا کتاب کے معنی سے واقف نہیں ہوتا۔

اے شخص کہ جو عقل کے ذریعے سے عشق کو سمجھنے میں کوشاں ہے مجھے ڈر ہے کہ تو اس نکتے کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکے گا۔

مجموعۂ گل سے مراد وہ ذات (یعنی خدا) ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ آخری شعر میں انہوں نے بوعلی سینا سے خطاب کیا ہے جس نے "اشارات" کے آخر میں عشق کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ پھر ان کے ہاں بنیادی طور پر انسان اور انسانیت کو "عشق" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عقل چونکہ محدود اور پابند ہے اس لیے وہ کلی طور پر دبا دی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وقت آتا ہے کہ دوسری طرف سے ایک اور قدر آگے لائی جاتی ہے۔ یعنی اس وقت انسانی قدر صرف "عقل" اور "فکر" ہی شمار کی جاتی ہے اور بس۔ وہ کہتے ہیں کہ جناب عشق کے بارے میں یہ کیا عجیب سی باتیں ہیں۔ یہ سب محض وہم و گمان کی باتیں ہیں اور یہ یوں ہیں اور ووں ہیں وغیرہ.....

پھر جب عشق کے متعلق یہ باتیں بوعلی سینا کے سامنے آتی ہیں تو وہ کہتا ہے:

عشق کے بارے میں جو کہا جاتا ہے وہ نری خیال آفرینیاں ہیں۔ اس کی بجائے انسان کو "عقل کی سواری کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے"۔ ان ساری باتوں کا کیا مطلب ہے؟ ہاں! ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مختلف قدریں ہیں جو انسان میں موجود ہیں۔ مثلاً "عقل" "عشق" "محبت" "عدالت" "خدمت" "عبادت" اور "آزادی"۔ پھر ان قدروں کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کامل انسان کونسا ہے؟ کیا وہ جو عابد محض ہے؟ کیا وہ جو زاہد محض ہے؟ کیا وہ جو مجاہد محض ہے؟ کیا وہ جو محض آزادی کا خواہاں ہے؟ کیا وہ جو عاشق محض ہے؟ کیا وہ جو عاقل محض ہے؟ .... ان میں سے کون کامل انسان ہے؟

ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی کامل انسان نہیں ہے۔ کامل انسان وہ ہے جس میں یہ تمام قدریں اعلیٰ درجے تک بڑھی ہوں اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ترقی کی ہو۔ اس معیار کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام علی علیہ السلام ایسے ہی کامل انسان ہیں۔

آپ امام علیؑ کی خطبات کی کتاب "نہج البلاغہ" سے رجوع کریں جو سید رضی کا انتخاب اور امیر المومنین کے ارشادات کا ایک حصہ ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سید رضی چونکہ ایک ادیب تھے۔ اس لیے انہوں نے نہج البلاغہ کے فقط ادبی پہلو سے بحث کی ہے اور امیر المومنینؑ کے کلام کے شاہکار ادبی جملوں کا انتخاب کیا ہے۔ آجکل نہج البلاغہ میں ۲۲۹ خطبے ہیں جب کہ مروج الذہب کے مؤلف مسعودی ـــــ جو سید رضی سے سو سال پہلے پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ اس وقت امام علیؑ

کے تقریباً ۴۸۰ خطبے لوگوں کے پاس موجود تھے۔

نہج البلاغہ کیسی کتاب ہے؟ اس میں آپ کو ہر قسم کا عنصر ملتا ہے۔ جب انسان نہج البلاغہ کا مطالعہ کرتا ہے تو ایک مقام پر خیال کرتا ہے کہ بوعلی سینا کچھ کہہ رہا ہے ــــ دوسری جگہ وہ سمجھتا ہے کہ مولوی معنوی یا محی الدین عربی گفتگو کر رہا ہے ــــ پھر جب مطالعہ کرتے ہوئے وہ ایک جگہ پہنچتا ہے تو اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کچھ کہہ رہا ہے یا آزادی کا متوالا بول رہا ہے' جسے آزادی کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوجھتا۔

اس کے بعد آدمی ایک اور جگہ نگاہ ڈالتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ ایک عابد شب زندہ دار گفتگو کر رہا ہے یا گوشہ نشین زاہد یا راہب کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے اندر تمام انسانی قدریں رکھتے ہیں اور ہر بولنے والے کا کلام اس کی روح کا نمائندہ ہوتا ہے۔ پس نہج البلاغہ میں آپ دیکھیں کہ امام علی کتنے عظیم ــــ اور ہم کتنے کوتاہ ہیں۔

تقریباً پچاس سال پہلے ــــ جبکہ دینی اور مذہبی مسائل میں ہمارا معاشرہ فقط زہد اور عبادت کی قدروں کی جانب میلان رکھتا تھا۔ اس وقت آپ کہیں بھی جاتے تو دیکھتے تھے کہ ایک واعظ منبر پر بیٹھتا اور نہج البلاغہ میں سے پڑھ کر سناتا تھا۔ وہ کیا پڑھتا تھا؟ سنیے کہ جو خطبے بالعموم پڑھے جاتے تھے ان کی تعداد مجموعی طور پر دس سے بیس تک تھی۔ یہ نہج البلاغہ کے وہ خطبے تھے جن کا تعلق زہد اور موعظت سے تھا۔ مثلاً:

"اے لوگو! یہ دنیا گزرگاہ ہے اور آخرت جائے قرار ــــ اس راہگزر سے اپنی منزل کے لیے توشہ اٹھالو' جس کے

سامنے تمہارا کوئی بھید چھپا نہیں رہ سکتا، اس کے سامنے اپنے
پردے چاک نہ کرو۔ قبل اس کے کہ تمہارے جسم دنیا سے الگ
کر دیے جائیں، اپنے دل اس سے ہٹا لو۔ اس دنیا میں تمہیں
جانچا جا رہا ہے لیکن تمہیں پیدا تو ایک دوسری جگہ کے لیے
کیا گیا ہے۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۲۰۱)

ان ایام میں نہج البلاغہ کے باقی خطبے نہیں پڑھے جاتے تھے کیونکہ معاشرہ انہیں جذب اور قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس معاشرے نے کچھ دوسری قدروں کی جانب میلان پیدا کر لیا تھا، لہٰذا نہج البلاغہ کے انہیں حصوں کا پڑھنا معمول بن گیا تھا جو ان قدروں کے بارے میں تھے۔ اسی طرح سو سال گزرتے گئے لیکن اس طویل مدت میں شاید ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہوا تھا جو مالک اشتر کے نام امیر المومنین علیہ السلام کا فرمان پڑھتا کہ جو اجتماعی اور سیاسی احکام کا ایک خزانہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ در حقیقت اس معاشرے کی روح ان چیزوں کی خواہش اور شوق نہیں رکھتی تھی۔

امام علی بن ابی طالب علیہ السلام نہج البلاغہ میں اس طرح ارشاد فرماتے ہیں کہ:

کہ۔۔۔۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کئی
موقعوں پر فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اس قوم میں پاکیزگی
نہیں آ سکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق
نہیں دلایا جاتا"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ عہد نامہ ۵۳۔ بنام مالک اشتر)

پچاس سال پیشتر کا اسلامی معاشرہ اس جملے کی روح اور اس بات کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا، تاکہ وہ صحیح طور پر سمجھ سکے کہ امام علی علیہ السلام کہتے ہیں: رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ کوئی امت پاکیزگی و طہارت اور عیب سے مبرا ہونے کے مقام تک نہیں پہنچتی مگر یہ کہ اس سے پہلے کہ وہ اس مرحلے پر پہنچ چکی ہو جب ایک کمزور آدمی ایک طاقتور شخص کے بالمقابل کھڑا ہو جائے اور بغیر اس کے کہ اس کی زبان لکنت کرے ـــــ وہ اپنا حق اس سے طلب کرے۔

چنانچہ ۵۰ سال پہلے کا معاشرہ ان الفاظ کی قدر و قیمت نہیں سمجھ سکا تھا کیونکہ اس معاشرہ نے بے سوچے سمجھے قدریں اختیار کیں اور فقط ایک یا دو قدروں کی جانب میلان کر لیا تھا۔ لیکن جہاں تک امام علی علیہ السلام کے کلام کا تعلق ہے تو تمام انسانی قدریں علیؑ کے قول، عمل اور شخصیت میں موجود ہیں۔

اگرچہ ہمارے معاشرے میں بھی کچھ قدریں نمایاں ہو گئی ہیں لیکن یہاں میں اپنے معاشرے کی تعریف نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ایسی قدریں پیدا ہو گئی ہیں، مگر مجھے ڈر یہ ہے کہ یہ قدریں پھر کہیں یک طرفہ نہ ہو جائیں اور بعض دوسری قدروں کو مٹا دینے کا موجب نہ بن جائیں۔ نہیں ـــــ نہیں! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم پر لازم ہے کہ امام علیؑ علیہ السلام کو اپنے لیے نمونہ اور اپنا امام سمجھیں۔ یعنی ایک کامل انسان کو ـــ ایک متعادل انسان کو اور ایک ایسے انسان کو اپنے لیے نمونہ بنائیں جس میں تمام انسانی قدروں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ترقی کی

ہے یعنی ایک ایسے انسان کو اپنے لیے نمونۂ عمل اور اپنا امام و پیشوا بنائیں کہ جب رات ہو جاتی ہے اور وہ خدا کے ساتھ راز و نیاز اور دعا و مناجات کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے تو کوئی عارف اس کے رتبے کو نہیں پہنچتا۔ تب عبادت کی وہ روح جو حق میں جذب ہونا، حق کی جانب کھنچا جانا اور حق کی جانب پرواز کرنا ہے ـــــ وہ اس میں بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

آپ اکثر دیکھتے ہوں گے کہ جب کوئی انسان ایک کام میں سرگرم اور منہمک ہو، مثلاً وہ لڑائی جھگڑے کی حالت میں ہو اگر اس اثنا میں اسے ایک چاقو آ لگے جو اس کے بدن (بازو) کا ایک حصہ کاٹ دے تو چونکہ وہ لڑائی میں اتنا سرگرم اور منہمک ہوتا ہے یعنی اس کی توجہ لڑائی پر اس طرح مرکوز ہوتی ہے کہ اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے بازو کے گوشت کا ایک ٹکڑا الگ ہو گیا ہے۔ امام علیؑ بھی عبادت میں اس قدر سرگرم اور منہمک ہوتے تھے اور عشقِ الٰہی کا شعلہ ان کے وجود میں اس طرح بھڑکتا تھا کہ یوں لگتا جیسے وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انھوں نے خود ایک گروہ کی اس طرح تعریف کی اور نہج البلاغہ میں فرمایا ہے:

> ''علم نے انہیں ایک دم حقیقت و بصیرت کے انکشافات تک پہنچا دیا ہے۔ وہ یقین و اعتماد کی روح سے گھل مل گئے ہیں اور ان چیزوں کو جنہیں آرام پسند لوگوں نے دشوار قرار دے رکھا تھا۔ ان کو اپنے لیے سہل و آسان سمجھ لیا ہے۔ جن چیزوں سے جاہل بھڑک اٹھتے ہیں وہ ان سے جی لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ دنیا میں ایسے جسموں کے ساتھ رہتے ہیں کہ جن کی روحیں ملأ اعلیٰ

سے وابستہ ہیں۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین ۔حکمت ۱۴۷)

امام علیؑ ایسے عابد ہیں کہ عین حالت نماز میں تیر ان کے بدن سے نکالا جاتا ہے لیکن وہ حق اور عبادت میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ انھیں ہوش ہی نہیں آتا اور احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ محراب عبادت میں اس قدر روتے اور پیچ و تاب کھاتے ہیں کہ اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ یہ تو تھیں ان کی راتیں ـــــ لیکن جب دن نکلتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعاً وہ آدمی نہیں جو رات کو محراب میں تھا۔ وہی علیؑ جب دن میں اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھتا تو ان کا چہرہ ہنستا مسکراتا اور ہشاش بشاش ہوتا تھا۔ یہ بات ہمارے آجکل کے ان زاہدوں اور عابدوں کی حالت کے برعکس ہے ۔کیونکہ یہ لوگ جب زاہد اور عابد بن جاتے ہیں تو ان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ناک بھوں چڑھائے اور ماتھے پر بل ڈالے رکھتے ہیں اور لوگوں پر دھونس بھی جماتے ہیں۔

امام علیؑ کے اصحاب کہتے ہیں :

آپ کے اوصاف میں سے ایک یہ تھا کہ آپ ہم سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ آپ اتنے خوش طبیعت تھے کہ بذلہ گو تھے کہ جب عمرو بن عاص آپ کے خلاف پراپیگنڈا کر رہا تھا تو کہتا تھا کہ علیؑ خلافت کے لیے موزوں نہیں ہیں کیونکہ وہ خندہ رو ہیں ۔خلافت کے لیے ایک سخت آدمی چاہیے تاکہ لوگ اس سے ڈریں۔

اس کا ذکر نہج البلاغہ میں ہے ۔جیسے امیرالمومنینؑ خود نقل کرتے ہیں :

۱۶؎ "نابغہ کے بیٹے (عمرو بن عاص) پر حیرت ہے کہ وہ میرے بارے میں اہل شام سے کہتا پھرتا ہے کہ مجھ میں مزاح پایا جاتا ہے اور میں تفریح میں پڑا رہتا ہوں۔ اس نے غلط کہا اور کہہ کر گنہگار ہوا۔"

(نہج البلاغہ۔ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۸۲)

وہ لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب وہ ایک مجاہد اور ایک سپاہی کی شکل میں میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرتے ہیں تو بھی ان کا چہرہ مسکراتا ہوا ہوتا ہے۔

جیسا کہ آپ کے بارے میں کہا گیا:

۱۷؎ "وہ علیؑ ہیں جو رات کو محراب عبادت میں بہت رونے والے اور میدانِ جنگ میں بہت ہنسنے والے ہیں۔"

(الغدیر جلد ۴ صفحہ ۳۶)

یہ کیسی مخلوق ہیں؟ ہاں! یہ قرآنی انسان ہیں اور قرآن ایسے ہی انسان چاہتا ہے:

۱۸؎ "اس میں شک نہیں کہ رات کا اٹھنا خوب نفس کشی اور ٹھکانے سے ذکر کرنے کا وقت ہے ـــــــ دن کے وقت تمہارے اور بھی بڑے بڑے کام ہیں۔"

(سورۂ مزمل۔ آیت ۶-۷)

رات کو عبادت کے لیے اور دن کو چلنے پھرنے اور معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لیے رہنے دو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات ایک اور شخصیت

کی ہے اور دن کسی اور شخصیت کا ہے۔
میں حافظ شیرازی کے یہ اشعار آپ کو اس لیے سنا رہا ہوں کہ حافظ ان لوگوں کا جزو بن گئے ہیں جو انہیں جوانوں کے انحراف اور گمراہی کا وسیلہ قرار دینا چاہتے ہیں، حالانکہ وہ ایک عظیم شخصیت اور ایک مشتاق شاعر ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا کام شراب خوری اور عیاشی رہا ہے تو نوجوان کہتے ہیں کہ چلو ہم بھی حافظ کی طرح ہو جائیں لیکن خدا کا شکر کہ ہم ایسے نہیں ہیں۔ کیونکہ حافظ کے تمام اشعار عرفانی، پُرمعنی اور رمز آمیز ہیں۔

درحقیقت حافظ شیرازی قرآن کے مفسر تھے اور انہوں نے اس کی تاریخ بیان کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر نہیں بلکہ ایک عالم شخص تھے اور اپنی وفات کے دو سو سال بعد تک ان کا شمار علماء میں ہی ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتے تھے، لیکن دو سو سال بعد ان کا علمی پہلو بھلا دیا گیا اور وہ ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ وہ ایک ایسے عالم تھے جو بنیادی طور پر مفسر قرآن تھے اور اس کی تفسیر میں مشغول رہتے تھے اور بالعموم زمخشری کی تفسیر کشاف کا درس دیتے تھے۔ وہ ایک عارف، مفسر اور عالم شخص تھے۔ جو دراصل اس دنیا کے بندے نہیں تھے اور ان کے اشعار بھی ایک مرموز زبان میں ہیں۔ چونکہ وہ مفسر ہیں اور قرآنی آیات کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتے ہیں، اس لیے انہوں نے اس موضوع کو کہ "رات عبادت کا وقت ہے اور دن حرکت اور کاروبار کا وقت ہے" حافظ شیرازی نے اسے اپنی مرموز زبان میں یوں نظم کیا ہے:

روز درکسب ہنر کوش کہ می خوردن روز
دل چوں آیینہ در زنگ ظلام اندازد
آں زماں وقت می صبح فروغ است کہ شب
گرد خرگاہ افق پردہ شام اندازد

دن کو کارِ جہاں میں لگا رہ ــــ کیونکہ دن میں شراب پینے سے
دل پر زنگ آجاتا ہے۔

صبح کی طرح چمکتی ہوئی شراب پینے کا وقت وہ ہے جب دنیا پر
رات کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے

امام علی علیہ السلام ایسے ہی ہیں ان کا دن وہ اور رات یہ ہے یہ صفت
اور یہ تعبیر جو ہم اس وقت بیان کر رہے ہیں یعنی "کامل انسان" ایک جامع الاضداد شخص
یعنی مختلف اوصاف میں کمال رکھنے والے انسان سے جیسے ہم تعبیر کرتے ہیں
امام علی علیہ السلام ہزار سال سے کچھ اوپر آج تک اسی صفت سے پہچانے
جاتے ہیں حتیٰ کہ خود سید رضی نہج البلاغہ کے مقدمے میں کہتے ہیں:

"میں جو بات ہمیشہ اپنے دوستوں [illegible] آتا ہوں اور ان کو حیرت میں
ڈالتا ہوں، وہ یہی موضوع یعنی امام علی علیہ [illegible] سلام کے کلام کے گوناگوں پہلو
ہیں کہ انسان ان کے کلام کے جس حصے میں پہنچتا ہے، دیکھتا ہے کہ وہ پہلی
دنیا سے مختلف ایک اور دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ پھر وہ ایک اور مقام پر پہنچتا ہے
اور دوبارہ دیکھتا ہے کہ یہ ایک اور ہی دنیا ہے۔ ایک وقت میں وہ عابدوں
کی دنیا میں اور ایک وقت زاہدوں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ایک وقت فلسفیوں
کی دنیا میں اور ایک وقت عارفوں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ایک وقت میں

سپاہیوں اور افسروں کی دنیا میں اور ایک وقت میں عادل حاکموں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ایک وقت میں قاضیوں کی دنیا میں اور ایک وقت منقیوں کی دنیا میں ہوتا ہے وعلیٰ ہذا ....

چنانچہ انسان دیکھتا ہے کہ علیؑ تمام دنیاؤں کی سیر کرتے ہیں اور تمام دنیاؤں میں اس طرح موجود ہیں کہ بشریت کی دنیاؤں میں سے کسی دنیا سے غائب نہیں ہیں۔

صفی الدین حلی آٹھویں صدی ہجری میں کہتے ہیں:

[19] جمعت فی صفاتک الاضداد

فلهذا عزت لک الانداد

آپ کی ذات میں مختلف متضاد صفات جمع ہو گئی ہیں اسلیے عزت ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے۔

آپ حاکم ہیں، حلیم ہیں، شجاع ہیں، زاہد ہیں، سخی ہیں، فقیر ہیں اور .....

وہ مزید کہتے ہیں:

آپ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں۔ حالانکہ عموماً یہ دو چیزیں ایک دوسری سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔ آپ انتہائی درجے کے حلیم، انتہائی درجے کے شجاع اور انتہائی درجے کے خونریز ہیں۔ جب خون بہانا ضروری ہو تو آپ اس غلیظ خون کو بہاتے ہیں جو بہایا جانا چاہیے۔ آپ انتہائی درجے کے زاہد اور عابد ہیں۔ آپ فقیر ہیں اور آپ کو دینے والا کوئی نہیں، بلکہ آپ خود عطا کرنے والے ہیں۔ آپ مال نہیں رکھتے اور جو کچھ آپ کے ہاتھ میں آتا ہے بخش دیتے ہیں، کیونکہ:

قرار در کفِ آزادگان نگیرد مال
نہ قہر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

جو لوگ حرص دنیا سے آزاد ہیں ان کے ہاتھ میں روپیہ نہیں ٹھہرتا، جیسے عاشق کے دل میں غصہ اور چھلنی میں پانی نہیں ٹھہرتا۔

وہ اسی طرح آپ کی صفات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کہتے ہیں:

۲۰ خُلُقٌ يَخْجَلُ النَّسِيمُ مِنَ اللُّطْفِ
وَبَأْسٌ يَذُوبُ مِنْهُ الْجَمَادُ

وہ کہتے ہیں کہ ایک مقام پر آپ کا اخلاق اتنا رقیق اور اتنا نازک ہے کہ نسیم اس کی لطافت سے شرمسار ہے اور آپ کی شجاعت اور حملے اور روحِ جہاد کا یہ عالم ہے کہ پتھر اور دھاتیں اس کے سامنے پگھل کر پانی ہو جاتی ہیں۔

پس آپ کیسے انسان ہیں؟ آپ کی اصلیت وہ نسیم اخلاق ہے یا یہ گرفت، یہ ثابت قدمی اور یہ قوت؟ تو پھر آپ کس طرح کے بشر ہیں؟

پس کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جو تمام انسانی قدروں کا مالک ہو اور انسانیت کے تمام میدانوں میں گویا سبقت لے گیا ہو۔ اب ہم امام علیؑ جیسے کامل انسان سے کیا سبق سیکھیں؟ ہمیں ان سے یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ فقط ایک قدر کو لے کر دوسری قدروں کو نہ بھلا دیں۔ ہم تمام قدروں میں تو اونچے درجے پر نہیں جا سکتے، لیکن ہمیں چاہیے کہ جس حد تک ممکن ہو ایک دوسرے کے ساتھ تمام قدریں اختیار کریں۔ اگر ہم

کامل انسان نہیں ہیں تو کم از کم متعادل انسان تو ضرور بن جائیں۔ ہاں وہی وقت ہو گا جب ہم تمام میدانوں میں ایک حقیقی مسلمان کی شکل میں داخل ہوں گے۔

پس یہ ہیں معنی کامل انسان کے اور یہ ہیں نمونے کامل انسان کے ــــ اس بارے میں باقی باتیں میں انشاءاللہ آئندہ نشست میں کروں گا۔

○

رمضان کا مبارک مہینہ یعنی وہ آخری مہینہ جو امام علی علیہ السلام پر گزرا ــــ وہ ایک مختلف ماہ رمضان تھا۔ اس رمضان میں امام علیؑ کے لیے ایک عجیب سرور تھا ــــ لیکن آپ کے خاندان کے لیے وہ مہینہ پہلے دن سے ہی پریشانی اور اضطراب لے کر آیا تھا۔ کیونکہ رمضان کے گزرے ہوئے تمام مہینوں کے مقابلے میں اس ماہ میں امام علیؑ کی روش بڑی مختلف تھی۔ آپ توجہ فرمائیں کہ میں ایک مرتبہ پھر ان کی اعلیٰ خصوصیات میں سے ایک آپ کے سامنے عرض کرنے والا ہوں۔

۱۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ

کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ صرف یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لائے ــــ چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کا امتحان نہیں لیا جائے گا۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۲)

اس آیۂ شریفہ میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور فرمایا گیا ہے کہ کیا مومنین یہ

خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں آزمائش میں نہیں ڈالیں گے؟ نہیں بلکہ ہم انہیں ضرور آزمائیں گے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ رسول اکرمؐ کے بعد اس امت کو بڑے بڑے امتحان اور آزمائشیں پیش آئیں گی۔ تب میں نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! جو کچھ اس آیت میں آیا ہے اس کا کیا مقصد ہے؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "یا علیؑ! میرے بعد میری امت امتحان اور آزمائش میں ڈالی جائے گی۔" (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۱۵۴)

امام علیؑ مزید فرماتے ہیں:

میں نے رسول اکرمؐ سے پھر عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! جو لوگ اُحد میں شہید ہوئے، ان کی تعداد ۷۰ تھی اور ان کے سردار حمزہ بن عبد المطلب تھے جو اُحد کے جاں سپار تھے لیکن مجھے شہادت کا موقع نہ ملا اور میں اس فیض سے محروم رہ گیا۔ اس پر میں بہت مضطرب ہوا کہ میں احد میں یہ فیض کیوں حاصل نہ کرسکا اور یہ فیض مجھ سے کیوں دور ہو گیا؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: "اگر ان مقامات پر شہادت نصیب نہیں ہوئی تو کوئی بات نہیں بالآخر تمہیں راہ خدا میں شہادت کا شرف حاصل ہوگا۔"

جنگ احد میں امام علی علیہ السلام ایک ۲۵ سالہ جوان تھے۔ بی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے نئے نئے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے اور ابھی امام حسن کے سوا انکا اور کوئی فرزند نہ تھا۔ شادی شدہ جوانوں کی ہمیشہ یہ آرزو

ہوتی ہے کہ ان کی زندگی رفتہ رفتہ آگے بڑھتی چلی جائے۔ لیکن ذرا آپ امام علی علیہ السلام کو تو دیکھیے کہ ان کی واحد اور بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہو جائیں!

رسول اکرمؐ نے فرمایا: اے علیؑ! تم بھی شہید ہو جاؤ گے۔

پھر سوال کیا: اے علیؑ! شہادت کے وقت تم کیسے صبر کرو گے؟

امام علیؑ نے عرض کیا: آپ یہ نہ فرمائیں کہ کیسے صبر کرو گے بلکہ یہ فرمائیں کہ کیسے شکر گزار ہو گے؟ کیونکہ یہ صبر کا نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

چنانچہ اپنی زندگی کے اس آخری رمضان میں امام علیؑ پر ایک عجیب کیف و سرور طاری تھا، جبکہ آپ کے اہل بیت مضطرب اور بے چین تھے آپ کی شہادت کے بارے میں جو خبریں رسول اکرمؐ نے دی تھیں اور جو علامتیں خود امام علی علیہ السلام کو معلوم تھیں کہ کبھی کبھی ان کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ ان علامات کی موجودگی کے نتیجے میں آپ کے اہلبیتؑ اور قریبی اصحاب کے دلوں میں اضطراب اور بیقراری پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ آپ عجیب اور مرموز باتیں کرتے تھے۔

اگرچہ آپ اپنی زندگی کے آخری رمضان میں ہر رات کہیں نہ کہیں مہمان ہوتے ــــ لیکن وہاں بہت ہی کم کھانا کھاتے تھے۔ باپ کی یہ حالت دیکھ کر آپ کے بیٹوں بیٹیوں کا دل کڑھتا تھا اور ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ کیونکہ وہ آپ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ وہ پوچھتے: آپ اتنا کم کھانا کیوں کھاتے ہیں؟

آپ فرماتے: میں چاہتا ہوں کہ اپنے خدا سے اس حالت میں ملاقات

کروں کہ میرا پیٹ خالی ہو۔ وہ سمجھ جاتے تھے کہ ہمارے بابا امام علیؑ کو عنقریب ہی وقوع پذیر ہونیوالی کسی چیز کا انتظار ہے بعض اوقات آپ آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے:

"میرے حبیب رسول اکرمؐ نے جو خبر دی ہے وہ صحیح ہے انہوں نے جو کچھ فرمایا ــــــ وہ جھوٹ نہیں ہے۔ اس لیے اب وہ وقت نزدیک ہے اور بہت ہی نزدیک ہے۔

میں پہلے ہی سے یہ عرض کرتا چلوں کہ امام علیؑ نے ماہِ رمضان کے تیرھویں دن ایک ایسی بات کہی جس نے بہت زیادہ پریشانی پیدا کردی ظاہر ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا اور آپ خطبہ دے رہے تھے۔ تب آپ نے فرمایا:

میرے بیٹے حسینؑ! اس مہینے کے کتنے دن باقی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: سترہ دن۔ آپ نے فرمایا: ہاں اب وہ وقت نزدیک آگیا ہے جبکہ یہ ڈاڑھی اس سر کے خون سے رنگین ہو جائے گی۔

پھر جب ماہ رمضان مبارک کی انیسویں تاریخ آئی تو امام علی علیہ السلام کے فرزند آپ کے پاس آئے اور رات کا کچھ حصہ آپ کی خدمت میں رہے اور پھر امام حسنؑ اپنے گھر چلے گئے۔ امام علیؑ کا ایک خاص حجرہ تھا جہاں آپ راتوں کو عبادت کیا کرتے اور سوتے نہیں تھے۔ جب اپنے کاموں یعنی زندگی اور معاشرے کے کاموں سے فارغ ہوتے تو اپنے اس حجرے میں جاکر خدائے تعالیٰ سے راز و نیاز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ ابھی صبح طلوع نہیں ہوئی تھی کہ امام حسنؑ اپنے والد گرامی کے پاس آئے اور سیدھے ان کے حجرے میں گئے۔ امیر المومنین علیہ السلام اپنے ان فرزندوں کا خاص احترام کرتے تھے جو

بی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی اولاد تھے۔ اس طرح آپ حضرت زہرا اور رسول اکرمؐ کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ پس آپ نے اپنے بیٹے حسنؑ سے فرمایا:

اے پیارے بیٹے! مجھے پچھلی رات بیٹھے بیٹھے نیند آگئی۔ میں نے عالم رویاء میں رسول اکرمؐ کو دیکھا تو عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں نے آپ کی اس امت کے ہاتھوں بہت صدمے اٹھائے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ان پر نفرین کرو! میں نے ان پر نفرین کی اور چاہا کہ خدا مجھے ان سے لے لے اور ایک نالائق شخص کو ان پر مسلط کر دے۔ ہاں واقعی یہ بات بڑی عجیب ہے کہ لوگوں نے امام علی علیہ السلام سے موافقت نہ کی اور اس راستے پر چلنے پر آمادہ نہ ہوئے جو آپ نے انہیں دکھایا۔ امام علیؑ کو دکھ پہنچانے والوں میں پہلے تو اصحاب عائشہ تھے جنہوں نے بیعت توڑ دی تھی۔ ان کے بعد معاویہ اٹھا جس نے دھوکے سے کام لیا اور مختلف جرائم کیے۔ معاویہ دنیا کے تیز طرار آدمیوں میں سے تھا۔ یعنی وہ اتنا چالاک تھا کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ امام علیؑ کو کن باتوں سے دلی تکلیف پہنچتی ہے اور وہ جان بوجھ کر وہی کام کرتا تھا۔ تیسرا اور آخری گروہ خوارج کا تھا۔ یعنی وہ زاہد خشک لوگ جو اپنے پکے عقیدے، ایمان اور خلوص سے امام علیؑ کو کافر گردانتے تھے! کیا آپ کو علم نہیں کہ وہ امام علیؑ کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے!

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان امیرالمومنینؑ کے مصائب پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ اتنے مصائب برداشت کرنے کی تو ایک پہاڑ میں بھی طاقت نہیں ہے! آپ بتائیں کہ امام علیؑ اپنا درد دل کس سے کہیں؟ اب جبکہ علیؑ ــــــ رسول اکرمؐ کو عالم رویاء میں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

مجھے آپ کی امت نے کتنے صدمے پہنچائے ہیں، میں ان کے ساتھ کیا کروں؟

پھر آپ نے فرمایا: پیارے بیٹے! آپ کے نانا نے مجھے حکم دیا تھا کہ اے علیؑ! ان مخالفوں پر نفرین کرو اور میں نے بھی عالم رویاء میں ان پر نفرین کی، جو اس طرح تھی:

یعنی "خدا مجھے جلدی موت دے دے اور ان پر ایسا حاکم مسلّط کر دے جس کے یہ لائق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس جملے سے کتنی پریشانی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے"۔

پھر آپ گھر سے باہر آتے ہیں اور بطخیں چلاتی ہیں تو آپ فرماتے ہیں:

"کہ ہاں! اس وقت تو صرف پرندوں کی آواز ہے۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ اسی جگہ انسانوں کے نوحہ و ماتم کی آواز سنائی دے گی۔

(کشف الغمہ صفحہ ۴۳۷۔ منتہی الآمال صفحہ ۱۷۲)

امیرالمومنینؑ کے فرزندوں نے آپ کا راستہ روکا اور عرض کیا:

بابا جان! آج ہم آپ کو مسجد نہیں جانے دیں گے۔ لازم ہے کہ آپ کسی دوسرے کو اپنے نائب کے طور پر مسجد بھیج دیں۔

پہلے تو آپ نے فرمایا کہ میرے بھانجے جعدہ بن جبیرہ سے کہو کہ جا کر لوگوں کو نماز پڑھائے لیکن بعد میں آپ نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور فرمایا: نہیں ــــ میں خود جا رہا ہوں۔

انہوں نے عرض کیا: آپ اجازت دیں کہ کوئی آپ کے ہمراہ جائے۔

آپ نے فرمایا: نہیں ــــ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے ہمراہ جائے۔ وہ رات آپ کے لیے پسندیدہ رات تھی اور آپ کا یہ ارشاد آپ کے انجام کار کی تعبیر ہے:

۲۴ہ میری مثال بس اس شخص جیسی ہے جو رات بھر پانی کی تلاش میں چلے اور صبح ہوتے ہی چشمہ پر پہنچ جائے اور میں اس ڈھونڈنے والے کی مانند ہوں جو مقصد کو پالے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ وصیت ۲۳)

ضربت لگنے کے بعد جب آپ کو بستر پر لٹایا گیا تو یہ جملے ارشاد فرمائے:

"خدا کی قسم جب یہ ضرب میرے سر پر لگی تو میری مثال اس عاشق جیسی تھی جو اپنے معشوق تک پہنچ جاتا ہے۔"

نیز میری مثال اس شخص جیسی تھی جو اندھیری رات میں پانی کا چشمہ تلاش کرتا ہے تاکہ اپنا خیمہ اور ساز و سامان لے کر وہاں پہنچ جائے۔ پھر اگر اسے پانی کا چشمہ مل جائے تو وہ کتنا خوش ہوتا ہے۔ ہاں ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جس کے بارے میں حافظؒ نے کہا ہے:

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
اندران ظلمت شب آب حیاتم دادند
چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی
آن شب قدر کہ این تازہ براتم دادند

کل رات وقت سحر مجھے غم دوراں سے نجات مل گئی۔ جب کہ رات کے اندھیرے میں مجھے آب حیات سے سیراب کر دیا گیا۔

وہ کیسی مبارک رات اور کیسی اچھی صبح تھی ـــــ وہ تو
شبِ برات تھی کہ جس میں مجھے تازہ نصیب سے نوازا گیا۔

آپ نے فرمایا: میں خود جا رہا ہوں۔ خدا جانے کہ آپ کے دل میں کیا کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ البتہ آپ خود فرماتے ہیں: میں نے بہت کوشش کی کہ اس بات کا راز بیان کروں اور آپ نے اس کی بعض خصوصیات بیان کیں، تاہم آپ مجمل طور پر ہی جانتے تھے کہ مجھے ایک بہت بڑا حادثہ پیش آنے والا ہے۔

نہج البلاغہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا:

۲۵۔ ..... میں نے اس معاملے کا راز جاننے کی بہت کوشش کی لیکن خدا نے چاہا سوائے اس کے کہ اس کو پوشیدہ کر دے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۱۴۷)

گھر سے چل کر آپ مسجد میں آ پہنچے۔ صبح کی اذان آپ خود دیا کرتے تھے۔ اذان کا وقت ہو چلا تھا۔ اس لیے آپ گلدستۂ اذان پر تشریف لے گئے اور "اللہ اکبر" "اللہ اکبر" کی آواز بلند کی۔ اذان دے کر طلوع ہونے والی اس صبح کو خدا حافظ کہا اور فرمایا: اے صبح، اے نورِ سحر! جب سے علیؑ نے اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے کیا کوئی ایسا دن گزرا ہے کہ تو طلوع ہوئی اور علیؑ سو رہا ہو؟ یعنی اے سپیدۂ صبح! آج کے بعد علیؑ کی آنکھ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔

جب آپ اذان کے چبوترے سے اترنے لگے تو فرمایا:

۲۶۔ مومن و مجاہد کو راستہ دو۔

وہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا
اس وقت اور لوگ بھی مساجد کی طرف آرہے ہیں

(دیوان علی بن ابی طالب)

یہاں آپ اپنا ایک مجاہد و مومن کے طور پر تعارف کرا رہے ہیں۔ پریشانی اور اضطراب کا دور دورہ ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا تھا کہ اس اضطراب کے بعد نوحہ و ماتم ہوگا۔ آپ کے سبھی گھر والے بیدار لیکن بے چین ہیں کہ خدایا اس رات ہمیں کیا حادثہ پیش آنے والا ہے؟ کیا ہمارے والد اس رات کسی حادثے سے دوچار ہوں گے؟ پھر اچانک ہی ایک چیخ و پکار نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا ــــــ انہوں نے ایک آواز سنی جو ہر جگہ گونج رہی تھی:

۴۲ قسم بخدا کہ ہدایت کے ستون گر گئے ــــــ اور تقویٰ کے نشان مٹ گئے ــــــ دینداری کی مضبوط رسّی ٹوٹ گئی ــــــ محمد مصطفیٰؐ کے ابن عم شہید ہو گئے، وصی رسولؐ شہید ہو گئے ــــــ علی مرتضیٰؑ شہید ہو گئے ــــــ انہیں ایک بڑے شقی نے شہید کر دیا ــــــ (منتہی الآمال)

نہیں کوئی قوت مگر وہ کہ جو بڑی شان والے خدا سے ملتی ہے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

تیسری نشست

انسان کی ماہیت

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو
وہ انھوں نے پوری کر دیں۔ تب خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں
کا امام بنانے والا ہوں۔ انھوں نے عرض کی اور میری اولاد
میں سے ـــــ خدا نے فرمایا ہاں مگر میرے اس عہدے پر
ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ـــــ انسان کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں اختلاف رائے موجود ہے۔ اس کے متعلق ایک دوسرے کے بالمقابل دو بنیادی نظریے ہیں، جن میں سے ایک نظریہ خدا پرستوں اور دوسرا مادہ پرستوں کا ہے۔

خدا پرستوں کے نظریے کے مطابق انسان جسم اور روح سے مرکب ایک موجود ہے۔ انسان کی روح جاودانی ہے اور انسان کے مرنے سے فنا نہیں ہوتی۔

چنانچہ ہم جانتے ہیں، دین کی تعلیمات اور بالخصوص اسلامی نصوص اسی بات پر دلالت کرتی ہیں۔

مادہ پرستوں کے نظریے کے مطابق انسان اس بدن ــــ اور اس بدن کے نظام کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں اور مر جانے پر مکمل نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے بدن کی تحلیل کے معنی انسان کی شخصیت کا تحلیل ہو جانا ہے۔

باوجودیکہ انسان کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں اتنا بڑا اختلافِ نظر موجود ہے لیکن ایک اور معاملے کے بارے میں جو اس مسئلے سے وابستہ ہے ــــ کوئی اختلافِ نظر نہیں ہے۔ وہ معاملہ یہ ہے کہ ایک سلسلہ امور ہے جو مادے اور مادیات کی جنس سے نہیں ہے اور انہیں معنویات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ امور ایسی خصوصیات پر مبنی ہیں جو انسان کو شخصیت اور قدر و قیمت بخشتی ہیں اور انسان کا انسان ہونا انہی امور کی بدولت ہے۔ اگر انسان سے یہ خصوصیات لے لی جائیں تو انسان اور حیوانات میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ انسان کی انسانیت اس کی جسمانی ساخت کی بنا پر نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو شخص ایک سر اور دو کان رکھتا ہو، اس کے ناخن چپٹے اور قد سیدھا ہو تو وہ انسان ہے۔ خواہ کوئی بھی ہو اور کیسا ہی کیوں نہ ہو، یہ وہی بات ہے جو سعدی نے ان الفاظ میں کہی ہے:

تن آدمی شریف است بہ جان آدمیت　　نہ ہمیں لباس زیباست نشان آدمیت

اگر آدمی بہ چشم است و دہان و گوش بینی　　چہ میان نقش دیوار و میان آدمیت

انسان کا بدن اس کی روح کے باعث قابل قدر ہے، صرف یہ مناسب

بدن ہی آدمیت کی نشانی نہیں ہے۔ اگر اسی منہ، ناک، کان اور آنکھ کا نام ہی انسان ہے تو پھر دیوار پر بنی ہوئی آدمی کی تصویر اور خود اس آدمی میں کیا فرق رہے گا۔

ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ آدمی بننا اور آدمی ہونا مشکل ہے اور ایک مثل کہ جو طالب علموں کے ہاں مرتب ہوئی اور مشہور ہو گئی ــــ یعنی "ملا شدن چہ آسان" ــــ "آدم شدن چہ مشکل"۔ پس اگر اس بدن کے معنی ہی آدمی ہونے کے ہیں تو پھر جو لوگ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں وہ سب آدمی ہوتے ہیں۔ مگر نہیں ــــ ایسا نہیں ہے، بلکہ آدمی ہونا صفات، اخلاق اور معنوی امور کا ایک الگ سلسلہ ہے۔ گویا یہی وہ چیزیں ہیں جن کی بدولت انسان انسان ہے آدمی ہے اور قدر و قیمت اور شخصیت پیدا کرتا ہے۔

آجکل ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کا نام "انسانی قدریں" ہے۔ وہ تمام چیزیں جو انسان کو قدر و قیمت اور شخصیت عطا کرتی ہیں اور اگر وہ نہ ہوتیں تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ وہ "انسانی قدریں" کہلاتی ہیں۔

میں نے گزشتہ نشست میں جو کچھ عرض کیا تھا، آج کی نشست میں اس موضوع پر بیان جاری رکھنا چاہتا ہوں:

فرد یا معاشرے میں جو انحرافات پیدا ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم کے انحرافات یہ ہیں کہ انسانی قدروں کی اضداد ان کے مقابلے پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ــــ "ظلم" ــــ "عدل" کے مقابلے پر کھڑا ہو جاتا ہے ــــ "گھٹن" اور "پابندی" ــــ "آزادی" کے مقابلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں ــــ "بے عقیدتی" اور "بے اعتدالی" ــــ "عبادت" اور "خدا پرستی"

کے مقابلے میں کھڑی ہو جاتی ہیں "نادانی" اور "حماقت" ـــــ "عقل" "فہم" اور "حکمت" کے مقابلے پر کھڑی ہو جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ ..... لیکن شاید انسان کے زیادہ تر انحرافات اس شکل میں نہیں ہوتے کہ قدروں کی ضدیں ان کے مقابل کھڑی ہوں۔ اگر ایسا ہو تو جلد ہی شکست کھا جائیں بلکہ انسان کے بیشتر انحرافات اس شکل میں ہوتے ہیں جیسے سمندر میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات کوئی ایک انسانی قدر ـــــ سرطان کی مانند بڑھنے لگتی ہے اور دوسری قدروں کو اپنے نیچے دبا لیتی ہے۔ مثلاً زہد و تقویٰ بجائے خود ایک قدر ہے اور انسانی معیارات میں سے ایک معیار ہے۔ لیکن بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ ایک فرد یا ایک معاشرہ زہد کی جانب اس قدر مائل ہو جاتا ہے۔ وہ اس میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے زہد ہی سبھی کچھ ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا وہ اس شخص کی مانند ہو جاتا ہے جس کا فقط ایک عضو (مثلاً اس کی ناک) بڑھے اور اس کے باقی اعضاء کی ترقی رُک جائے۔

اب اس مقدمے کے ساتھ جو میں نے اس نشست میں عرض کیا ہے کہ تمام مکاتب فکر حتیٰ کہ انسان میں جو سب سے زیادہ مادہ پرست ہیں ـــــ وہ بھی معنوی قدروں کے ایک سلسلے کے قائل ہیں۔ اس بیان کے ساتھ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں :

اصولی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انسانی قدروں کا لب لباب ایک عنوان کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے اور پھر خود اس سے شاخیں نکلتی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو خود ہمارے عارفوں کی اصطلاح میں اور آجکل کے علماء کی

تحریروں میں بھی آئی ہے۔ بلکہ علمائے عرفان کی اصطلاح میں آنے سے پہلے یہ ہمارے اسلامی متون میں آئی ہے۔ اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ انسانیت کا اصلی معیار وہ چیز ہے جسے "درد رکھنے" یا "صاحب درد ہونے" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسانیت کا اصلی معیار ہے۔

انسان اور حیوان کے درمیان یہی فرق ہے کہ انسان صاحب درد ہے اور کبھی ایک درد رکھتا ہے لیکن جو انسان نہیں ہیں ..... چاہے وہ حیوان ہوں یا ایک سر اور دو کان رکھنے والے انسان کہ جو انسانیت کی طرح سے بے بہرہ ہوں، وہ صاحب درد نہیں ہوتے۔

اب سب سے پہلے ہمیں خود "درد" کے بارے میں بحث کرنی چاہیے۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں یہ بات ذہن کو عجیب سی لگے کہ آخر اس کے معنی کیا ہیں؟ درد ایک بری چیز ہے اور ایک ایسی چیز ہے جسے انسان کو اپنے آپ سے دور رکھنا چاہیے اور اسے ختم کر دینا چاہیے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسانیت کا معیار اور عظیم ترین قدر "درد رکھنا" ہو؟ آیا درد ایک اچھی چیز ہو سکتا ہے؟ شاید ہم غلطی کھا رہے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ اس کی اصلیت دریافت کریں۔ مثلاً ایک بیماری یا ایک زخم ہے تو جو چیز بری ہے وہ اس 'آفت' جرثومے، بیماری اور زخم کا وجود ہے جو بدن پہ وارد ہوتا ہے اور بعد میں درد کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ ایک انگلی کا کٹ جانا برا ہے، جو درد معدے یا انتڑیوں میں ہو اور انسان اس درد کو محسوس کرے اور...... بالآخر جو چیز انسان کے لیے بری ہے وہ زخم کا وجود ہے کہ جس سے نقصان پہنچتا ہے

لیکن خود درد ـــــ اگرچہ وہ انسان کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے، مگر وہ انسان کو ایک خرابی سے آگاہ اور ہشیار کرتا ہے۔ جب اعضاء میں ـــــ مثلاً انسان کے سر میں درد ہوتا ہے تو اس بات کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی ہو اور درد وجود میں آجائے۔ اگر درد پیدا ہوتا ہے تو وہ آپ کو خبر دیتا ہے اور مطلع کرتا ہے کہ سر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس خبر اور آگاہی کے نتیجے میں آپ اس کے علاج کی فکر کرتے ہیں۔ درد بعینہٖ سرعت رفتار اور پانی کے درجۂ حرارت کی علامتوں کی مانند ہے جو موٹر کا پانی کم ہو جانے کی نشاندہی کرتا ہے۔ نشاندہی کرنے والی سوئی اچھی چیز ہے لیکن پانی کا کم ہو جانا اور آپ کی موٹر کا گرم ہو جانا اچھی چیز نہیں ہے۔ اگر انسان کے بدن اور سر میں درد ہوتا اور وہ محسوس نہ کرتا تو ہرگز اسے بدنی خرابی کی پیشگی اطلاع نہ ہوتی اور بعد میں وہ اس خرابی کے علاج کا نہ سوچتا۔ یہ ایک مقررہ حاکم کی طرح انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ علاج معالجے کی فکر کرے۔ کیوں؟ اس لیے کہ "درد" ہے اور بے چینی ہے۔ اس کا علاج ضروری ہے ـــــ لہٰذا درد ایک نعمت ہے۔

عہد و پیمان می کنی کہ بعد از این
جز کہ طاعت نبودم کاری گزین
پس یقین گشت آنکہ بیماری ترا
می ببخشد ہوش و بیداری ترا
پس بدان این اصل را ای اصل جو
ہر کہ را درد است او بردہ است بو

ہر کہ او بیدار تر پر درد تر
ہر کہ او آگاہ تر رخ زرد تر

جب تو یہ عہد کرتا ہے کہ آج کے بعد بندگی کے سوا کوئی کام نہ کروں گا۔ اس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تکلیف تجھے ہوش اور بیداری میں رکھے گی۔

اے طالب حق تو اس حقیقت کو سمجھ لے کہ ایک درد آشنا ہی حق کو پاتا ہے۔ جو زیادہ بیدار ہے وہ زیادہ درد آشنا اور جو زیادہ باخبر ہے وہ زیادہ پریشان ہے۔

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۱۸)

جو شخص دنیا میں زیادہ صاحب درد اور ایسا درد محسوس کرے جو دوسرے محسوس نہیں کرتے تو وہ اسی نسبت سے ان سے زیادہ جاننے والا اور زیادہ بیدار ہوتا ہے "بی دردی" ــ عریانی، بے حسی، بے شعوری اور بے ادراکی کے برابر ہے، جبکہ دردمندی ــــ آگاہی، بیداری، شعور اور ادراک کے مساوی ہے۔

اگر انسان کا معاملہ ایسا ہو کہ وہ آرام میں ہو لیکن بے درد ہو اور درد محسوس نہ کرتا ہو یعنی جاہل اور بے درد ہو یا یہ کہ وہ ہوشیار ہو اور اپنا درد محسوس کرتا ہو؟ کیا ایک انسان اس بات کو ترجیح دے گا کہ وہ ہوشیار اور سمجھدار ہو اور درد محسوس کرے یا اس بات کو ترجیح دے گا کہ وہ بے عقل، کند ذہن اور احمق ہو اور درد کو محسوس نہ کرے؟ گویا کہ ایک "ہوشیار" اور "آگاہ" شخص کی بے چینی ــــ کسی جاہل، بے خبر اور بے حس شخص

کے آرام اور آسائش پر فوقیت رکھتی ہے۔

ایک ضرب المثل ہے کہ انسان اگر سقراط ہو، لیکن دبلا پتلا اور کمزور ہو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ سوّر کی طرح ہٹا کٹا ہو۔ یعنی جو شخص سقراط کی طرح دانا اور عالم ہو لیکن آسائش سے محروم ہو تو بھی وہ اس سے بہتر ہے کہ سوّر کی طرح کھانے پینے کو سب کچھ میسر ہو لیکن وہ کوئی سمجھ بوجھ نہ رکھتا ہو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری ادبیات میں جو ایک چیز نمایاں ہے، وہ عقل سے شکایت کا مسئلہ ہے۔ اپنی نظم و نثر میں اور بالخصوص نظم میں ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ شعراء نے عقل کی شکایت کی ہے۔ کاش ہم یہ عقل نہ رکھتے ہوتے۔ البتہ عقل سے یہ شکایت ایک مختلف پہلو رکھتی ہے۔ عارفوں کی نظر ایک اور چیز پر ہے لیکن بہت سے اشخاص نے اس بنا پر شکایت کی ہے کہ ہوشیار، حساس اور دانا ہونا انسان سے آسائش سلب کر لیتا ہے۔

ایک شاعر کہتا ہے:

دشمن جان من است عقل من و ہوش من
کاش کشادہ نبود چشم من و گوش من

میری عقل اور ہوش میری جان کے دشمن ہیں، کیا اچھا ہوتا کہ میری آنکھ اور کان ــــ دیکھنے سننے سے محروم ہوتے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

عاقل مباش تا غم دیوانگاں خوری
دیوانہ باش تا غم تو عاقلاں خورند

تو عاقل نہ بن کہ تجھے دیوانوں کا غم کھانا پڑے بلکہ دیوانہ ہو جا کہ عقل مند

تیری فکر کیا کریں۔

یعنی وہ "جنون کی بے فکری اور آسائش" کو "عقل کی فکر مندی اور ناراحتی" پر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ اور گفتار سراسر غلط ہے، کیونکہ جو شخص انسانیت کے مقام پر پہنچ جائے اور حساسیت اور "دردمندی" کی قدر و قیمت کو سمجھ گیا ہو وہ ہرگز یہ نہیں کہتا:

"دشمن جان من است، عقل من ہوش من"

بلکہ وہ رسول اکرمؐ کی یہ حدیث نقل کرتا ہے:

۲۸ ہر شخص کی سچی دوست اس کی عقل اور ہوش ہے اور ہر شخص کی حقیقی دشمن اس کی جہالت اور نادانی ہے۔

(وسائل الشیعہ جلد ا صفحہ ۱۶۱)

جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ عقل و ہوش میری جان کے دشمن ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہالت اور نادانی سے پیدا ہونیوالی پریشانیوں اور مصیبتوں کو محسوس نہیں کرتا، ورنہ وہ ہرگز یہ بات نہ کہتا ـــــ لہٰذا درد اور درد کا احساس، اچھی چیزیں ہیں۔ اگر صورت یہ ہو کہ انسان کے اندر "درد کا موجب" نہ ہو اور انسان درد نہ رکھتا ہو تو "درد کا موجب" نہ ہونے کی بنا پر درد نہ رکھنا، درد رکھنے سے بہتر ہے۔ لیکن اگر درد کا موجب موجود ہو، خرابی موجود ہو اور اس کی بنیاد موجود ہو، مگر انسان درد کا احساس نہ کرے تو یہ بے خبری، بیچارگی اور بدبختی ہے۔ لہٰذا جسمانی بیماریوں میں سے جو بھی بیماری آئے اور شروع میں اس کا درد محسوس نہ ہو تو وہ مہلک ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر ابتدا میں ہی درد کا موجب ظاہر ہو جائے اور انسان درد کا احساس

کرے تو ممکن ہے کہ اس کا علاج کر لیا جائے یا کم از کم اس سے پیشتر کہ وہ چیز خون میں داخل ہو، اسے آپریشن کے ذریعے نکال دیا جائے۔ اس بیماری سے اس بنا پر زیادہ خطرہ ہے کہ وہ بے خبری کے عالم میں یعنی درد کے بغیر وارد ہوتی ہے۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانیت کی اقدار میں سب سے بڑی قدر "درد رکھنا" ہے یا درد بری چیز ہے اور اس کا علاج کرنا چاہیے نہیں ــــ ایسا نہیں ہے اور درد اچھی چیز ہے۔ اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور غور کرتے ہیں کہ انسان کا درد کیا ہے؟ آدمی کے سر میں درد ہوتا ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ انسان ہے، وہ درد انسان کا نہیں ہے۔ کیونکہ ایک حیوان کے سر میں بھی درد ہوتا ہے۔ انسان کے ہاتھ میں درد ہوتا ہے، انسان کے پاؤں میں درد ہوتا ہے اور...... تاہم یہ جو حیوانی، عضوی اور شخصی درد ہیں یہ مشترک درد ہیں لیکن وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ــــ "انسان کا درد" ــــ اس کا "صاحب درد ہونا" ہے۔ ان کی مراد یہ جسمانی درد نہیں ہے بلکہ وہ ایک اور چیز ہے۔ ہاں ــــ وہ درد جو انسان اور انسانیت کی قدروں میں سب سے بڑی قدر ہے۔ وہ اس درد سے ایک مختلف چیز ہے۔

خود ہمارے عارفوں کی طرح ایک اور گروہ بھی انسان کے بارے میں جس درد کا اقرار کرتا ہے وہ بھی "درد" ہے۔ وہ لوگ اسے مقدس قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ انسان کے امتیازات میں سے ہے۔ بلکہ انسان اس بنا پر فرشتے پر فوقیت رکھتا ہے، کیونکہ فرشتہ بے درد ہے اور انسان درد رکھتا ہے۔ یہ وہ درد ہے جسے عارف لوگ "خدا کی تلاش کا درد"

کہتے ہیں لیکن یہ فقط انہی کا نظریہ نہیں ــــ اس بارے میں اسلام کا نظریہ بھی یہی ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان ایک ایسی حقیقت ہے جو نفخہء الٰہی سے وجود میں آئی ہے۔ انسان ایک دوسری دنیا سے آیا ہے اور اس دنیا کی طبعی چیزوں کے ساتھ مکمل یک رنگی نہیں رکھتا۔ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کے تمام موجودات کے ساتھ اپنی اجنبیت' بیگانگی اور عدم مطابقت کو محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ یہ سب فانی اور متغیر ہیں۔ لہذا دل لگانے کے قابل نہیں ہیں لیکن انسان میں جاوداں بن جانے کا ایک داعیہ وجود رکھتا ہے۔ پس یہی وہ درد اور یہی وہ قوت ہے جو انسان کو خدا پرستی' عبادت گزاری اور اس سے راز و نیاز کرنے نیز اس کے نزدیک ہونے کی جانب کھینچتی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے عرفان میں اس موضوع پر کیسی کیسی امثال آئی ہیں۔ بعض اوقات ایک طوطے کی مثال دی جاتی ہے جس کو ہندوستان کے جنگلوں سے لایا گیا اور دوسرے طوطوں سے الگ کر کے ایک پنجرے میں قید کر دیا گیا۔ پھر یہ حیوان اداس رہتا ہے اور ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے کہ یہ پنجرہ ٹوٹ جائے اور وہ لوٹ کر اس جگہ چلا جائے جو اس کا اصلی وطن ہے۔

کبھی اسے ایک ایسے پرندے سے تشبیہ دی جاتی ہے جو اپنے گھونسلے سے دور جا پڑا ہو۔ اس طرح کی بہترین تشبیہوں میں سے ایک تشبیہ خود مولوی معنوی کی ہے۔ انہوں نے مثنوی کی ابتدا میں ہی اسے اس بانسری کی لکڑی سے تشبیہ دی ہے جسے جنگل سے کاٹا گیا ہے۔ وہ مسلسل

نالہ و فریاد اس لیے کر رہی ہے کہ اپنی اصل سے جدا ہو گئی ہے:

بشنو از نی چوں حکایت می کند
واز جدائیہا شکایت می کند
کز نیستاں چون مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق
دو دہان داریم گویا ہمچو نی
یک دہاں پنہا نست در لبہای وی

بنسری سے کے سنو کہ وہ اپنے فراق کی بات بتا رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے جنگل سے کاٹا گیا اور میری آواز پر سب روتے ہیں۔ میرا دل درد فراق سے ٹکڑے ٹکڑے ہو تا کہ میں اپنی محبت کا قصہ سناؤں۔ بنسری کی طرح ہمارے دو منہ ہیں اور ایک اس کے ہونٹوں میں پوشیدہ ہے۔

(مثنوی مولانا روم۔ ابتدائی اشعار)

اس کے علاوہ اسے ہاتھی سے بھی تشبیہہ دیتے ہیں۔ جیسے ایک مشہور داستان میں کہا گیا ہے کہ ہاتھی عموماً ہندوستان سے لایا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے سر پر مسلسل ضربیں لگائی جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ہاتھی اپنے اصل وطن ہندوستان کو یاد کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی کہتے ہیں:

پیل باید تا چو خسپد او ستان
خواب بیند خطۂ ہندوستان
خر نبیند ہیچ ہندوستان بہ خواب
خر ز ہندوستان نکردہ است اغتراب

ہاتھی جب اپنے استھان پر ہوتا ہے تو ہندوستان کے خواب دیکھتا ہے۔
گدھا ہندوستان کے خواب نہیں دیکھتا، کیونکہ وہ وہاں سے نہیں نکلا ہے (مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۴۰۰)

یعنی یہ فقط ہاتھی ہی ہے جو خواب میں ہندوستان کو دیکھتا ہے، کیونکہ وہ ہندوستان سے آیا ہے۔ گدھا ہرگز ہندوستان کو خواب میں نہیں دیکھتا کیونکہ اسے ہندوستان سے نہیں لایا گیا اور وہ اپنے وطن سے دور نہیں ہوا۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسان عرفانی درد کی بدولت دوسری دنیا کی جانب پلٹ جانے کی کسک رکھتا ہے۔ درد اسے حق کی جانب اور خدا کی طرف رجوع ہونے پر مائل کرتا ہے۔ وہ خدا سے مناجات کرنے اور اپنے خالق سے وصال کا درد رکھتا ہے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام نے کیا عمدہ بات کہی ہے۔ ایک دن آپ نے اپنے صحابی کمیل بن زیاد نخعی (رحمۃ اللہ علیہ) کا ہاتھ پکڑا، اور قبرستان کی جانب لے چلے۔ جب کچھ دیر بعد آپ آبادی سے باہر نکل آئے تو ایک لمبی آہ کھینچ کر بولے:

۲۹ اے کمیل! یہ دل اسرار و حکمت کے ظروف ہیں۔ ان میں

سب سے بہتر وہ ہے جس کی ظرفیت زیادہ ہو یا وہ بہتر نگہداشت کرنیوالا ہو"

اس کے بعد مولا امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا: اے کمیل! جو بات میں تمہیں بتا رہا ہوں اسے دھیان سے سننا اور یاد رکھنا۔ بعدازاں امیرالمومنین دنیا کے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر اپنے کلام کے آخر تک پہنچتے ہیں ——— اور شکایت کرتے ہیں: افسوس! ۔ راز حقیقت کے سننے اور سمجھنے والے افراد موجود نہیں کہ میں ان کو اپنے دل کی بات بتاؤں۔ اور اپنا دردِ دل ان پر ظاہر کر سکوں..... بعد میں فرماتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھی رازداں نہ ہو۔ کیونکہ ہمیشہ اور ہر زمانے میں ایسے کچھ نہ کچھ افراد موجود ہوتے ہیں۔

ہاں! مگر زمین ایسے فرد سے خالی نہیں رہتی کہ جو خدا کی حجت کو برقرار رکھتا ہے۔ چاہے وہ ظاہر و مشہور ہو یا خائف و پنہاں، تاکہ اللہ کی دلیلیں اور نشان مٹنے نہ پائیں ———

اور وہ ہیں ہی کتنے اور کہاں پر ہیں!

خدا کی قسم! وہ تو گنتی میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور اللہ کے نزدیک قدر و منزلت میں بہت بلند۔ خداوند عالم ان کے ذریعے سے اپنی حجتوں اور نشانیوں کی حفاظت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان کو اپنے جیسوں کے سپرد کر دیں اور اپنے جیسوں کے دلوں میں انہیں بو دیں۔ علم نے انہیں ایک دم حقیقت و بصیرت کے انکشافات تک پہنچا دیا ہے۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۱۴۷)

وہ اس طرح کے اشخاص ہیں کہ علم حقیقی نے انتہائی بصیرت کے ہمراہ ان کو اپنے دامن میں لے لیا ہے اور وہ یقین کامل کے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔

۱۳۔ وہ یقین و اعتماد کی روح سے گھل مل گئے ہیں اور ان چیزوں کو جنہیں آرام پسند لوگوں نے دشوار قرار دے رکھا تھا اپنے لیے سہل و آسان سمجھ لیا ہے اور جن چیزوں سے جاہل بھڑک اٹھتے ہیں، ان سے جی لگائے بیٹھے ہیں۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین ۔ حکمت ۱۴۷)

انہوں نے "یقین کامل" کی روح کے ساتھ اتصال پیدا کر لیا ہے اور اس کے ساتھ یک جان ہو گئے ہیں، گویا روح یقین کے اور ان کے درمیان اب کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ وہ چیزیں کہ جو اہل طرب اور مادہ پرستوں کے لیے بے حد سخت ہیں وہ ان کے لیے سہل اور نرم ہیں۔ جو چیز (یعنی خدا کے ساتھ خلوت) ان (مادہ پرستوں) کے لیے وحشت کا موجب ہے وہ ان کے لیے مایۂ انس و رفیق ہے۔

۱۴۔ وہ ایسے جسموں کے ساتھ دنیا میں رہتے ہیں کہ جن کی روحیں ملاءِ اعلیٰ سے وابستہ ہیں۔

(حوالہ سابق)

یہ دنیا میں لوگوں کے ہمراہ ہیں لیکن ایسی روحوں کے ساتھ کہ جن کا تعلق ایک بالاترین عالم سے ہے۔ وہ اس دنیا میں ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں نہیں ــــ حالانکہ وہ اس دنیا میں ہیں، مگر وہ دوسری دنیا میں بھی ہیں۔ یہ ہیں علیؑ اور یہ ہیں علی کے درد یعنی علیؑ کا درد عرفان،

علیؑ کا دردِ عبادت، علیؑ کی مناجاتیں اور .....

ایک اور مسئلہ جو بڑا ظاہر اور واضح ہے کہ عبادت میں آپ کا مجاہدہ یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ آپ بے خود ہو جاتے تھے۔ آپ اپنے محبوب اور معشوقِ خدائے لم یزال کی یاد میں اتنے محو ہو جاتے تھے کہ آپ کے ارگرد خواہ کچھ بھی ہو جاتا ـــــــ اس کی انہیں کوئی خبر نہیں ہوتی تھی، حتیٰ کہ اگر آپ کے بدن سے تیر بھی کھینچ لیا جائے تو آپ کو احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ یہ انسان کا درد ہے، یہ حق تعالیٰ سے جدائی، اس کی ذات سے تقرب کی آرزو اور اشتیاق، اس کی جانب حرکت اور اس کے نزدیک ہونے کا درد ہے۔ کیونکہ جب تک انسان ذاتِ حق تک نہیں پہنچ جاتا، اس کی یہ بے چینی اور یہ اضطراب زائل اور برطرف نہیں ہوتا اور اس کی یہ بے چینی اور اضطراب کی حالت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو اگر کسی چیز یا کسی عمل میں مشغول کر لیتا ہے تو یہ محض ایک دل بہلاوا ہوتا ہے اور اس کی حقیقت کوئی اور چیز ہے، جیسے قرآن مجید ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔

۳۳ ... جان لو کہ دل فقط ایک چیز کے ذریعے بے چینی سے سکون پاتے ہیں اور وہ اللہ کا ذکر ہے۔

(سورۂ رعد۔ آیت ۲۸)

یعنی انسان کا یہ درد صرف ایک وسیلے سے آرام حاصل کر سکتا ہے اور وہ یادِ حق میں مشغول ہونا اور پروردگار کی ذات سے انس پیدا کرنا ہے۔ پس یہ ہے انسان کے دردوں میں سے ایک درد!

عارفوں نے زیادہ تر اس ایک درد پر تکیہ کیا اور کسی دوسرے درد کی جانب توجہ نہیں دی یا بہت کم توجہ دی ہے۔

مولوی معنوی کہتے ہیں:

حسرت و زاری کہ در بیماری است
وقت بیماری ہمہ بیداری است
ہر کہ او بیدار تر پر درد تر
ہر کہ او ہشیار تر رخ زرد تر
پس بدان این اصل را ای اصل جو
ہر کہ را درد است او بردہ است بو

بیماری میں غم اور پریشانی ہے، اس لیے وہ انسان کو بیدار رکھتی ہے۔

جو زیادہ بیدار ہے وہ زیادہ درد آشنا ہے اور جو زیادہ باخبر ہے وہ زیادہ پریشان ہے۔

اے طالبِ حق تو اس حقیقت کو سمجھ لے کہ ایک درد آشنا ہی حق کو پاتا ہے۔

مولوی معنوی نے ایک داستان نقل کی ہے جو مجھے ابھی یاد آئی ہے اور اگر میں اسے بیان نہ کروں تو یہ میرے لیے افسوس کی بات ہو گی۔

یہ ایک تمثیل ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

ایک آدمی تھا جو ہمیشہ اپنے خدا سے راز و نیاز میں رہتا اور اللہ ـــ اللہ ـــ کا ورد کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شیطان اس کے

سامنے آیا اور اسے وسوسے میں ڈال گیا۔ اس نے کچھ ایسا کام کیا کہ یہ آدمی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ہوا یہ کہ شیطان اس کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے شخص! یہ جو تم اللہ ــــ اللہ ــــ کرتے رہتے ہو ــــ روزانہ صبح کے وقت جاگ اٹھتے ہو اور بڑے درد کے ساتھ اللہ کے نام کا ورد کرتے ہو تو کیا ایک بار بھی ایسا ہوا کہ تم نے لبیک کا لفظ سنا ہو؟ اگر تم کسی کے گھر گئے ہوتے اور اتنی نالہ و زاری کی ہوتی تو کم از کم ایک بار تو تمہیں جواب ملتا اور تمہاری آواز پر لبیک کہی جاتی۔ اس آدمی نے دیکھا کہ بظاہر بات سچے کی ہے شیطان کی یہ بات اس امر کا موجب بنی کہ اس آدمی کا منہ بند ہو گیا اور اس نے اللہ ــــ اللہ کرنا چھوڑ دیا۔ پھر عالم رویا میں ہاتف نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنی مناجات کیوں ترک کر دی؟

اس نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ میری اس تمام مناجات اور اس تمام درد اور سوز کے باوجود ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے جواب میں لبیک کہی گئی ہو۔

ہاتف نے کہا: لیکن میں اس کام پر مامور ہوں کہ تمہیں خدا کی طرف سے جواب دوں:

گفت هان الله تو لبیک ماست
آن نیاز و سوز و دردت پیک ماست

یعنی ہاتف نے اس شخص سے کہا کہ وہی درد، وہی سوز اور وہی عشق اور شوق جسے ہم نے تمہارے دل میں قرار دیا ہے وہ ہماری طرف سے بجائے خود

ایک بیک ہے۔

اب غور کیجیے کہ امام علیؑ دعائے کمیل میں یہ کیوں عرض کرتے ہیں:

اے خدا! میرے ایسے تمام گناہوں کو بخش دے۔ جو اس بات کا سبب بنیں کہ میں دعا کرنے سے باز رہوں، نیز وہ اس بات کا سبب بنیں کہ دعا اور مناجات کرنے کا درد مجھ سے چھن جائے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دعا انسان کے لیے مطلوب بھی ہے اور وسیلہ بھی ہے، یعنی دعا ہمیشہ قبول ہونے کے لیے نہیں ہوتی کیونکہ دعا اگر قبول نہ بھی ہو تو بھی وہ بجائے خود انسان کا مطلوب ہے۔

کچھ اور لوگ جو درد کو ایک عظیم انسانی قدر تسلیم کرتے ہیں، وہ انسان کے درد کے بارے میں ایک اور چیز کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہے انسان کا درد "خلقِ خدا کی نسبت سے"۔ نہ کہ انسان کا درد "خدا کی نسبت سے"۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی انسانیت کا معیار یہ ہے کہ وہ دوسروں کے لیے درد رکھتا ہو۔ یعنی وہ تکلیفیں جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور وہ اسے نہیں بلکہ کسی دوسرے کو پہنچ رہی ہیں، وہ اس کے اندر درد پیدا کریں اور بقول سعدی وہ دوسروں کا غم خوار بنا رہے:

من از بے نوائی نیم رنگ زرد
غم بے نوایان رخم زرد کرد

میرا رنگ تنگدستی سے زرد نہیں ہوا، بلکہ تنگدستوں کے غم نے میرا چہرہ زرد کر دیا ہے۔

یہ بھی ایک درد ہے ـــــ اور اگر انسان کے دل میں دوسروں کے لیے درد پیدا ہو جائے تو اس سے غم خواری پیدا ہوتی ہے یعنی اور لوگ بھوکے ہوں تو اسے نیند نہیں آتی، وہ دوسرے کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا دیکھتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کانٹا خود اس کی آنکھ میں جا گڑا ہو۔ یہ درد ـــــ انسان کا وہ درد ہے ـــــ جو اس کو شخصیت اور قدر و قیمت عطا کرتا ہے اور یہی تمام انسانی قدروں کا سرچشمہ ہے۔

آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ "انسانیت" "انسانیت" کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ وہ گفتگو کے علاوہ کسی دوسرے مقام پر انسانیت کو یاد نہیں کرتے۔ ہر وہ چیز جس کی بازگشت انسان کے اس احساس ذمہ داری کی طرف ہو جو وہ دوسرے انسانوں کے لیے رکھتا ہو ـــــ وہ دوسرے انسانوں کے لیے انسان کا درد ہے۔ وہ لوگ اسے انسانی قدر سمجھتے ہیں، مگر اصل میں یہ بھی انسانی قدروں کا کسی ایک قدر میں گم ہونا اور مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے؟

اسلام اور اسلامی معیارات کے لحاظ سے ایک ایسا شخص انسان ہے جو دوسروں کا درد رکھتا ہو؟ یا وہ شخص جو فقط خدا کی محبت کا درد رکھتا ہو؟ یا وہ شخص جو خدا کی محبت کا درد رکھتا ہو اور خدا کا درد رکھنے کی وجہ سے دوسرے انسانوں کا درد بھی رکھتا ہو؟ پس تینوں میں سے اصلی درد کونسا ہے؟

اب آپ دیکھیں کہ قرآن مجید کن الفاظ میں بات کر رہا ہے، جبکہ

رسول اکرمؐ کے بارے میں کہتا ہے:

۳۴؎ (اے رسولؐ!) اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو شاید تم مارے افسوس کے ان کے پیچھے اپنی جان دے ڈالو گے۔

(سورۂ کہف۔ آیت ۶)

دنیا کی ہدایت و خوش بختی کے لیے اور انہیں دنیا و آخرت کی بندشوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کے لیے ـــــ پیغمبرؐ اتنے حریص ہیں کہ اس میں اپنے آپ کو مار ڈالنا اور ہلاک کر دینا چاہتے ہیں۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت پوچھتی ہے کہ آخر یہ کیا بات ہے؟ آپ لوگوں کی خاطر اپنی جان کیوں ہلکان کرتے ہیں؟

۳۵؎ اے طٰہٰ (رسولؐ!) ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم اس قدر مشقت اٹھاؤ۔ مگر جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اس کے لیے نصیحت ہے۔

(سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱ تا ۳)

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

۳۶؎ لوگو! تم ہی میں سے ہمارا ایک رسولؐ تمہارے پاس آچکا ہے، اس پر شاق ہے کہ تم تکلیف اٹھاؤ اور اسے تمہاری بہتری کی فکر ہے۔ وہ ایمانداروں پر حد درجہ شفیق ہے۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۲۸)

دیکھیے قرآن مجید کی تعبیر کتنی لطیف ہے۔ اے لوگو خود تمہارے درمیان میں سے اور تمہاری جنس میں سے تمہارے لیے ایک پیغمبرؐ آیا ہے، اس کی

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ”عزیز علیہ ما عنتم“۔ ”عنت“۔ یعنی تمہاری مشکلیں، تکلیفیں اور پریشانیاں اسے ناگوار ہیں۔ کیونکہ وہ تمہارا درد رکھتا ہے۔ ہاں تو تمہارا پیغمبرؐ وہ شخص ہے جو تمہارا درد رکھتا ہے۔ پس مسلمان بھی وہی شخص ہے جو خدا کا درد بھی رکھتا ہو۔

اب رہا یہ جملہ کہ ”وہ تم پر حریص ہے“۔ اس کی تشریح کچھ یوں ہے، جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض باپ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے پڑھ لکھ جائیں۔۔۔۔ پھر وہ ان کی پڑھائی پر بہت سا خرچ بھی کرتے ہیں اور خود مشقت اٹھاتے ہیں، یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس بات پر حریص ہے کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ جائے۔ گویا جس طرح باپ اپنے بیٹے کی بہتر تعلیم پر حریص ہوتا ہے اور ایک آدمی دنیا کے مال پر حریص ہوتا ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔۔۔ پیغمبرؐ لوگوں کے حریص ہیں اور لوگوں کے دکھوں اور تکلیفوں کو ان سے دور کرنے کے حریص ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ خود امام علی علیہ السلام بھی درد کی یہی تعبیر نہیں کرتے؟ جب کہ آپ کو اطلاع دی گئی کہ بصرہ میں عثمان بن حنیف نے ایک دعوت طعام میں شرکت کی ہے۔ اس دعوت میں کیا بات تھی؟ العیاذ باللہ کیا اس میں شراب پی گئی، جوا کھیلا گیا یا فسق و فجور کا ارتکاب ہوا؟ نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر کیا ہوا؟ اس دعوت کی برائی اور عثمان بن حنیف کی غلطی یہ تھی کہ اس میں سو فیصد اونچے طبقے کے لوگ شامل تھے۔ یعنی فقراء میں سے کوئی نہ تھا۔ چنانچہ جب امام علیؑ کو یہ اطلاع ملی کہ آپ کے مقرر کردہ حاکم اور نمائندے نے ایک ایسی دعوت میں شرکت کی ہے کہ جس میں صرف امیر لوگ

شامل تھے اور فقرا میں سے کوئی نہیں تھا ـــــ ہاں تو آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا فرمایا؟

آپ نے فرمایا:

۳۷ مجھے امید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کر لوگے کہ جن کے یہاں فقیر و نادار دھتکارے گئے ہوں اور دولتمند مدعو ہوں۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ مکتوب ۴۵)

پھر آپ اپنے دردوں کو بیان کرنا شروع کرتے اور فرماتے ہیں:

۳۸ اگر میں چاہتا تو صاف ستھرے شہد، عمدہ گیہوں اور ریشم کے بنے ہوئے کپڑوں کے لیے ذرائع مہیا کر سکتا تھا لیکن ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ خواہشیں مجھے مغلوب بنا لیں اور حرص مجھے لے چلے۔ (حوالۂ سابق)

غور کیجیے کہ امام علیؑ یہ نہیں کہنا چاہتے کہ اچھا لباس پہننا یا اچھی غذا کھانا حرام ہے، نہیں ـــــ مسئلہ یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے، ورنہ علیؑ کیوں کہتے ہیں کہ ہیہات......؟

اس کے بعد فرماتے ہیں:

۳۹ شاید کہ حجاز و یمامہ میں ایسے لوگ ہوں جنہیں ایک روٹی کے ملنے کی بھی آس نہ ہو اور انہیں پیٹ بھر کر کھانا کبھی نصیب نہ ہوا ہو۔ کیا میں شکم سیر ہو کر سوتا رہوں؟ جب کہ میرے گرد و پیش بھوکے پیٹ لوگ موجود ہوں۔

(حوالہ سابق)

کیا میں ایسا بن جاؤں جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

۴۰؎ یعنی اتنا ہی درد تیرے لیے کافی ہے کہ تو پیٹ بھر کے سو نا رہے اور تیرے ارد گرد بھوکے لوگ موجود ہوں۔

(حوالہ سابق)

اسے کہتے ہیں "خلق خدا کا درد" — اسے کہتے ہیں "حب انسانیت"۔ اور اسی کو تمام "انسانی قدروں کی ماں" کہتے ہیں۔ ذرا آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ کامل انسان — علیؑ کیا کہہ رہے ہیں:

۴۱؎ کیا میں اسی میں مگن رہوں کہ مجھے امیر المومنینؑ کہا جاتا ہے۔ مگر میں زمانے کی سختیوں میں مومنوں کا شریک ہمدم نہ ہوں۔ (حوالہ سابق)

کیا میں اپنے اس لقب اور افتخار پر قناعت کر لوں؟ کیا میں اس بات پر قناعت کر لوں کہ مجھے امیر المومنینؑ کا لقب دیا جاتا ہے اور خلیفہ و رئیس کہا جاتا ہے — لیکن زمانے کی سختیوں میں مومنوں کے ساتھ شرکت نہ کروں؟ آپ دیکھیں کہ یہ تمام باتیں دوسروں کے درد کا احساس کرنے کے بارے میں ہیں۔ جو درد انسان دوسروں کے لیے رکھتا ہے اس میں لذت ہوتی ہے۔ دوسروں کا درد رکھنے کی اس لذت میں کیا راز ہے؟ یہ بات خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اس ضمن میں بوعلی سینا نے "اشارات" کے آخر میں بطور مثال "بدن کی ورزش" کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان بدن کو کھچاتا ہے تو اسے درد تو ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے ایک لذت بھی

حاصل ہوتی ہے اور بدن کا کھجانا اسے اچھا لگتا ہے۔ یہ درد ہے۔ لیکن "درد تلخ" نہیں ہے ـــــ یہ درست ہے کہ وہ دل کو جلاتا ہے اور آنسو بھی نکال لاتا ہے لیکن یہ غم اور یہ درد محبوب اور مطلوب ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان ہمیشہ رنج و غم سے دور بھاگتا ہے لیکن اگر کوئی اسے کہے کہ فلاں جگہ حضرت سید الشہداؑ کی مجلس بپا ہے" آؤ میرے ساتھ چلو کہ وہاں کچھ آنسو بہائیں" تب وہ پوری رضامندی کے ساتھ ایسی مجالس میں شریک ہوتا ہے اور آنسو بہاتا ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کا دل نہ دکھے وہ آنسو نہیں بہاتا۔ چونکہ مجلس سید الشہداؑ میں ان کے مصائب پر اس کا دل دکھتا ہے" اس لیے وہ آنسو بہاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کا جی چاہتا ہے کہ اس مجلس میں حالت غم کے ساتھ جائے" اس درد کو محسوس کرے اور پھر آنسو بہائے ـــــ جب آنسوؤں کے یہ قطرے ٹپکتے ہیں تو انسان ایک قسم کا اطمینان محسوس کرتا ہے۔ تاہم اس بدن کا حال تو اور بھی دشوار ہے اور یہ ایک روح سب کا درد محسوس کرتی ہے۔ اس لیے آسائش کے تمام امکانات فراہم ہونے کے باوجود وہ اس بات پر تیار ہے کہ جو کی روٹی پر گزارہ کرے ـــــ مبادا کہ حجاز یا یمامہ کے کوئی شخص بھوکا سو جائے۔ یہ وہ بدن ہے جسے پیوند لگے جوتے پہننے چاہئیں تاکہ وہ علیؑ کی روح کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

بقول اس شاعر کے کہ جو کہتا ہے کہ جب روح بڑی ہو جائے تو وائے ہے اس روح کے حال پر ـــــ کیونکہ جب روح بڑی ہو جاتی ہے" سب بدنوں کی روح بن جاتی ہے اور سب کا درد محسوس کرتی ہے تو اس کا معاملہ بڑا سنگین ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ایک بیوہ عورت اور چند یتیم بچوں کے

حال سے غافل رہنے پر دکھی اور غمگین ہوتی ہے۔ جیسے روایت میں ہے کہ امام علیؑ ایک گلی میں تشریف لاتے ہیں اور ایک عورت کو دیکھتے ہیں جو ایک مشک کندھے پر اٹھائے ہوئے ہے۔ کیا علیؑ ایسے منظر سے آنکھیں بند کر کے گزر سکتے ہیں؟ جب آپ یہ منظر دیکھتے ہیں تو آپ کے دل میں درد اٹھتا ہے۔ ایسا کیوں ہو؟ کوئی وجہ نہیں کہ ایک عورت جو خود پانی بھر کر لاتی ہے، یقیناً اس کا کوئی نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو اس کی مدد نہیں کرتا۔ اب علیؑ آگے بڑھتے ہیں اور بکمال ادب سے فرماتے ہیں:

خاتون! کیا آپ مجھے اجازت دیتی ہیں کہ میں آپ کی مدد کروں؟ بالآخر آپ اس کی مدد کرتے ہیں اور اس کے گھر پہنچتے ہیں۔ پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ بتا سکیں گی کہ آپ خود کیوں پانی بھرتی ہیں؟

وہ بتاتی ہے: جی ہاں! اتفاق ایسا ہوا کہ میرا شوہر علی ابن ابیطالبؑ کی معیت میں مارا گیا اور اب میرا کوئی سرپرست نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ الفاظ سن کر امام علی علیہ السلام بے حد مضطرب ہوئے اور اس رات جب آپ گھر گئے تو رات بھر نہیں سوئے اور جب صبح ہوئی تو آپ خود اور آپ کے رفقا، گوشت، روٹی اور کھجوریں اٹھا کر اس عورت کے گھر پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی آپ نے جتنی جلدی ہو سکا ــــــ اپنے مبارک ہاتھوں سے ساتھ گوشت بھونا اور ان یتیم بچوں کو کھلایا۔ پھر آپ نے ان کو اپنی پرشفقت گود میں بٹھایا اور آہستہ سے فرمایا: علیؑ جو تم سے غافل رہا ہے اس کی تقصیر معاف کر دو۔ اس کے بعد آپ نے تنور جلایا اور اس بھڑکتی آگ کے نزدیک گئے۔ جب آگ کی تپش محسوس ہوئی تو اپنے آپ سے کہا: اے علیؑ! دنیا کی اس

آگ کی تپش کا مزا چکھو اور دوزخ کی آگ کو یاد کرو، تاکہ تم عام لوگوں، یتیموں اور بیکسوں کے حال سے غافل نہ رہو۔

اے پروردگار! ہم تجھے امام علی علیہ السلام کے حق کی قسم دیتے ہیں کہ ہمارے دل میں اسلام کا درد پیدا کردے۔ اے خدا! ہمارے دلوں میں اپنی محبت، اطاعت اور عبادت کا درد رکھ دے۔ ہمارے اندر اپنی مخلوق کے لیے ہمدردی کا احساس پیدا فرما دے۔ اے رب کریم! تو ہمیں امام علی علیہ السلام کی ولایت کے نور کے خیمہ میں داخل فرما اور ان بزرگوار کا حقیقی پیرو بنا۔ الٰہی! دلوں کو نور ایمان سے منور کردے اور ہمارا انجام اچھا ہو۔ آمین!

چوتھی نشست

خود شناسی خدا شناسی کی تمہید ہے

۴۲؎ اور کڑے وقت صبر اور نماز کا سہارا پکڑو اور البتہ نماز دوبھر تو ہے مگر فرمانبرداروں پر نہیں۔
(سورۂ بقرہ - آیت ۴۵)

ہمیشہ سے خود انسان ہی اپنے لیے معنویت کا دروازہ ہے۔ یہ ایک ایسا دروازہ ہے جس سے انسان معنویت کی دنیا میں وارد ہوتا ہے یا کم از کم معنویت کی خبر حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ قدیم و جدید سب علماء علم النفس نے کہا ہے۔
امیر المومنین مولی الموحدین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:
۴۳؎ جو شخص اپنی ہستی کو پہچان لیتا ہے وہ اپنے پروردگار کو پہچان لیتا ہے۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں دور تھا

قرآن مجید نے اصولی طور پر انسان کے لیے دنیا کی تمام چیزوں کے مقابلے

میں ایک الگ باب کھولا ہے، کیونکہ انسان ایک الگ اور مستقل خاصیت رکھتا ہے۔

قرآن مجید کی یہ تعبیر ملاحظہ کریں کہ وہ کہتا ہے:

۴۴۔ عنقریب ہم اپنی نشانیاں اطراف میں اور خود ان کے نفسوں میں بھی دکھا دیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا۔ وہی یقیناً حق ہے۔ کیا تمہارا پروردگار اس کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر قابو رکھتا ہے۔

(سورہ حٰم سجدہ۔ آیت ۵۳)

ہم اپنی نشانیاں آفاق میں یعنی طبعی دنیا میں اور خود لوگوں کے نفوس میں دکھاتے ہیں۔ اس بات کو قرآن مجید نے ایک الگ اسلوب اور ایک الگ انداز سے بیان کیا ہے۔ یہی آیت اس امر کا موجب بنی کہ ہمارے ادبیات میں "آفاق" اور "انفس" کی مخصوص اصطلاحیں وجود میں آئیں، جن کے تحت "آفاقی مسائل" اور "انفسی مسائل" کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اب ممکن ہے کہ آپ یہ پوچھیں کہ انسان اور انسان کے نفس میں وہ کونسی چیز یا چیزیں موجود ہیں جن کی توجیہہ مادی قوانین میں نہیں ہو سکتی؟ یہ ایک طویل داستان ہے اور بالفعل ہم اسے بیان نہیں کرنا چاہتے۔

جو چیزیں مادی قوانین سے مطابقت نہیں رکھتیں ان میں سے ایک انسانی قدروں کا مسئلہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ انسان کی انسانیت کا مسئلہ ہے اور یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آپ جس موجود کو بھی لیں، آپ کو پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک صفت کے طور پر خود

اپنے آپ سے الگ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہم چیتے کے لیے چیتاپن کی صفت کا، کتے کے لیے کتاپن کی صفت کا اور گھوڑے کے لیے گھوڑاپن کی صفت کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں کوئی ایسا چیتا نہیں مل سکتا جس میں چیتاپن نہ ہو، کوئی ایسا کتا نہیں مل سکتا جس میں کتاپن نہ ہو اور کوئی ایسا گھوڑا نہیں مل سکتا جس میں گھوڑاپن نہ ہو لیکن یہ انسان ہے کہ ممکن ہے وہ ایک انسان ہو جس میں انسانیت نہ ہو۔ کیونکہ جن چیزوں کو ہم انسان کی انسانیت سمجھتے ہیں اور جو چیزیں انسان کو انسانیت عطا کرتی ہیں نہ کہ وہ چیزیں جو کسی شخص کا معیار ہیں بلکہ وہ چیزیں جو کسی شخص کا معیار ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان چیزوں کا ایک حصہ ہے جو انسان کے مادی ڈھانچے سے تیار نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ غیر مادی ہیں اور نہ تو محسوس ہوتی ہیں اور نہ چھوئی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ وہ انسانی ہیں، بشری ہیں اور اس دنیا سے تعلق رکھتی ہیں مگر اس کے باوجود نہ تو انسان انہیں محسوس کر سکتا ہے اور نہ ہی چھو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مادیات کے زمرے میں نہیں بلکہ معنویات کے زمرے میں آتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ چیزیں جو انسان کی انسانیت کا معیار ہیں انسان کو شخصیت اور فضیلت بخشتی ہیں اور انسان کی انسانی فضیلت کا پیمانہ ہیں۔ وہ فطرت کے ہاتھوں یا کسی کے ہاتھوں بھی نہیں بنتیں۔ وہ صرف اور صرف خود انسان کے ہاتھوں بنتی ہیں۔ المختصر انسان خود معنویت کا دروازہ ہے اور خود اپنے وجود کے دروازے سے عالم معنی تک پہنچا ہے۔

آٹھویں امام حضرت علی رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے:

۴۵ جو کچھ وہاں ہے اسے پہچانا نہیں جا سکتا ــــ مگر

اس کے ذریعے سے جو کچھ یہاں ہے، جب کہ یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے .....

وہ چیزیں جنہیں انسانی قدریں کہا جاتا ہے اور جو انسان کی معنویت اور انسانیت کا معیار ہیں۔ وہ بہت سی ہیں لیکن ان تمام قدروں کو ایک قدر میں سمویا جا سکتا ہے اور وہ قدر "درد رکھنا" اور "صاحبِ درد" ہونا ہے۔

ہر وہ مکتب جس نے دنیا میں انسانی قدروں کے بارے میں بحث کی ہے، اس نے اس حقیقت کی جانب توجہ دی اور انسان میں ایک درد کا تعین کیا ہے جو تمام انسانی دردوں یا ہر جاندار حیوان کے دردوں سے ماورا ہے۔ وہ درد کیا ہے؟ انسان کا وہ انسانی درد کیا ہے؟ جیسے ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بعض لوگوں نے فقط اس دنیا میں انسان کی غریب الوطنی اور اس دنیا کے ساتھ اس کے عدم تجانس اور بیگانگی کے درد پر تکیہ کیا ہے، اس نظریے کے مطابق انسان ایک ایسا حقیقی موجود ہے جو کسی اور دنیا سے ایک خاص فرض ادا کرنے آیا اور اپنے اصل سے جدا اور دور ہو گیا ہے۔ اپنی اصل سے اس دوری نے اس کے اندر ذوق پیدا کیا ہے، عشق پیدا کیا ہے، نالہ پیدا کیا ہے اور غریب الوطنی کا احساس پیدا کیا ہے۔ پھر اس غریب الوطنی کے احساس نے اس کے باطن میں اصل کی جانب واپسی اور اپنے وطن ــــــ حق ــــــ یعنی خدا کی جانب واپسی کی خواہش پیدا کی ہے۔ گویا وہ ایک بہشت سے نکالا گیا اور زمین پر آیا ہے، اس لیے چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر اس بہشت کی جانب لوٹ جائے، جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا

آیا ہے مقصد اور فضول نہیں بلکہ ایک کارِ خاص کیلئے بھیجا گیا ہے۔ بہر حال اپنی اصل سے اس جدائی نے اسے ہمیشہ بے چین اور بے قرار رکھا ہے۔

اس مکتبِ فکر کے مطابق انسان کا درد فقط خدا سے دوری کا درد، حق سے دوری کا درد اور حق کے قرب اور رب العالمین کی قربت کی جانب لوٹ جانے کی خواہش ہے۔ چنانچہ ہر انسان خواہ وہ کسی مقام، کسی کمال یا کسی نقطے تک بھی پہنچ جائے ـــــ پھر بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے معشوق تک نہیں پہنچا۔

کہا جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ اس چیز کا طالب ہوتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی اور جب تک وہ چیز اسے میسر نہ ہو اسے اس کی خواہش ہوتی ہے، لیکن جب وہ چیز اسے مل جائے تو اسے اس کی خواہش نہ رہے اور وہ اسے رد کر دے۔

ایک شخص کا کہنا ہے کہ میں ایک غیر ملکی عجائب گھر میں نوادر دیکھنے میں مشغول تھا۔ وہاں میں نے ایک بہت ہی خوبصورت عورت کا مجسمہ دیکھا جو ایک تخت پر لیٹی ہوئی تھی۔ نیز میں نے اسی تخت پر ایک بے حد خوبصورت جوان مرد کا ایک مجسمہ بھی دیکھا لیکن اس حالت میں کہ اس کا ایک پاؤں تخت پر اور دوسرا پاؤں زمین پر تھا۔ اس نے پہلے مجسمے کی طرف سے اپنا منہ بھی پھیر رکھا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں سے بھاگ رہا ہو۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر میں یہ نہ سمجھ سکا کہ سنگ تراش نے اس جوان مرد اور جوان عورت کے مجسمے حالت ملاقات کی بجائے حالت فرار میں کیوں تراشے ہیں؟ وہ اشخاص جو اس بارے میں کچھ جانتے تھے، میں نے ان سے وضاحت چاہی کہ

یہ مجسمے تراشنے میں مجسمہ ساز کا کیا مقصد تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان مجسموں کے ذریعے افلاطون کے مشہور نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان جس چیز کو چاہتا ہے شروع میں بڑے زبردست جذبے، شدید عشق اور بے حد اشتیاق کے ساتھ اسکی جانب جاتا ہے لیکن جب وہ اسے پا لیتا ہے تو اسکا عشق وہیں دب جاتا ہے، کیونکہ وصال عشق کا مدفن ہے۔ وصال کے بعد جب انسان کا دل بھر جاتا ہے تو یہیں سے نفرت و فرار کا آغاز ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک غیر فطری بات ہے اور جن لوگوں نے اس مسئلے پر گہرا غور و فکر کیا ہے انہوں نے اسے حل کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: مسئلہ یہ ہے کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو کسی محدود اور فانی شے کا عاشق نہیں ہو سکتا، وہ کسی ایسی چیز کا عاشق نہیں ہو سکتا جو زمان و مکان میں محدود ہو۔ وہ کمال مطلق کا عاشق ہے اور اسکے علاوہ کسی دوسری چیز کا عاشق نہیں —— یعنی انسان ذاتِ حق کا عاشق ہے، خدا کا عاشق ہے۔ جو شخص خدا کا منکر ہے وہ بھی خدا کا عاشق ہے۔ حتیٰ کہ وہ منکر جو خدا کو ناسزا کہتے ہیں، اس کے بارے میں غلط گوئی کرتے ہیں اور معاد کے قائل نہیں ہیں، وہ نہیں جانتے کہ وہ اپنی فطرت کی گہرائی میں کمال مطلق کے عاشق ہیں لیکن وہ اس کمال مطلق اور معشوق حقیقی کو گم کر بیٹھے ہیں۔

محی الدین عربی کا قول ہے: "مَا اَحَبَّ اَحَدٌ غَیْرَ خَالِقِہٖ"

کسی انسان نے اپنے خدا کے علاوہ کسی کو دوست نہیں رکھا اور دنیا میں اب تک ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جس نے خدا کے علاوہ کسی اور کو دوست رکھا ہو۔ لیکن خدائے تعالیٰ ان ظاہری ناموں کے پیچھے چھپ گیا اور مجنوں سمجھتا ہے کہ وہ لیلیٰ کا عاشق ہے، کیونکہ وہ اپنی فطرت اور وجدان

کی گہرائی سے بے خبر ہے۔

پیغمبر اس لیے نہیں آئے کہ وہ بندوں کو خدا کے نام سے آشنا کریں اور اس کی عبادت کرنا سکھائیں۔ کیونکہ یہ چیز تو ہر انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے، بلکہ اس لیے آئے ہیں کہ ٹیڑھے راستوں کو سیدھے راستے سے الگ کر دکھائیں، اس لیے آپ کو مجنوں سے کہنا چاہیے کہ جناب! آپ نے "کمال مطلق" کی پہچان میں غلطی کھائی ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ لیلیٰ "کمال مطلق" ہے۔ اسی طرح آپ ایک وقت خیال کرتے ہیں کہ مقام و عہدہ کمال مطلق ہے اور ایک وقت آپ خیال کرتے ہیں کہ زندگی کمال مطلق ہے، گویا آپ کمال مطلق کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتے۔ درحقیقت آپ غلطی کھاتے ہیں اور نوع بشر کے رہنما اس لیے آئے ہیں کہ وہ انہیں غلط فہمیوں سے نجات دلائیں۔

انسان کا درد اور انسان کا شوق وہ خدائی درد ہے کہ اگر وہ اسے پہچان جائے، یعنی اگر غلط فہمیوں کے پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں اور اس کا معشوق اسے مل جائے تو وہ ویسی ہی عاشقانہ عبادتیں کرنے لگے ـــــ جیسی عبادتوں کی مثال ہم امام علی علیہ السلام میں دیکھتے ہیں کیونکہ قرآن مجید کہتا ہے:

> جان لو کہ فقط اور فقط ایک چیز سے دلوں کو سکون حاصل ہو سکتا ہے ـــــ انسان اضطراب و بے چینی سے نجات حاصل کر سکتا ہے اور وہ ہے ـــــ اپنے خدا کے ساتھ راز و نیاز کرنا، اس کا ذکر کرنا۔

ہاں قرآن مجید کہتا ہے اگر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ان مفروضوں نظریوں یا مثلاً دولت کے ساتھ کامیاب ہو سکتے ہیں اور تمام لوگوں کا بھلا ہو سکتا ہے ـــــ یوں ہو سکتا ہے' ووں ہو سکتا ہے۔ یعنی انسان مال کی بدولت بے قراری' بے چینی اور مایوسی سے نجات پا کر آسائش حاصل کر سکتا ہے۔ تو یہ ان کی بھول ہے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ:

ان لوگوں کے پیچھے نہیں چلنا چاہیے تاہم ان لوگوں کی بات پر غور کرنا چاہیے لیکن اگر آپ یہ خیال کریں کہ یہی لوگ ہیں جو انسان کو آسائش اور اطمینان دلا سکتے ہیں اور انسان یہ چیزیں حاصل کر کے محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنا مطلوبہ کمال پا لیا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ صرف خدا کو یاد کرنے سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ کئی ایک مکاتب فکر ایسے ہیں جو فقط اسی بات پر تکیہ کرتے ہیں۔ کچھ دوسرے مکاتب ہیں جو مخلوق خدا کا درد و احساس رکھنے پر زور دیتے ہیں نہ اس بات پر کہ انسانوں کا درد رکھا جائے خدا کی خاطر حتیٰ کہ بعض لوگ کہتے ہیں جناب خدا کی خاطر انسانوں کا درد رکھنے کے کیا معنی ہیں؟

اگر انسان خدا کی طرف توجہ نہ کرے تو خلق خدا کیلئے اسکا جذبہ ہمدردی بھی بے نتیجہ رہے گا کیونکہ "انسانیت" کی حقیقت خدا تک پہنچنے کا درد ہے اور خدا تک پہنچنے کی فکر سے انسانوں کا درد یعنی انسانوں کیلئے جذبۂ ہمدردی پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ کامل انسان کی سیر کا تعین کرتے ہوئے عرفا نے بڑی عمدہ بات کہی

ہے، وہ کہتے ہیں:

کامل انسان کی سیر چار سفروں میں پوری ہوتی ہے:

(۱) انسان کا سفر اپنے آپ سے خدا کی جانب ـــــ اور جب وہ یہاں پہنچتا ہے تو:

(۲) انسان کا سفر قرب خدا کے ساتھ خدا میں (یعنی خدا کی پہچان کیلئے)۔

(۳) انسان کا سفر قرب خدا کے ساتھ نہ تنہا خلق خدا کی جانب۔

(۴) انسان کا سفر قرب خدا کے ساتھ خلق خدا کے درمیان (خلقِ خدا کی نجات کی خاطر)۔

اس ضمن میں اس سے بہتر بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن یہ باتیں اس وقت تک غلط ہیں جب تک انسان خدا سے جدا ہے کیونکہ وہ اس کی جانب سفر نہیں کر سکتا۔ تاہم جب وہ وہاں (خدا کے نزدیک) پہنچتا ہے، خدا کو پہچان لیتا ہے۔ جب اسے قرب خدا حاصل ہوتا ہے تو وہ خدا کو اپنے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ خلق خدا کی جانب لوٹتا ہے اور اسکی نگاہوں میں خدا کا جلوہ ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ایسا انسان ربانی انسان بن جاتا ہے اور وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی خدا سے غافل نہیں رہتا۔ جب ایسا انسان خلق خدا کے درمیان تحریک چلاتا ہے تو یہ تحریک خلق خدا کی نجات کیلئے، خلق خدا کو بیدار کرنے کیلئے اور خلق خدا کو خدا کے نزدیک لانے کیلئے ہوتی ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ انسان کا سفر خلق سے خدا کی طرف ہے تو وہ یہیں کا یہیں رہ جاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ انسان خود خدا کی جانب حرکت کیے بغیر مادی مکاتب کی طرح انسانوں کی نجات کی خاطر انسانوں کی طرف جانا چاہتا

ہے تو یہ بھی ایک غلط بات ہے اور وہ کچھ نہیں کر پاتا۔ کیونکہ انسان کو وہ لوگ نجات دلا سکتے ہیں جنہوں نے پہلے خود نجات حاصل کر لی ہو۔

انسان کو کس چیز سے نجات چاہیے؟

انسان کی نجات کے کیا معنی ہیں؟ کس چیز سے انسانوں کی نجات؟ کیا یہ انسانوں کی دوسرے انسانوں کی اسیری سے نجات ہے کہ جس کے معنی انسان کی انسان سے آزادی کے ہیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ یہ انسان کی اپنے آپ سے، اپنے نفس امارہ سے اور اپنے محدود وجود سے نجات ہے۔ جب تک انسان اپنے محدود وجود سے نجات حاصل نہ کرے وہ فطرت کی اسیری سے ہرگز رہا نہیں ہوتا اور دوسرے انسانوں کی اسیری سے بھی نجات نہیں پاتا۔

ابھی ہم پہلی منزل پر ہیں اور ہمیں چاہیے کہ اپنے سیر و سلوک کو جاری رکھیں۔ یہ رات ماہ رمضان کی اکیسویں اور آخری دہائی کی پہلی رات ہے۔ جب ماہِ رمضان کی آخری دہائی آتی تھی تو رسول اکرمؐ حکم دیتے تھے کہ آپ کا بستر مکمل طور پر باندھ دیا جائے اور پھر ماہِ شوال میں کھولا جائے۔ یعنی آنحضرتؐ ماہِ رمضان کی آخری دہائی میں کسی رات نہیں سوتے تھے اس لیے آخری دہائی کی یہ رات ـــــ عبادت، خلوت اور مناجات کی رات ہے۔

اب میں جو بات کہہ رہا ہوں، یہ میرے گذشتہ راتوں کے بیان کے ضمن میں ہے۔ یعنی بعض اوقات کچھ حد سے بڑھی ہوئی قدریں آتی ہیں جو دوسری قدروں کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

چنانچہ گزشتہ زمانے میں اسلامی معاشرے نے عبادت کی قدر کی طرف

اتنا میلان پیدا کر لیا کہ وہ دوسری قدروں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب ایک اور افراطی قدر نموداری کی حالت میں ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اسلام کے اجتماعی میلانات کی جانب توجہ دیں اور اس کے خدائی میلانات کو فراموش کر دیں۔ گویا کہ وہ لوگ ایک اور انحراف اور غلطی کے مرتکب ہونا چاہتے ہیں ان کا یہ فعل اس عرب کی مانند ہے جو ایک گدھے پر سوار ہونا چاہتا تھا۔ وہ بڑے زور شور سے آیا اور گدھے کے اوپر سے اچھل کر دوسری طرف زمین پر جا گرا اور کہنے لگا:

"پہلے کی طرح ہو گیا"۔۔۔ یعنی میں زمین کا زمین ہی پر رہ گیا۔

پس اگر یہ مان لیا جائے کہ ہم اسلام کا معتدل راستہ چھوڑ دیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم "معاشرے سے گریز کر کے عبادت کی طرف مائل ہوں" یا "خدا سے گریز کر کے معاشرے کی طرف مائل ہوں"۔ کیونکہ اسلام کی منطق کے مطابق ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ قرآن کو دیکھیں اور اس کے نکات کی جانب توجہ دیں ـــــ یہ شب بیداری اور عبادت کی شب ہے۔

آپ قرآن مجید کا ارشاد ملاحظہ کیجیے:

۴۷۔ محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحمدل ہیں، تو ان کو دیکھے گا کہ خدا کے سامنے جھکے سجدے میں پڑے ہیں، خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں، کثرت سجود سے ان کی پیشانیوں پر گھٹے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف توریت

ہیں اور انجیل میں مذکور ہیں۔ وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے
پہلے سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، وہ موٹی ہوئی، اپنی
جڑ پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور اپنی تازگی سے کسانوں کو
خوش کرنے لگی ــــــ تاکہ ان کی خوشی پر کافروں کا جی جلائے
جو لوگ ایمان لائے اور ان میں سے جنہوں نے اچھے کام کیے
خدا نے ان سے بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

(سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

اس آیت کی تفسیر میں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس میں فقط اصحاب ہی مقصود ہیں یا ان کے ساتھ خود رسول اکرمؐ بھی مراد ہیں؟ یہ ایک ایسی بحث ہے جس کا ہمارے کسی دعوی پر کوئی غلط اثر نہیں پڑتا۔ ہاں تو رسول اکرمؐ کے صحابہ اور آپ سے تربیت یافتہ اشخاص کیسے ہیں؟ قرآن مجید اس بات کو بیان کرتا اور تشریح فرماتا ہے کہ وہ حق اور حقیقت کے دشمنوں کے مقابلے میں ایک سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار کی مانند ہیں جو اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ یہاں قرآن "کفار" کا لفظ استعمال کرتا ہے یعنی وہ شخص جو حقیقت کے چہرے کو چھپانا چاہتا ہے۔ پس ہمیں صریح حقیقت کے دشمنوں کے مقابلے میں مضبوط اور محکم ہونا چاہیے۔

۴۸۔ قرآن کہتا ہے:

خدا تو ان لوگوں سے الفت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس
طرح پرا باندھ کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار
ہیں۔ (سورۂ صف۔ آیت ۴)

لیکن معاشرے میں اور ان لوگوں کے درمیان جو اہل ایمان و حقیقت ہیں ان کی کیفیت کیا ہے؟ یہاں انسان کو محبت، مہربانی، یگانگت اور وحدت کا پیکر ہونا چاہیے۔ یہ ہے اسلامی معاشرے کی اجتماعی خصلت اور یہ وہی خصلت ہے جسے ہم نے صدیوں فراموش کیے رکھا ہے۔

اس کے بعد قرآن یہ کہتا ہے:

تو ان کو دیکھے گا کہ خدا کے سامنے جھکے سجدے میں پڑے ہیں، خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں، کثرت سجود سے ان کی پیشانیوں پر گھٹے پڑے ہوئے ہیں۔

(سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

پھر فوراً اس خدائی قدر کی جانب جاتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو معاشرے کی جانب میلان کے نقطۂ نگاہ سے بلند مقام پر ہیں اور پھر اپنے خدا سے ترقی اور فراخی طلب کرتے ہیں۔ اب جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر قناعت نہیں کرتے اور دن بدن آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے خدا کی رضا کے طالب ہیں اور یہ عبادت کی بلند ترین قسم ہے۔ وہ اپنی تمام عبادتوں کے صلے میں خدا کی رضا کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتے۔

۲۹۔ کثرت سجود سے ان کی پیشانیوں پر گھٹے پڑے ہوتے ہیں، ان کے یہی اوصاف توریت میں اور انجیل میں مذکور ہیں۔ وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے پہلے سوئی نکالی۔

(سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید اسلامی معاشرے کے بارے میں ایک مثل

کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ پھلنے پھولنے والا معاشرہ ہے۔ یہ ایک ایسی کھیتی کا علم رکھتا ہے جو شروع ہی سے بڑھنے لگتی ہے اور یوں بڑھتی ہے کہ سب کسانوں کو حیران کر دیتی ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ ان باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح لایا گیا ہے، جبکہ قرآن اس ملت کے خدائی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

۵۰ یہ لوگ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد و ثنا کرنے والے، خدا کے لیے سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کام کا حکم دینے والے، برے کام سے روکنے والے اور خدا کی حدوں کی نگہبانی کرنے والے ہیں اور ان مومنین کو خوشخبری دے دو۔

(سورۂ توبہ۔ آیت ۱۱۲)

قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ توبہ کرنے والے، استغفار کرنیوالے، عبادت کرنے والے اور روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے اور سجود کرنے والے ہیں ـــــ اس کے فوراً بعد فرماتا ہے :

وہی جو اپنے معاشرے کی اصلاح کرنے والے ہیں اور اپنے معاشرے میں اچھائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ ایک اور جگہ قرآن یہ کہتا ہے :

۵۱ وہ صبر کرنے والے[1] ثابت قدم رہنے والے، سچ بولنے

---

[1] قرآن میں لفظ صبر ہمیشہ ثابت قدمی اور بالخصوص میدان جنگ میں ثابت قدمی کے معنوں میں آتا ہے۔

والے، خوش کردار، خیرات کرنے والے اور علی الصبح استغفار
کرنے والے ہیں۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۷)

اس آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: یعنی وہ اپنی بھول چوک، غلط فہمی اور گناہ کی بخشش کے لیے منہ اندھیرے اپنے خالق کے حضور گڑگڑاتے ہیں۔
یہ میلانات اسلام میں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک سے بے توجہی کرتا ہے، گویا وہ دوسرے سے بھی بے توجہی کرتا ہے۔

حضرت حجت عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے اصحاب کے اوصاف میں ایک تعبیر ہے جو میں نے فقط ایک حدیث میں نہیں ..... بلکہ متعدد احادیث میں دیکھی ہے اور وہ یہ ہے:

کاش وہ رات کے وقت راہب اور دن کو شیر ہوتے ہیں۔ اگر
آپ رات کو ان سے ملنے جائیں تو گویا آپ ایک راہب سے
ملنے گئے اور اگر آپ دن میں ان سے ملنے جائیں تو وہ شیر
معلوم ہوں گے۔ (سفینۃ البحار۔ مادہ صحب)

اب آپ رسول اکرمؐ کے اصحاب کو دیکھیں کہ وہ کس وضع اور کس حالت میں ہیں:

یہ مشہور حدیث اصول کافی میں ہے جسے شیعہ وسنی ——— دونوں ہی نے نقل کیا ہے اور مولوی معنوی نے بھی اس کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ یعنی ایک دن رسول اکرمؐ اصحاب صفہ کے پاس گئے اور اکثر اصحاب صفہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ اس دن آپ وہاں طلوع آفتاب سے پہلے پہنچے جبکہ اندھیرا چھٹ رہا اور اجالا پھیل رہا تھا۔ درین اثنا آنحضرتؐ کی نگاہ ایک

ایک جوان پر پڑی جس کی حالت کچھ غیر معمولی سی تھی اور وہ لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں دھنس گئی ہیں، رنگ زرد ہو گیا ہے اور وہ ایک عام شخص نہیں بلکہ غیر معمولی وضع رکھتا ہے۔ تب آپ نے فرمایا:

۵۳۔ یعنی آنحضرتؐ نے پوچھا: تم نے صبح کیسے کی؟ اس نے جواب دیا: میں نے اس حالت میں صبح کی ہے کہ اہل یقین میں سے ہوں۔

یعنی جو بات آپ نے اپنی زبان کے ذریعے سے ہمارے کانوں میں ڈالی ہے میں اسے اپنی بصیرت کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔

رسول اکرمؐ نے اس جوان سے اس بارے میں مزید گفتگو کرنا ضروری سمجھا اور فرمایا:

۵۴۔ یعنی ہر چیز کی علامت ہوتی ہے اور تم جو اہل یقین ہونے کا دعویٰ کر رہے ہو تمہارے یقین کی علامت کیا ہے؟ اس نے عرض کیا:

۵۵۔ یا رسول اللہؐ! میرے یقین کی علامت یہ ہے کہ وہ دن کو مجھے پیاسا رکھتا ہے اور رات کو جگائے رکھتا ہے۔

(اصول کافی جلد ۲۔ باب حقیقت ایمان و یقین)

یعنی میرے یقین کی علامت دن کو روزہ رکھنا اور رات کو عبادت کے لیے جاگتے رہنا ہے۔ میرا یقین مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں سر بستر پر رکھوں اور ایک دن بھی بغیر روزے کے رہوں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ چیزیں یقین کی کافی علامت ہیں، اس سے آگے بھی کچھ بتاؤ۔ میں تمہارے اندر اس سے بڑھ کر بھی کوئی علامت چاہتا

ہوں۔ اس نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! اس وقت جب کہ میں اس دنیا میں ہوں تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ میں اس دنیا کو دیکھ رہا ہوں اور وہاں کی آوازیں سن رہا ہوں۔ چونکہ اس وقت جنت اور جہنم مخلوق اور موجود ہیں ــــ میں اس وقت اہل جنت اور جہنم کی آوازیں سن رہا ہوں۔ یارسول اللہؐ! اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کے اصحاب میں سے ایک ایک کے بارے میں بتا دوں کہ ان میں سے کون کون جنتی اور کون کون جہنمی ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں۔ خاموشی اختیار کرو۔

مولوی معنوی اپنی مثنوی میں کہتے ہیں:

گفت پیغمبر صباحی زید را
کیف اصبحت ای رفیق باصفا
گفت عبداً موقنا باز اوش گفت
کو نشان از باغ ایمان گر شگفت
گفت تشنہ بودہ ام من روزہا
شب نخفتم من ز عشق و سوزہا
کہ بگویم یا فرو بندم نفس
لب گزیدش مصطفیٰ یعنی کہ بس

ایک صبح کو پیغمبر اکرمؐ نے زید سے فرمایا کہ اے نیک دل ساتھی تو نے آج دن کا آغاز کیسے کیا؟

اس نے کہا کہ میری صبح ایک بایقین شخص کی سی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تیرے باغ ایمان ویقین کی تازگی کی علامت کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں دن کو

روزے میں پیاسا ہوتا ہوں اور رات کو محبت الٰہی میں جاگتا ہوں۔ اب فرمایئے کہ اپنا مشاہدہ بیان کردوں یا چپ رہوں ؟

حضور اکرم ؐ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یعنی فرمایا کہ بس ــــــ خاموش! (مثنوی مولانا روم صفحہ ۹۶)

پھر رسول اکرم ؐ نے فرمایا: اے جوان! تمہاری خواہش کیا ہے ؟ تم کیا آرزو رکھتے ہو ؟

اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ ؐ! شہادت! خدا کی راہ میں شہادت! یہ تھی اس کی عبادت اور یہ تھی اس کی آرزو ــــــ وہ تھیں اس کی راتیں اور یہ تھے اس کے دن اور ــــــ اس کی آرزو! ہاں ــــــ اسلام پر ایمان لانے والا ایسا ہوتا ہے اور اسلام کا ــــــ انسان ــــــ ایسا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ شخص جو دونوں درد رکھتا ہے، لیکن یہ دوسرا درد وہ اس پہلے درد سے لیتا ہے۔ یعنی وہ پہلا اس کا خدائی درد ہے جس نے اس میں یہ دوسرا درد پیدا کیا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

۵۶ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو نماز سے مدد چاہو اور صبر سے مدد حاصل کرو۔ بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۳)

وہ کونسی مدد ہے جو ہم روزے سے لے سکتے ہیں ؟ وہ کونسی مدد ہے جو ہم خداپرستی سے لے سکتے ہیں ؟ وہ کونسی مدد ہے جو ہم خدا کی عبادت سے لے سکتے ہیں ؟

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ معاشرے میں ایک حقیقی اور قوی مسلمان ہوں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایک طاقتور مجاہد ہوں تو آپ کو ایک خالص اور مخلص نمازی بننا چاہیے۔

دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ نماز کی تحقیر کرتے اور کہتے ہیں:
نماز پڑھنے کا کیا فائدہ ہے اور عبادت کیوں کی جائے؟ یہ تو بوڑھی عورتوں کا کام ہے اور انسان کو تو اجتماعیت پسند ہونا چاہیے۔ ہاں ــــــ یہ روشن خیالی تو ہے لیکن یہ عمر بن خطاب جیسی روشن خیالی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ انھوں نے اذان میں سے ــــ حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ کا جملہ نکال دیا تھا، کیوں؟ ایک قسم کی روشن خیالی ــــ لیکن ایک بڑی غلطی کے باعث! ان کے عہد حکومت میں اسلامی فتوحات اور اسلامی جہاد کا بڑا جوش تھا مسلمانوں کے لشکر پر لشکر دشمن سے لڑنے کے لیے جاتے تھے۔ وہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود بھی اپنے سے طاقتور دشمن کو شکست دیتے تھے۔ اس وقت کے مسلمان جو دو عظیم سلطنتوں سے لڑ رہے تھے، ان کی تعداد پچاس یا ساٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ جب کہ یہ سلطنتیں کئی لاکھ سپاہیوں کو لے کر جنگ کے لیے آتی تھیں، لیکن مسلمان انہیں نیچا دکھا دیتے تھے۔ روم کئی لاکھ سپاہی لے کر ان سے لڑنے آیا ــــ ایران بھی کئی لاکھ سپاہی لے کر ان سے لڑنے آیا، جب کہ یہ ایک لاکھ سے بھی کم ہوتے ہوئے دونوں محاذوں پر لڑ رہے تھے اور دشمنوں کو شکست دے رہے تھے۔ بہت خوب! اس طرح جہاد نے اپنی قدر و قیمت ثابت کر دی اور بتا دیا کہ جب اسلام مجاہدوں کی تربیت کرتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

یہی وہ وقت تھا جب عمر بن خطاب نے کہا کہ مصلحت اس میں ہے کہ ہم "حی علی خیر العمل" کو اذان سے نکال دیں۔ اذان میں مؤذن بلند آواز سے کہتا ہے "اللہ اکبر، اللہ اکبر" پھر وہ شہادتین پڑھتا ہے ـــــ اس کے بعد کہتا ہے حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الصلوٰۃ یعنی نماز کی طرف آؤ، نماز کی طرف آؤ۔ وہ یہاں تک جو جملے ادا کرتا ہے ان میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر وہ کہتا ہے: حیّ علی الفلاح، حیّ علی الفلاح یعنی نجات کی طرف آؤ، نجات کی طرف آؤ ـــــ کیونکہ نماز ذریعۂ نجات ہے۔ عمر بن خطاب نے کہا کہ یہاں تک بھی ہمارے لیے کوئی خرابی کی بات نہیں ہے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ "حی علی خیر العمل" یعنی بہترین عمل کی طرف آؤ، کیونکہ نماز بہترین عمل ہے۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے تو یہ مجاہدین کے اعتماد نفس کو ٹھیس پہنچانے والی بات ہے۔ وہ سوچیں گے کہ اب ہم جا کر نماز پڑھیں یا جہاد کے لیے جائیں۔ چونکہ نماز بہترین عمل ہے، اس لیے کیوں نہ ہم میدان جنگ میں جانے کی بجائے مدینے ہی میں رہیں اور مسجد نبوی میں رسول اکرمؐ کے مقبرے کے قرب میں نماز پڑھیں کہ جو بہترین اعمال میں سے ہے۔ اگر کچھ دوسرے لوگ جنگ پر جاتے ہیں تو جائیں ـــــ ان کو زخم لگیں اور ان کی آنکھیں پھوڑی جائیں ـــــ ان کے ہاتھ کاٹے جائیں اور ان کے پیٹ پھاڑے جائیں ـــــ وہ جا کر دشمن کو قتل کریں اور ہوتے رہیں ـــــ ہم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے اپنے گھروں میں رہیں گے اور چار رکعت نماز پڑھیں گے ـــــ پھر بھی ان سے اچھے رہیں گے!

اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہونے کے خدشے کے پیشِ نظر عمر بن خطاب

نے کہا —— نہیں! ہمیں "حی علیٰ خیر العمل" کی بجائے "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہنا چاہیے۔ یعنی نماز نیند سے بہتر اور اچھی چیز ہے۔ چونکہ اذان میں کہا جانے والا "حی علیٰ خیر العمل" کا جملہ ایک مجاہد کے اعتماد نفس اور جوش جہاد کو کمزور کرتا ہے، لہٰذا ہم اس کی جگہ پر "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہیں گے۔

تاہم عمر بن خطاب نے یہ نہیں سوچا کہ یہ پچاس ساٹھ، ستر یا اسی ہزار سپاہی جن کی تعداد قطعاً ایک لاکھ تک نہیں پہنچتی ! وہ دشمن کی کئی لاکھ افراد پر مشتمل فوج کے خلاف وہ مختلف محاذوں پر کس طاقت سے لڑ رہے ہیں اور فتح پا رہے ہیں ؟ اس فتح کا کیا راز ہے ؟

کیا یہ فتح ہتھیاروں کے بل بوتے پر ہے ؟ کیا عربوں کے ہتھیار ایرانیوں اور رومیوں کے ہتھیاروں سے بہتر اور کارگر تھے ؟ قطعاً نہیں ! ایران اور روم اس زمانے کی دو ترقی یافتہ مملکتیں تھیں اور ان کے سپاہیوں کے پاس بہترین ہتھیار تھے۔ چنانچہ جو تلواریں ایران اور روم کے فوجیوں کے پاس تھیں، ان کے مقابلے میں عربوں کے ہتھیار ٹوٹے ہوئے لوہے کے مانند تھے۔ کیا عربوں کی نسل رومیوں اور ایرانیوں کی نسلوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ زور آور تھی ؟ ہرگز نہیں !

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ شاپور ذوالاکتاف نے ایران سے جا کر عربوں پر کیا آفت ڈھائی۔ کیا اس نے ہزاروں عربوں کو قیدی نہیں بنایا ؟ کیا اس نے مار مار کر ان کے کندھے سیاہ نہیں کیے ؟ کیا اس نے انہیں زنجیریں نہیں پہنائیں اور ان کے بازو زنجیروں میں نہیں جکڑے ؟ اس وقت عربوں کا زور

کہاں تھا؟ اس کے بعد بھی کیا ایرانیوں نے عربوں کو شکست نہیں دی؟ پھر عربوں نے کس بل بوتے پر جنگ لڑی اور ایران و روم کی فوجوں کو شکست دی؟ یہ فتح انہوں نے قوت ایمان کی بدولت حاصل کی ـــــ ایمان کی یہ قوت وہی قوت ہے جو انہوں نے "حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ" سے حاصل کی۔ یعنی یہ وہ طاقت ہے جو انھوں نے نماز سے حاصل کی اور یہ وہ طاقت ہے جو انہوں نے اپنے خدا سے راز و نیاز کر کے حاصل کی۔ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق جب انسان رات کو خدا کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے، راز و نیاز کرتا ہے اور اس کے حضور گڑگڑاتا ہے تو وہ اپنے خدا سے طاقت حاصل کرتا ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو اسے اعتماد نفس عطا کرتی ہے۔ یعنی یہ وہ اعتماد نفس ہے جو ایران کو شکست دیتا ہے اور یہی عرب کا وہ اعتماد نفس ہے جو روم کو شکست دیتا ہے۔ عرب نے یہ اعتماد نفس کہاں سے حاصل کیا؟ ہاں یہ اعتماد نفس اس نے ایمان سے حاصل کیا ہے۔ نماز کیا ہے؟ یہ اس ایمان کا تازہ کرنے اور زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے جو اس نے "اللہ اکبر" سے حاصل کیا ہے۔ وہ نماز میں کئی مرتبہ اللہ اکبر کہتا ہے۔ یعنی خدا بزرگ تر ہے ـــــ خدا بزرگ تر ہے کہ ہر چیز اس کے سامنے ہیچ ہے۔ پھر وہ خدا کی ظاہری عظمت اور جاہ و جلال کو دیکھتا ہے تو ایک بار پھر "اللہ اکبر" کہتا ہے جو ان سب بڑائیوں کا اقرار ہوتا ہے یعنی اس کے مقابل یہ سب چیزیں ہیچ ہیں۔ اس کے بعد جب کبھی وہ اپنے مقابلے پر کئی لاکھ سپاہیوں کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے:

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام قدرت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ خدا پر تکیہ رکھو ـــــ خدا پر بھروسہ کرو ـــــ خدا سے طاقت حاصل کرو ـــــ اور اسی سے مدد مانگو کہ وہی سب سے بڑا ہے۔

ایک مسلم مجاہد کی یہی نماز اسے طاقت عطا کرتی ہے۔ جبکہ عمر بن خطاب کہتے ہیں کہ "حیّ علیٰ خیر العمل" کا جملہ اس بات کا موجب بنتا ہے کہ ایک مسلمان مجاہد جہاد سے کنارہ کش ہو جائے، گھر میں آرام کرے اور نمازیں پڑھتا رہے! لیکن ان کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ جس شخص پر جہاد واجب ہو اور اس کا محاذ جنگ پر جانا لازم ہو ـــــ اس کا نماز کے لیے مسجد مدینہ میں رہ جانا حرام ہے۔ کیونکہ نماز کے قبول ہونے کی شرط جہاد ہے اور جہاد کے قبول ہونے کی شرط نماز ہے۔ جو شخص ایک مجاہد بننے کی شرائط پوری کرتا ہو اس پر واجب ہے کہ جہاد کرے، کیونکہ جہاد کے بغیر اس کی نماز باطل ہے اور نہ صرف یہ کہ ایسی نماز خیر العمل نہیں ـــــ بلکہ یہ شر العمل ہے۔ یہ وہ نماز نہیں جو اسلام نے سکھائی ہے" اس لیے اسے اسلام کی نماز یاد دلاؤ۔ وہ نماز جو جہاد سے فرار کا ذریعہ بنے اور انسان کو کھینچ کر مسجد کے گوشے میں لے جائے وہ اسلام کی نماز نہیں ہے" اسلام کی نماز تو خیر العمل ہے۔ یہ نہ کہو کہ آؤ اذان سے "حیّ علیٰ خیر العمل" کا جملہ نکال دیں، کیونکہ یہ جہاد کی بجائے نماز پڑھتے رہنے کا سبق دیتا ہے۔

اے وہ شخص کہ جو یہ باتیں کہہ رہا ہے تو اس غلط فہمی کو اپنے دماغ سے نکال دے اور جان لے کہ اسلام کی منطق اور اسلامی قدروں کے نظام میں سب سے بڑی قدر عبادت ہے، لیکن وہ صحیح اسلامی عبادت ہونی چاہیے۔

یعنی وہ ان شرائط کے ساتھ ہو جو قرآنی معیار کے مطابق ہوں۔ قرآن نے ہمیں معیار دیا اور فرمایا:

۵۷ بے شک نماز انسان کو بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۴۵)

گویا کہ صحیح نماز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے۔ اب اگر آپ دیکھیں کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ برے کام بھی انجام دے رہے ہیں تو جان لیں کہ آپ کی نماز ـــــــ نماز نہیں ہے، پس آپ اپنی نماز درست کیجئے۔ نماز آپ کو تمام دوسری انسانی قدروں تک پہنچاتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کی نماز واقعی نماز ہو۔

ہمیں تمام اصول اور تمام سبق امام علی علیہ السلام سے سیکھنے چاہئیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ ـــــ علیؑ ـــــ تمام اسلامی قدروں کا مجموعہ ہیں۔ نہج البلاغہ جو ان کا کلام ہے، وہ ایک ایسا کلام ہے کہ آپ جس مقام کو بھی دیکھیں وہاں ایک نئی منطق ملاحظہ کریں گے اور ایک مختلف شخصیت کو لیے ہوئے پائیں گے۔

امام علی علیہ السلام ہر جگہ ایک الگ شخصیت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جس میں تمام انسانی قدریں یکجا ہو گئی ہیں۔

ایک جگہ آپ دیکھتے ہیں کہ امام علیؑ کی منطق رزمیہ ہے اور آپ خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے ساری زندگی اسی میدان میں کام کیا ہے۔ اس میں ایک ایسی روح ہے جو جنگی ولولے سے پُر ہے۔ ایک اور مقام پر ہم ان کو ایک ایسا عارف پاتے ہیں کہ انہیں عاشقانہ راز و نیاز کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

آج اکیس رمضان کی رات ہے۔ لہٰذا میں نہج البلاغہ سے دو مختصر سی عبارتیں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ اگرچہ نہج البلاغہ میں اس موضوع پر اور بھی بہت سی باتیں موجود ہیں لیکن وقت کم ہے۔ تاہم میں یہ عبارتیں آپ کو اسلام کی منطق سے واقفیت دلانے کی خاطر نقل کر رہا ہوں:

صفین میں امیرالمومنینؑ کی معاویہ سے پہلی مرتبہ مٹھ بھیڑ ہو رہی ہے معاویہ کے لشکری اس طرف سے آتے ہیں اور آپ کے لشکری اس طرف سے جاتے ہیں۔ پھر وہ ایک مقام پر جو دریائے فرات کے کنارے واقع تھا____ ایک دوسرے کے نزدیک ہو جاتے ہیں۔ معاویہ اپنے ساتھیوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ پیش قدمی کریں اور اس سے پیشتر کہ علیؑ اور ان کے ساتھی وہاں پہنچیں پانی ان پہ بند کردیں۔ وہ لوگ گھاٹ پر قابض ہو کر خوش ہوتے اور کہتے ہیں کہ ایک وسیلے پر تو ہم نے قبضہ کر لیا ہے۔ جب علی اور ان کے لشکری آئیں گے اور انہیں پانی نہیں ملے گا تو وہ مجبوراً یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں گے، پھر اور بھی بہترین وسیلے ہمارے ہاتھ آئیں گے۔

تب امام علیؑ نے اپنے لشکریوں سے فرمایا کہ ہمیں پہلے ان لوگوں سے بات چیت کر لینی چاہیے۔ شاید اس طرح ہم اس مشکل کو حل کر سکتے ہیں، کیونکہ جو گرہ ہاتھوں سے کھل جائے اسے دانتوں سے نہیں کھولنا چاہیے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو تم کوئی ایسا کام نہ کرو کہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ اور خونریزی شروع ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے معاویہ کو پیغام بھیجا:

ابھی ہم اس مقام پہ پہنچے بھی نہیں اور تم نے پانی بند کر دیا!

معاویہ نے جنگی مشاورتی کونسل تشکیل دی اور اپنے سرداروں سے رائے

طلب کی کہ تم کیا مناسب سمجھتے ہو، ہم ان کے لیے پانی کھول دیں یا نہیں ؟ ان جنگی مشیروں میں سے بعض نے کہا پانی کھول دیجیے اور بعض نے کہا نہ کھولیے! چنانچہ عمرو عاص نے کہا کہ علیؑ کے لیے پانی کھول دیجیے ورنہ وہ بزور حاصل کرلیں گے اور آپ کی بے عزتی ہوگی۔ دوسروں نے کہا: نہیں ہم نہیں کھولیں گے اور وہ ہم سے لے بھی نہیں سکتے۔ چنانچہ پانی نہ کھولا گیا اور یوں امیرالمومنینؑ پر جنگ مسلط کردی گئی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس وقت علیؑ آکر کھڑے ہوئے اور اپنے لشکر کے سامنے ایک رزمیہ تقریر کرنے لگے۔ اس تقریر کا اثر ہزار ڈھولوں ہزار باجوں ہزار نغموں اور ہزار فوجی مارچوں سے زیادہ تھا۔

آپ نے بآواز بلند فرمایا:

اے لوگو! معاویہ نے گمراہوں کے ایک ٹولے کو اپنے گرد جمع کرلیا ہے اور انھوں نے تم پر پانی بند کردیا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ انھوں نے کیا کیا ہے؟ انھوں نے تم پر پانی بند کردیا ہے۔ لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے؟ تمہیں دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا چاہیے:

وہ تم سے جنگ کے لقمے طا[illegible] ہیں تو اب یا تو تم ذلت اور اپنے مقام کی پستی اور حقارت پر سر تسلیم خم کردو، یا اپنی تلواروں کی پیاس خون سے بجھا کر اپنی پیاس پانی سے بجھاؤ۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۵۱)

میرے ساتھیو! کیا تم پیاسے ہو؟ کیا تم میرے پاس اس لیے آئے ہو کہ تمہارے پاس پانی نہیں اور تم پیاسے ہو اور پانی چاہتے ہو؟ تمہیں چاہیے کہ

پہلے اپنی تلواریں ان پلیدوں کے خون سے سیراب کرو تاکہ پھر خود تم پانی سے سیراب ہو جاؤ۔

بعد میں آپ نے ایک جملہ فرمایا جس نے سب میں جوش و خروش پیدا کر دیا۔ امام علیؑ نے رزمیہ اور عسکری نگاہ سے موت اور زندگی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو! زندگی کے کیا معنی ہیں اور موت سے کیا مراد ہے؟ کیا زندگی کے معنی زمین پر چلنے کھانے پینے اور سونے کے ہیں؟ کیا موت سے مراد زمین میں دفن ہو جانا ہے؟ نہیں

۵۹ شکست کھا کر تمہارا ان سے بچ جانا جیتے جی موت ہے اور غالب آکر مرنا ـــــ جینے کے برابر ہے۔ (حوالہ سابق)

نہ یہ زندگی ہے اور نہ وہ موت ہے۔ زندگی یہ ہے کہ مر جاؤ اور فتح مند رہو اور مرنا یہ ہے کہ زندہ رہو لیکن دوسرے کے محکوم اور مغلوب ہو کر جیو۔

ملاحظہ فرمائیے یہ جملہ کس قدر رزمیہ ہے اور کتنا بلند ہے!

اس جملے نے سو فوجی مارچوں سے زیادہ اثر کیا۔ اب جتنی جلد ہو سکے امام علیؑ کے لشکر کی اگلی طرف پر نظر رکھنی چاہیے۔ دیکھیے کہ آپ کے لشکر نے معاویہ کے لشکر کو کئی کلومیٹر دور تک دوسری جانب دھکیل دیا اور گھاٹ ان کے قبضے میں آگیا ہے۔ انھوں نے بڑھ کر پانی روک لیا اور معاویہ پانی سے محروم ہو کر رہ گیا۔ تب اس نے ایک خط بھیجا جس میں پانی کھول دینے کی درخواست کی گئی تھی۔ علیؑ کے اصحاب نے کہا: یہ نا ممکن ہے کہ ہم ان کے لیے پانی کھول دیں کیونکہ اس کی پہل خود معاویہ نے کی اور کہا کہ ہم تمہیں پانی نہیں پینے دینگے۔

لیکن امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

ہم یہ کام ہرگز نہیں کریں گے، کیونکہ یہ ایک بزدلانہ فعل ہے۔ میں میدانِ جنگ میں دشمن کا سامنا کرتا ہوں لیکن ایسی بندشوں کے ذریعے ہرگز فتح نہیں چاہتا، ایسی غیر انسانی باتوں کے ذریعے فتح پانا میرے شایانِ شان نہیں ہے اور نہ ایک معزز اور محترم مسلمان کے شایانِ شان ہے۔

اسے کہتے ہیں مروت اور مردانگی، لیکن مروت —— شجاعت سے بلند تر ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی نے امام علی علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ شعر کہا ہے جو آپ کے بارے میں ان کے بہترین اشعار میں سے ہے:

در شجاعت شیر ربانیستی
در مروت خود کہ داند کیستی

شجاعت میں آپ خدا کے شیر ہیں اور مروت میں کوئی آپ کی تعریف نہیں کر سکتا کہ آپ کیا ہیں۔

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۹۷)

یہاں ہم امام علیؑ کو ایک مقام پر ایک مرتبے پر اور ایک حیثیت میں دیکھتے ہیں۔

آیئے ایک مرتبہ پھر امام علی علیہ السلام کی طرز زندگی پر نگاہ ڈالیں جب آپ لوگوں کے کاموں سے فارغ ہو جاتے —— تو پھر آپ ہوتے —— اور آپ کا خدا، آپ ہوتے —— اور آپ کی خلوت، آپ ہوتے —— اور آپ کے عاشقانہ اور عابدانہ راز و نیاز ——

خوش قسمتی سے یہ بھی نہج البلاغہ میں ہے کہ:

۱۶۰ اے خدا! تو اپنے دوستوں کے ساتھ تمام اُنس رکھنے
والوں سے زیادہ مانوس ہے اور جو تجھ پر بھروسہ رکھنے والے
ہیں ان کی حاجت روائی کے لیے ہمہ وقت پیش پیش ہے۔
(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۲۴)

یہاں ہم بالخصوص نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ وہ نہج البلاغہ کی جانب زیادہ توجہ دیں تاکہ وہ اس کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکیں۔

ہاں تو امیر المومنینؑ فرما رہے ہیں کہ اے خدا! تو اپنے اولیا کے لیے ہر انیس سے بڑا انیس ہے یعنی اے خدا! جو اُنس میں تیرے ساتھ رکھتا ہوں وہ اپنے کسی بھی انیس کے ساتھ نہیں رکھتا، میرا انیس تو ہے اور تیرے سوا میں کسی انیس (ساتھی) کے ساتھ نہیں ہوں ــــ اکیلا ہوں ــــ جب تیرے ساتھ ہوں تو محسوس کرتا ہوں کس کے ساتھ ہوں۔ اے خدا! جو لوگ تجھ پر بھروسہ رکھتے ہیں، تو ان کے لیے ہر دوسرے شخص سے بڑھ کر حاضر اور زیادہ بیدار ہے۔

۱۶۱ اے خدا تو ان کی باطنی کیفیتوں کو دیکھتا اور ان کے
چھپے ہوئے بھیدوں کو جانتا ہے۔ (حوالہ سابق)

یعنی اے خدا! تو اپنے دوستوں اور اپنے عاشقوں کے باطن اور ضمیر کا مشاہدہ کرتا ہے اور ان کے ضمیر اور باطن سے آگاہ ہے۔ تو ان کے عرفان اور بصیرت کی حدود سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ وہ بصیرت کے کس مقام پر ہیں۔ ان کے راز تیرے سامنے ظاہر ہیں اور ان کے دل تیری جانب پرواز کر رہے ہیں۔

دعائے کمیل کو پڑھنے کی کوشش کیجیے ـــــ یہ امام علیؑ کی دعا ہے اور اپنے مضامین کے لحاظ سے عرفان کی بلندیاں اس دعا میں نظر آتی ہیں

یعنی اگر آپ یہ دعا شروع سے آخر تک پڑھیں تو اس میں نہ دنیا پائیں گے نہ آخرت اور آخرت سے میری مراد بہشت اور جہنم ہے۔ اس دعا میں آپ کیا دیکھیں گے؟ وہ جو دنیا سے بلند اور آخرت سے بھی بلند ہے۔ یعنی خدا ہی خدا ـــــ بس ایک خالص عبادتگزار اور والہ وشیدا بندے کے خدائے تعالیٰ کی ذات اقدس کے ساتھ روابط ـــــ یعنی عبادت کی حقیقت آپ دیکھیں گے کہ امام علی علیہ السلام خدا سے کیسے راز و نیاز کر رہے ہیں ـــــ کیسے مناجات کر رہے ہیں!

امام زین العابدین علیہ السلام نے ماہ رمضان کی دعاہائے سحر میں ابوحمزہ ثمالی سے منسوب دعا میں اپنے خدا سے کیسے راز و نیاز اور مناجات کی ہے؟ یہ ہمارے مسلمان ہونے کا پہلا قدم ہے ـــــ یعنی پہلا قدم یہ ہے کہ ہم اپنے خدا کے نزدیک ہوں اور اس کے نزدیک ہونے سے ہم انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ان یکطرفہ میلانات کو ترک کر دیں کیونکہ اسلام ہمیشہ اپنی ملت کے یک طرفہ میلانات کی مصیبت سے دوچار رہا ہے۔ پھر اس لیے کہ ہم ایک اور شکل میں دوبارہ یکطرفہ میلانات کی اس بیماری میں مبتلا نہ ہو جائیں ـــــ ہمیں عبادت کی اہمیت کو ہرگز کم نہیں سمجھنا چاہیے۔

امام صادقؑ علیہ السلام نے اپنے آخری وقت میں جب یہ حکم دیا کہ میرے تمام رشتہ داروں کو جمع کرو تو وہ جمع ہو گئے۔ تب امام علیہ السلام نے اپنی

مبارک آنکھیں آخری مرتبہ کھولیں، ایک جملہ کہا اور پھر رحلت فرما گئے۔ وہ جملہ یہ تھا:

۶۲ یعنی جو شخص نماز کو بے قدر سمجھے اسے ہماری شفاعت نصیب نہ ہو گی!

امام علی علیہ السلام کی زندگی کا سب سے حیرت انگیز دور آپ کی عمر کی آخری ۴۵ ساعتیں ہیں۔ آپ کی زندگی کا پہلا دور آپ کی پیدائش سے رسول اکرمؐ کی بعثت تک ہے۔ دوسرا دور رسول اکرمؐ کی بعثت سے ہجرت تک ہے۔ تیسرا دور ہجرت سے رسول اکرمؐ کی وفات تک ہے اور اس کا رنگ الگ ہے۔ چوتھا دور رسول اکرمؐ کے وصال سے خود آپ کی خلافت تک ۲۵ سال کا عرصہ ایک اور صورت رکھتا ہے۔ پانچواں دور آپ کا ساڑھے چار سال کا عہد خلافت ہے۔ آپ کی زندگی کا چھٹا دور ضربت سے شہادت تک ہے جو دو دن رات سے کم ہے لیکن یہ امام علی علیہ السلام کی زندگی کا سب سے حیرت انگیز دور ہے۔

اس وقت جب امام علی علیہ السلام موت سے قریب ہو گئے، ان لمحات میں آپ کا کامل انسان ہونا زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ کامل انسان کے معیار میں سے ایک یہ ہے کہ وہ موت کا سامنا کیسے کرتا ہے۔ موت کا سامنا کرتے وقت آپ کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ جب آپ کے سر مبارک پر ضرب لگی تو آپ سے دو جملے سنے گئے:

پہلا یہ تھا کہ آپ نے فرمایا:

۶۳ قسم ہے رب کعبہ کی کہ میں کامیاب ہوا اور شہادت

حاصل کی جو میرے لیے کامیابی ہے۔

دوسرا جملہ یہ تھا:

اس آدمی کو پکڑ لو!

امام علی علیہ السلام کو لا کر بستر پر لٹایا گیا۔ ایک طبیب جس کا نام اسید بن عمرو تھا، اس نے عرب اور جندی شاپور میں بھی تعلیم پائی تھی اور کوفہ میں رہتا تھا۔ اس کو امیرالمومنینؑ کے زخم کا معائنہ کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اس نے اس وقت دستیاب وسائل کے ذریعے معائنہ کیا اور سمجھ گیا کہ زہر امامؑ کے خون میں سرایت کر گیا ہے۔ چنانچہ اس نے ناامیدی ظاہر کی اور عرض کیا: یا امیرالمومنینؑ! اگر آپ نے کوئی وصیت کرنی ہے تو کر لیں......

جب بی بی ام کلثوم اس ازلی اور ابدی لعین (ابن ملجم) کے پاس سے گزریں تو انھوں نے اسے سخت سست کہتے ہوئے فرمایا:

اے ملعون! میرے باپ نے تیرے ساتھ کوئی برا سلوک کیا تھا کہ تو نے یہ کام کیا؟

پھر کہنے لگیں:

مجھے امید ہے کہ میرے والد صحت یاب ہو جائیں گے اور تیرے لیے صرف روسیاہی رہ جائے گی۔

جب بی بی کلثوم نے یہ جملہ ادا کیا تو اس نے کہا:

آپ خاطر جمع رکھیں ــــ میں نے یہ تلوار ہزار درہم (یا دینار) میں خریدی ہے اور اتنے ہی اس کو زہر آلود کرانے کے لیے دیے ہیں

نے اس پر ایسا زہر لگوایا ہے کہ اگر یہ فقط آپ کے والد کے سر پر نہیں بلکہ بیک وقت تمام اہل کوفہ کے سروں پر لگتی تو وہ سب ہلاک ہو جاتے۔ پس آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ آپ کے والد زندہ نہیں رہیں گے۔

لیکن امام علیؑ کے بیشتر انسانی معجزے یہاں ظاہر ہوتے ہیں آپ کے لیے غذا لائی گئی مگر آپ غذا تو نہیں کھا سکتے تھے۔ تب آپ کے لیے دودھ لایا گیا جو آپ نے تھوڑا سا پی لیا۔

پھر اپنی وصیتوں کے ضمن میں فرمایا: اپنے اس قیدی (ابن ملجم) کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اے بنی عبدالمطلب! ایسا نہ ہو کہ تم میری وفات کے بعد لوگوں سے کہتے پھرو کہ امیرالمومنینؑ یوں ہوئے ——— فلاں شخص اس کا محرک تھا اور اس طرح مختلف آدمیوں پر الزام لگوانے لگو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ایسی باتیں کرو ——— میرا قاتل ایک ہی شخص ہے!

آپ نے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا:

میرے بیٹے حسن! اس (ابن ملجم) نے تمہارے باپ کو ایک سے زیادہ ضرب نہیں لگائی[1] اس نے دو ضربیں نہیں لگائیں۔ میرے بعد تمہیں خود اختیار ہے کہ اگر تم اسے آزاد کرنا چاہو تو آزاد کر دو اور اگر قصاص لینا چاہو تو یاد رکھو کہ اس نے تمہارے باپ کو ایک ضرب لگائی ہے ——— تم بھی اسے فقط ایک ضرب لگانا۔ وہ اس ضرب سے مارا جائے اور نہ مارا جائے تو خیر!

---

[1] نہج البلاغہ صبحی صالح صفحہ ۴۲۱

پھر آپ نے اپنے اس قاتل کے بارے میں بھی پوچھ لیا کہ آیا اُسے کھانا پانی دیا گیا ہے یا نہیں؟ اپنے دشمن سے بھی آپ کا سلوک ایسا تھا۔ مولوی معنوی نے کہا ہے:

در شجاعت شیر ربانیستی
در مروت خود کہ داند کیستی

بہادری میں تو آپ کا لقب شیر خدا ہے۔ رحمدلی میں کوئی آپ کی تعریف نہیں کر سکتا۔ (مثنوی مولانا روم صفحہ ۹۷)

یہ امام علی علیہ السلام کی مردانگی اور انسانیت کا نمونہ ہے۔ آپ بستر میں لیٹے ہیں اور جوں جوں وقت گزر رہا ہے آپ کی حالت خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ زہر آپ کے مقدس بدن پر اور زیادہ اثر کر رہا ہے۔ اصحاب آتے ہیں ـــــ وہ پریشان ہیں ـــــ وہ روتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں۔ لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ علیؑ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور شگفتگی ہے ـــــ آپ فرما رہے ہیں:

۶۴ـ خدا کی قسم! یہ موت کا ناگہانی حادثہ ایسا نہیں ہے کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں ... اور نہ یہ ایسا سانحہ ہے کہ میں اسے برا جانتا ہوں۔ میری مثال بس اس شخص کی سی ہے جو رات بھر پانی کی تلاش میں چلے اور صبح ہوتے ہی چشمہ پر پہنچ جائے اور اس ڈھونڈنے والے کی مانند ہوں جو مقصد کو پالے اور جو اللہ کے یہاں ہے وہی نیکوکاروں کے لیے بہتر ہے۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ وصیت ۲۳)

یعنی جو کچھ مجھ پر گزری ہے وہ ایسی چیز نہیں جو مجھے ناپسند ہو۔ ہرگز نہیں ـــــــ یہ موت اور شہادت ہے۔ خدا کی راہ میں موت اور شہادت ایک ایسی چیز ہے جس کی مجھے ہمیشہ آرزو رہی ہے۔ اس سے بہتر ہوگا کہ میں عین عبادت کی حالت میں شہید ہو جاؤں۔ اس کے بعد آپ نے وہ مثل بیان کی جس سے عرب بخوبی آشنا رہے ہیں۔ وہ عرب جو بیابانوں میں رہتے اور پر مشقت زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کو جہاں کہیں پانی اور سبزہ نظر آتا، وہاں ڈیرہ ڈال دیتے اور جب وہ ختم ہو جاتا تو دوسری جگہ جا رہتے تھے۔ چونکہ دن گرم ہوتے تھے اس لیے راتوں کو ایسی جگہ تلاش کرتے جاتے تھے کہ جہاں پانی ہو۔

امام علیؑ فرماتے ہیں:

اے لوگو! اس شخص کو کتنی خوشی ہوتی ہے جو اندھیری رات میں پانی تلاش کر رہا ہو اور اچانک اسے پانی مل جائے۔

اس کلام میں آپ اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں: میری مثال اس عاشق کی ہے جو اپنے معشوق تک پہنچ گیا ہو۔ میری مثال اس شخص کی ہے جو اندھیری رات میں پانی تلاش کر رہا ہو اور اچانک اسے پانی مل جائے۔

اس ذیل میں حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے:

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
اندر آن ظلمت شب آب حیاتم دادند
چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی
آن شب قدر کہ این تازہ براتم دادند

اپنے ان اشعار میں حافظ شیرازی نے امام علیؑ کے اس ارشاد کی تشریح کی ہے کہ "رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا"۔ یعنی کل رات مجھے غم زندگی سے نجات مل گئی جبکہ رات کے اندھیرے میں مجھے شہادت کا آبِ حیات پلایا گیا۔ وہ کیسی اچھی رات اور کتنی پیاری صبح تھی کہ جس میں مجھے میرا نصیب (مرتبۂ شہادت) دیدیا گیا۔

امام علیؑ کی سب سے زیادہ پرسوز وہ باتیں ہیں جو آپ نے ان تقریباً ۴۵ آخری ساعتوں میں کہیں۔

امام علیؑ نے ۱۹ رمضان کو صبح صادق سے تھوڑی دیر بعد زہر بھری تلوار کی ضرب کھائی اور اکیسویں کو آدھی رات کے وقت آپ کی مقدس روح عالم بالا کی جانب پرواز کر گئی۔ ان آخری لمحات میں سبھی اہل وعیال آپ کے بستر کے گرد جمع تھے۔ آپ کے مبارک بدن پر زہر کا بہت زیادہ اثر ہو گیا تھا۔ بعض اوقات آپ پر غشی طاری ہو جاتی ـــــ لیکن جونہی آپ کو ہوش آتا آپ اپنی زبان سے دوبارہ موتی بکھیرنے لگتے تھے۔ اس وقت آپ حکمت کی باتیں بتاتے، نصیحتیں کرتے اور وعظ فرماتے تھے۔ آپکے آخری کلمات میں بھی وہی جوش اور خطابت پایا جاتا ہے جیسے آپ نے بیس عنوانوں میں بیان کیا ہے

چنانچہ آپ اہل بیتؑ کو آواز دیتے ہیں اور سب سے پہلے حسنؑ و حسینؑ کو مخاطب فرماتے ہیں:

میرے حسنؑ، میرے حسینؑ، میرے تمام فرزندو اور وہ تمام لوگو جن تک روزِ قیامت تک میری باتیں پہنچیں ـــــ میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی ہم اور آپ جو یہاں بیٹھے ہیں

ہم بھی امام علی علیہ السلام کے مخاطب ہیں)۔

۶۵ پھر ہمارے مولا اسلام کی جامعیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:
آپ خدا کا خوف دلا کر ایک ایک چیز کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی نماز کے بارے میں خدا کا خوف کرو کہ اس کا حکم یوں ہے ـــــ زکوٰۃ کے بارے میں خدا کا خوف کرو کہ اس کا حکم یوں ہے ـــــ خدا کا خوف کرو کہ ...... اور ..... آپ کہتے چلے گئے اور وہ بیس عنوان جو آپ کی نظر میں تھے وہ سب کے سب بیان کیے۔ (تحف العقول صفحہ ۱۳۵)

جن لوگوں کی نگاہیں علیؑ کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں، انھوں نے یکایک دیکھا کہ مولا علیؑ کی حالت بہت تبدیل ہو گئی ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ آپ کی مبارک پیشانی پر پسینہ آ گیا ہے اور آپ نے اپنی توجہ لوگوں کی جانب سے ہٹا لی ہے اور اپنی دنیا میں چلے گئے ہیں۔ آنکھیں اور کان آپ کے ہونٹوں پر لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں آپ کیا فرماتے ہیں، اتنے میں امیر المومنینؑ کی آواز بلند ہوئی:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

پانچویں نشست

کمال اور اخلاق کا رابطہ

وہی تو خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو پاک کرتا اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے اگرچہ وہ لوگ اس کے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

(سورۂ جمعہ۔ آیت ۲)

ہر صاحب مکتب شخص جو بنی نوع انسان کے لیے کوئی ضابطہ حیات لایا ہے وہ انسان کے کمال یا کامل انسان کے بارے میں ایک نظریہ رکھتا ہے۔ وہ چیز جس کو اخلاق کا نام دیا جاتا ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ایک علم نہیں "فن" ہے۔ یعنی اخلاق کا تعلق اس سے ہے جو "ہونا چاہیے" اور اس سے نہیں جو موجود "ہے"۔

اخلاق سے مراد ایسی اچھی صفات ہیں جو انسان میں ہونی

چاہئیں اور بہتر یہی ہے کہ وہ یہ صفتیں رکھتا ہو۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہو تو وہ انسانیت کے بلند مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے اور یہی ایک بلند انسان، برتر انسان اور کامل انسان کی دوسری تعبیر ہے۔ کامل انسان کے بارے میں مختلف مکاتیب فکر کے بانیوں کے نظریات کا خلاصہ چند بنیادی نظریات کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے:

ایک نظریہ عقل پر اعتماد کرنے والوں کا ہے ــــ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے انسان کو زیادہ تر عقل کے زاویے سے پرکھا اور صرف عقل کو ہی اس کا جوہر سمجھا ہے ــــ عقل کے معنی سوچ بچار کی قوت کے ہیں۔

سوچنے کا یہ انداز قدیم فلسفیوں کا تھا جس میں ہمارے (سب تو نہیں مگر بعض) قدیم فلسفی بھی شامل ہیں، جن میں ایک بو علی سینا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کامل انسان کے معنی "حکیم" ہیں اور انسان کا کمال اس کی حکمت میں ہے۔ حکمت سے ان کی مراد کیا ہے؟ کیا حکمت وہ چیز ہے جسے ہم آجکل حکمت کہتے ہیں؟ نہیں ــــ حکمت سے ان کی مراد حکمت نظری ہے جو کل کائنات کے بارے میں ایک صحیح دریافت ہے جو علم کے علاوہ ہے۔ یہ ہستی کے ایک حصے کی دریافت ہے۔ اب اس مرحلے پر ہم حکمت اور علم میں فرق واضح کرنے کے لیے اس قول کی مزید توضیح کرتے ہیں۔

اگر آپ شہر تہران کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو آپ دو قسم کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں ــــ ایک عام لیکن مبہم معلومات اور دوسری جزوی لیکن صریح معلومات ہوں گی۔ مثلاً بعض اوقات شہر تہران

کے بارے میں آپ کی معلومات ایک میونسپل انجینئر کی معلومات کی مانند ہوتی ہیں۔
اگر آپ اسے شہر کا ایک عام نقشہ کھینچنے کو کہیں تو وہ آپ کو تہران کا ایک عام نقشہ کھینچ دے گا اور وہ بتائے گا کہ وہ شمال سے جنوب، مشرق سے مغرب تک کیسا ہے۔ نیز اس کا جنوب مشرقی اور جنوب مغربی حصہ کیسا ہے۔ وہ شہر کی سڑکیں، میدان اور پارک بھی کاغذ پر کھینچ دے گا۔ مثلاً یہ نیاوران ہے، وہ تجریش ہے اور اس طرف شاہ عبدالعظیم ہے۔ وہ آپ کو تہران کے بارے میں عام اطلاعات بہم پہنچائے گا لیکن وہ سب مبہم ہوں گی اور اگرچہ وہ آپ کو سارے شہر کے بارے میں بتائے گا لیکن اگر آپ اس نقشے میں اپنا گھر تلاش کرنا چاہیں تو نہیں کر پائیں گے۔

بعض اوقات ایک شخص کو اس عظیم شہر کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس میں کتنی سڑکیں ہیں اور کتنے میدان ہیں ـــــ لیکن اگر آپ اس سے ایک خاص محلے کے متعلق پوچھیں تو اسے اس جگہ کی تمام جزئیات کا علم ہوتا ہے مثلاً یہ کہ اس محلے میں کتنے کوچے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے کیسے ملے ہوتے ہیں۔ نیز فلاں کوچے میں کتنے گھر ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ان گھروں کے دروازوں کا رنگ بھی جانتا ہے کہ یہ نیلا ہے اور وہ سرخ ہے۔ پس اگر آپ اس شخص سے جو سارے شہر سے واقف ہے ایک خاص جگہ کے بارے میں سوال کریں تو اسے کوئی خبر نہ ہوگی اور اگر آپ اس شخص سے جو ایک خاص محلے کے بارے میں جانتا ہے سارے شہر کے متعلق پوچھیں تو اسے کچھ پتہ نہ ہوگا۔

حکیم یا فلسفی اس شخص کو کہتے ہیں جو عالم ہستی کا مجموعی طور پر مطالعہ کرتا ہے۔ وہ عالم ہستی کی انتہا کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کی ابتدا

کے ساتھ ساتھ اس کی انتہا کا اندازہ لگانا چاہتا ہے۔ وہ ہستی کے حقائق اور اس کے عام قوانین معلوم کرنا چاہتا ہے لیکن اگر آپ اسی شخص سے کسی جڑی بوٹی، حیوان، پتھر، زمین یا سورج کے متعلق سوال کریں تو اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

فلسفی کے نقطۂ نظر کے مطابق حکمت کے معنی دنیا کے بارے میں معلومات ہیں۔ دنیا کی مجموعی ہیئت کے بارے میں ایسی معلومات جو حکیم یا فلسفی کے ذہن کے آئینے میں منعکس ہوئی ہوں۔ یعنی تمام کائنات حکیم کی عقل میں مشخص ہو گئی ہو لیکن وہ مبہم شکل میں ہو۔

گزشتہ زمانے میں کہا جاتا تھا انسان کا کمال اس میں ہے کہ دنیا کی تمام ہیئت اس کے ذہن میں منعکس ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم فلسفی کہا کرتے تھے:

"عقلی دنیا کے انسان کا عینی دنیا کے مطابق ہو جانا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ خود اس دنیا کے مقابلے میں ایک دنیا بن جاتا ہے۔"

لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہ عینی دنیا ہے اور یہ عقلی اور فکری دنیا ہے ـــــ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

ہر آن کس ز دانش برد توشہ ای
جہانی است بنشستہ در گوشہ ای

جو انسان عقل و دانش کی منزل طے کر جائے وہ دراصل ایک گوشے میں سمٹی ہوئی دنیا ہے۔

فلسفیوں کے نظریے کے مطابق کامل انسان یعنی جس کی عقل کمال تک پہنچی ہوئی ہو، وہ ان معنوں میں بھی کمال کو پہنچتا ہے کہ اس کائنات کی ہیئت کا ایک نقش اس کے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے، لیکن کس طرح سے؟ ہاں وہ نقش برہان، استدلال، منطق اور فکر کے لحاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان استدلال اور منطق کے قدموں سے حرکت کرتا ہوا اس مقام پہ پہنچتا ہے لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اور کہا ہے کہ حکمتیں دو ہیں:

(۱) حکمتِ نظری: یعنی دنیا کو اس کی شکل میں پہچاننا۔

(۲) حکمتِ عملی: یعنی انسان کی عقل کا اس کے وجود کی تمام جبلتوں اور قوتوں پر کامل تسلط پانا۔

اگر آپ نے کتب اخلاق کا مطالعہ کیا ہے تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ ان میں سے بیشتر اس عقلی بنیاد پر نتائج نکالتی ہیں یعنی ہمارا فن اخلاق ـــــ سقراطی اخلاق ہے اور اس کا دارومدار ہمیشہ عقل پہ ہوتا ہے۔ کیا آپ کی عقل آپ کی نفسانی خواہشات پر حاکم ہے یا آپ کی نفسانی خواہشات آپ کی عقل پر حاکم ہیں؟ کیا آپ کی عقل آپ کے غصے پر حاکم ہے یا آپ کا غصہ آپ کی عقل پر حاکم ہے؟ کیا آپ کی عقل آپ کے توہمات پر حاکم ہے یا آپ کے توہمات آپ کی عقل پر حاکم ہے؟ اگر آپ حکمتِ نظری میں اس دنیا کو اسی طرح سمجھ لیں جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں اور حکمتِ عملی میں بھی اپنی عقل کو اپنے نفس پر مسلط کر لیں کہ آپ کا نفس اور نفسانی قوتیں آپ کی عقل کے تابع ہوں تو آپ عقل و حکمت کے اس مکتب فکر کے نقطۂ نظر سے ایک کامل انسان ہیں۔

کامل انسان کا تعین کرنے کے بارے میں "مکتب عقل" کے علاوہ ایک اور مکتب بھی ہے اور وہ "مکتب عشق" ہے۔

"مکتب عشق" جو درحقیقت "مکتب عرفان" ہے، اس میں انسان کا کمال عشق میں اور اس چیز میں سمجھا جاتا ہے جس تک عشق انسان کو پہنچاتا ہے اور اس سے مراد خدائے تعالیٰ کی ذات سے عشق ہے۔

گویا کہ مکتب عشق ـــ مکتب عقل کے برعکس ہے ـــ جو "حرکت" کا نہیں "فکر" کا مکتب ہے۔ کیونکہ حکیم حرکت کی بات نہیں کرتا بلکہ فکر کی بات کرتا ہے اور اس کے نظریے کے مطابق تمام حرکتیں بھی ذہن ہی کی حرکت ہیں۔ جہاں تک عشق کے مکتب کا تعلق ہے تو وہ حرکت کا مکتب ہے لیکن یہ حرکت افقی نہیں بلکہ "صعودی" اور "عمودی" ہوتی ہے۔ تاہم بعد میں یہ "افقی حرکت" میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب ایک انسان کمال تک پہنچنا چاہے تو ضروری ہے کہ ابتدا میں اس کی حرکت عمودی اور صعودی ہو یعنی وہ خدا کی جانب حرکت اور پرواز ہو۔ مکتب عشق کے لوگوں کا خیال ہے کہ بات فکر کی بات نہیں ـــ بات عقل کی بات نہیں ـــ بات استدلال کی بات نہیں ـــ بلکہ بات انسان کی روح کی بات ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق انسان کی روح واقعی حرکت کرتی ہے اور وہ ایک معنوی حرکت ہوتی ہے ـــ حتیٰ کہ وہ خدا تک جا پہنچتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مکتب بنیادی طور پر عقل کے مکتب کا راستہ روکتا ہے۔

ہماری ادبیات کا ایک گرانقدر حصہ "عقل" اور "عشق" کے مناظرے

سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر جو اشخاص اس بحث میں وارد ہوتے ہیں اور زیادہ تر خود اہل عرفان تھے اور انہوں نے ہمیشہ عشق کو عقل پر فتح مند قرار دیا ہے۔ یہ وہی مکتب ہے جس کے پیرو کامل انسان کے لیے اور انسان کے کمال تک پہنچنے کے لیے عقل کو کافی نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل انسان کے وجود کا ایک جزو ہے اور انسان کی عقل اس کی پوری ذات پر محیط نہیں ہے۔ عقل آنکھ کی مانند ہے اور یہ محض ایک آلہ ہے۔ حالیہ دور میں "برگسون" نے بھی اس بات پر بہت اعتبار کیا ہے۔ اہل عشق کا کہنا ہے کہ انسان کی ذات اور انسان کا جوہر عقل نہیں بلکہ روح ہے اور روح کا تعلق دنیا سے عشق سے ہے۔ یہ ایک ایسا جوہر ہے جس میں خدائے تعالیٰ کی جانب حرکت کے علاوہ اور کوئی چیز مطلوب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عشق کے مقابل عقل حقیر ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس مکتب کے پیرو عشق و مستی کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ جیسا کہ حافظ شیرازی کے بعض اشعار میں آیا ہے، ان کے ہاں توحید کے معنی کچھ اور ہیں۔ ان کی توحید "وحدت وجود" ہے اور ایک ایسی توحید ہے کہ اگر انسان وہاں تک پہنچ جائے تو ہر چیز کو حقیقی شکل میں اپنے اندر پاتا ہے اور بالآخر ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان — انسان بھی ہے اور خدا بھی ہے — اور اس مکتب کے مطابق ایک کامل انسان آخر کار خدا بن جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک حقیقی کامل انسان خود خدا ہے اور ہر وہ انسان جو کامل انسان ہو جاتا ہے وہ خود فنا ہو کر خدا سے متصل ہو جاتا ہے۔

کامل انسان کے بارے میں ایک اور نقطۂ نگاہ بھی ہے جو نہ عقل پہ تکیہ کرتا ہے اور نہ عشق پر ـــــ بلکہ وہ فقط "قدرت" پر تکیہ کرتا ہے۔

اس مکتب میں کامل انسان کے معنی مقتدر انسان کے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق کمال کے معنی قدرت کے ہیں یعنی اقتدار ـــــ زور اور پھر جس معنوں میں بھی آپ قدرت کو لے لیں۔

قدیم یونان میں کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں سوفسطائی SOPHIST کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا نظریہ بڑی صراحت سے بیان کیا اور کہا ہے کہ "حق" سے مراد ہی زور، اور جہاں کہیں زور ہے وہاں حق ہے ـــــ جہاں کہیں قدرت ہے وہی قدرت حق ہے اور کمزوری ـــ بے حقی اور ناحقی کے برابر ہے۔

ان کے ہاں بنیادی طور پر عدالت اور ظلم کے کوئی معنی اور مفہوم نہیں ہے لہٰذا وہ کہتے ہیں "حق زور" ہے یعنی حق زور ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ انسان کی تمام تر کوشش زور، قوت اور قدرت حاصل کرنے کے لیے ہونی چاہیے اور بس۔ پھر اسے یہ قدرت حاصل کرنے کے لیے کوئی پابندی اور کوئی حد بھی قبول نہیں کرنی چاہیے۔

حالیہ ایک دو صدیوں میں مشہور جرمن فلاسفر نطشے نے اس مکتب فکر کو دوبارہ زندہ کیا ـــ آگے بڑھایا اور اس کی خوب خوب ترجمانی کی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سچائی اچھی چیز ہے، دوستی اچھی چیز ہے، امانت اچھی چیز ہے ـــــ وغیرہ، یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ انسانیت اچھی چیز ہے نیکی اچھی چیز ہے ـــــ یہ بھی فضول باتیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس کے کیا

معنی ہیں کہ جو کمزور ہو اسے سہارا دینا چاہیے؟ اس کی بجائے اس کے منہ پر تو ایک طمانچہ مارنا چاہیے۔ اس کا اس سے بڑا کوئی اور گناہ نہیں کہ وہ کمزور ہے۔ چونکہ وہ کمزور ہے اس لیے اس کے سر پر ایک پتھر دے مارو۔

نطشے جو خدا اور دین کا مخالف ہے وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ دین کمزوروں نے اختراع کیا ہے۔ یہ کارل مارکس کے نظریے کے بالکل برعکس ہے جو کہتا ہے کہ دین طاقتور لوگوں نے اختراع کیا ہے تاکہ کمزوروں کو اپنے غلام بنائے رکھیں۔ اس کے مقابل نطشے کہتا ہے نہیں ــــــ دین کمزوروں نے اختراع کیا ہے تاکہ طاقتوروں کی طاقت کو محدود کر دیں۔ چنانچہ اس کے نظریے کے مطابق دین نے نوع بشر کے ساتھ جو غداری کی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے آکر بخشش، سخاوت، روح، مروت، انسانیت، اچھائی وغیرہ کے مفاہیم لوگوں میں پھیلا دیے اور بعد میں طاقتور لوگوں نے ان باتوں سے دھوکا کھایا ہے۔ چنانچہ وہ عدالت، سخاوت، بخشش اور انسانیت کو ملحوظ رکھنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے اپنی طاقت میں کسی حد تک کمی کر دی ہے۔

وہ کہتا ہے: حاملانِ دین نے آ کر کہا ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد! لیکن تم کہو نفس کی نازبرداری اور کہو نفس پروری! انہوں نے کہا ـــــ مساوات ـــــ وہ کہتا ہے یہ غلط ہے! مساوات کے کیا معنی ہیں؟ یہ ضروری ہے کہ ہمیشہ کچھ لوگ کمزور ہوں اور کچھ زبردست ہوں۔ کمزور ـــــ زبردستوں کی خاطر کام کریں! تاکہ وہ پھلیں پھولیں اور بڑھ چڑھ جائیں اور ان میں سے ایک برتر آدمی پیدا ہو!

وہ مزید کہتا ہے: اہل دین کہتے ہیں کہ عورت اور مرد کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں ـــــ یہ بھی غلط ہے۔ مرد ایک برتر اور طاقتور جنس ہے، عورت ـــــ مرد کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اس کی پیدائش کا اور کوئی مقصد نہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ مکتب فکر بنیادی طور پر مقتدر اور زور آور فرد کو برتر، ممتاز اور کامل انسان سے تعبیر کرتا ہے اور کمال کو قدرت اور قوت میں منحصر گردانتا ہے۔ آجکل کم و بیش یہی باتیں نادانستہ طور پر خود مسلمانوں کے درمیان بھی رائج ہو گئی ہیں۔ بعض اوقات ہم بے خیالی میں کہتے ہیں زندگی "تنازع بقا" ہے! نہیں ـــــ زندگی تنازع بقا نہیں ہے۔ ہاں تنازع بقا، "اپنے دفاع" کے معنوں میں درست ہے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بعض مسلم علماء مثلاً فرید وجدی نے کہا ہے کہ انسانوں کے درمیان جنگ ایک ضرورت ہے اور جب تک انسان ہے جنگ ہونی چاہیے، کیونکہ یہ انسان کی زندگی کا ایک بنیادی اصول ہے۔ وہ اس بات پر اعتقاد رکھتے اور کہتے ہیں کہ خود قرآن نے بھی اس بات کی تائید کی ہے:

> ﴿ اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دور نہ کرتا رہتا تو گرجے، ہیکل، آتشکدے اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے، کبھی کے ڈھا دیے گئے ہوتے۔
>
> (سورۂ حج ـ آیت ۴۰)

ایک اور مقام پہ فرماتا ہے :

۶۹ اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دور نہ کرتا رہتا تو تمام روئے زمین پر فساد پھیل جاتا۔

(سورہ بقرہ - آیت ۲۵۱)

یہاں قرآن صریحاً جنگ کو ایک مشروع امر قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:
اگر خدا بعض انسانوں کے ذریعے دوسرے انسانوں کے فساد کا سدّباب نہ کرتا تو نہ کوئی عبادت گاہ ہوتی، نہ خانقاہ ہوتی، نہ کلیسا (یہودیوں کی عبادت گاہ) ہوتا اور نہ کوئی مسجد ہوتی۔ کچھ بھی نہ ہوتا لیکن انہوں نے قرآن مجید کی آیات کے مقصود کو سمجھنے میں غلطی کی ہے کیونکہ ان میں دفاع کا تذکرہ آیا ہے اور قرآن کا یہ ارشاد مسیحیت کے مقابلے میں ہے یعنی اس مسیح پادری کے جواب میں جو کہا جاتا ہے کہ جنگ قطعی طور پر ناجائز ہے اور ہم "صلح کل" ہیں!

قرآن فرماتا ہے کہ جنگ ناجائز ہے لیکن وہ جنگ جو "تجاوز" ہو ...... تو وہ کہ جو حق اور حقیقت کے دفاع کے لیے ہو، اس کا جنا بپادری صاحب! اگر دفاعی جنگ نہ ہوتی تو آپ بھی اس خانقاہ اور گرجے میں عبادت نہ کر سکتے اور وہ (مخالف جنگ) مسلمان بھی اپنی مسجد میں عبادت نہ کر پاتا۔ وہ مسلمان جو مسجد میں عبادت میں مشغول ہے اس کی عبادت اس سپاہی کی دلیری کی مرہونِ منت ہے جو حق اور حقیقت کا دفاع کرتا ہے۔ نیز تم (مسیحی)، جو گرجے میں سکون کے ساتھ اپنے عقیدے کے مطابق عبادت میں مشغول ہو اور اپنے مذہبی مراسم ادا کر رہے ہو ...... تمہیں بھی اس

جنگ آزما سپاہی کا ممنون ہونا چاہیے۔

بنا بریں اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ انسان تربیت اور کمال کے ایک ایسے مرحلے پر پہنچ جائے کہ جہاں متجاوز کا کوئی وجود نہ ہو۔ جب متجاوز کا وجود نہ ہوگا تو مشروع جنگ کا بھی کوئی وجود نہ ہوگا۔ اسی لیے اسلام میں حضرت مہدیؑ کی حکومت کا تعارف ایک مثالی معاشرے کے طور پر کرایا جاتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ انہیں دنوں جب میں اس مسئلے کے بارے میں مطالعہ کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک عجیب داستان ہے جو اسلام کے مثالی معاشرے کو پہچاننے کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ امام مہدیؑ کے زمانے میں درندے بھی آپس میں صلح کریں گے اور جنگ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ یعنی لوگ کمال کی اس حد تک پہنچ جائیں گے جہاں تجاوز کا کوئی وجود نہ ہوگا کہ جس کی بنا پر جنگ لڑی جائے۔

لہٰذا یہ جو کہا جاتا ہے کہ زندگی بقا کی خاطر جنگ کرنے کا نام ہے۔ یعنی جنگ اور تنازع زندگی کا لازمہ ہے ـــــ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ایک جملہ ہے جو امام حسین علیہ السلام سے منسوب کیا گیا ہے لیکن نہ تو اس کے معنی درست ہیں اور نہ کسی کتاب میں موجود ہے کہ جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ یہ جملہ امام حسین علیہ السلام کا ہے۔ اس کے باوجود بھی چالیس یا پچاس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ یہ جملہ لوگوں کی زبانوں پر آنے لگا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

"اِنَّ الْحَیَاۃَ عَقِیْدَۃٌ وَّجِهَادٌ" - یعنی حیات کے معنی عقیدہ رکھنے اور اس عقیدے کی راہ میں جہاد کرنے کے ہیں لیکن یہ اہل مغرب اور فرنگیوں کے خیال سے مطابقت رکھتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ ایک عقیدہ رکھتا ہو اور اپنے اس عقیدے کی راہ میں جہاد بھی کرے۔

قرآن اس سلسلے میں حق کا ذکر کرتا ہے اور قرآن میں مذکور جہاد اور قرآن کے نظریہ حیات کے مطابق زندگی یہ ہے کہ حق پرستی کا طریقہ ہو اور حق کی راہ میں جہاد ہو نہ یہ کہ ایک عقیدہ ہو اور اس "عقیدے" کی راہ میں جہاد ہو۔

اس جگہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقیدہ ممکن ہے کہ حق ہو اور ممکن ہے کہ باطل ہو، کیونکہ وہ ایک بندھن ہے۔

تاہم یہ ایک اور مکتب فکر ہے جو کہتا ہے کہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک "عقیدہ" ایک مقصد اور ایک مطمح نظر رکھے اور اپنے مقصد کی راہ میں کوشش بھی کرے ــــــ اب وہ عقیدہ کیا ہو، تو وہ خواہ کچھ بھی ہو، اس کی انہیں کوئی فکر نہیں ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ بڑے نپے تلے ہیں، وہ فرماتا ہے: حق پرستی اور حق کی راہ میں جہاد ــــــ نہ کہ عقیدہ اور "عقیدے" کی راہ میں جہاد' قرآن کا کہنا ہے کہ پہلے تمہیں اپنے عقیدے کی اصلاح کرنی چاہیے۔ یعنی عموماً تمہارا پہلا جہاد خود اپنے عقیدے کے ساتھ ہونا چاہیے تمہیں چاہیے کہ پہلے اپنے عقیدے کے ساتھ جہاد کرو اور پھر درست، صحیح اور سچا عقیدہ اختیار کرو۔ پھر جب تمہیں حق کا پتہ چل جائے تو اس کی راہ میں جہاد کرو۔

بہرحال جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ بنیادی طور پر "کامل انسان" کا مطلب "مقتدر انسان" اور "طاقتور انسان" ہے تو اس کی بنیاد بھی تنازع بقاء کے اصول پر ہے۔ یہ وہی نظریہ ہے جس پر ڈارون کے فلسفے کی بنیاد قائم ہے اور وہ کہتا ہے کہ زندگی "تنازع بقاء" ہے۔ چنانچہ حیوانات ہمیشہ اپنے وجود کی بقاء کی جنگ کرتے رہتے ہیں اگرچہ اس معاملے میں انسان بھی ایسے ہی ہیں۔

ہم انسان کو اس بنا پر حیوانات کا ہم پلہ نہیں سمجھ سکتے کہ انسان کی زندگی بھی بقا کے لیے جنگ کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ اس قول کے معنی یہ ہیں کہ بقاء کے لیے تعاون ہو۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ زندگی تنازع بقاء ہے، ان کا بیان ہے کہ تعاون کو تنازع بقاء ہی نے مسلط کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں: اگر یہ بات ہے تو پھر انسانوں کے درمیان یہ اخلاص، تعاون، یہ اتحادِ عمل، یہ وحدت اور محبت وغیرہ کیا چیز ہیں؟ وہ کہتے ہیں: آپ نے غلط سمجھا ہے، کیونکہ اسی اخلاص، تعاون، محبت اور دوستی وغیرہ کے پیچھے تنازع دبا ہوتا ہے۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ یہ کیسے؟ وہ کہتے ہیں کہ انسانوں کی زندگی میں بنیادی چیز جنگ ہے، لیکن جب ان کا مقابلہ ایک اپنے سے بڑے دشمن کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ ان پر دوستی مسلط کر دیتا ہے۔ یہ دوستی درحقیقت دوستی نہیں ہوتی، خالص نہیں ہوتی، حقیقت نہیں ہوتی اور ہو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ ایک زیادہ بڑے دشمن کے مقابلے میں انکا اشتراک عمل ہوتا ہے جسے اصطلاح میں THESIS اور ANTITHESIS کہا جاتا ہے۔ جب ایک بڑے دشمن کا سامنا ہو تو محض اس کا مقابلہ کرنے کے

سے لوگوں میں تعاون اور اخلاص پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر آپ دشمن کو بیچ میں سے ہٹا دیں تو دیکھیں گے کہ یہ لوگ جو متحد تھے بکھر گئے، ان میں گروہ بندی پیدا ہو گئی اور وہ دشمنوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ پھر وہ اسی طرح تحلیل ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ دو فرد باقی رہ جاتے ہیں۔ جب وہ فرد باقی رہ جاتے ہیں اور کوئی تیسرا ان کے مقابلے پر نہیں ہوتا تو وہ آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں: تمام دوستیاں، صلحیں، مخلصیاں، انسانیتیں یگانگتیں اور یک جہتیاں وغیرہ کو انسانوں کی دشمنیاں ہی ان پر مسلط کرتی ہیں۔ پس تنازع اصل ہے اور تعاون اس کی پیداوار ہے، اس کا بچہ ہے اور اس کی شاخ ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح مکتب عقل کے مقابل ایک نظریہ تھا کہ جس کا وہ منکر تھا۔ اسی طرح مکتب عشق کے مقابلے میں بھی ایک نظریہ ہے اور اس مکتب کے پیرو اس کے منکر ہیں اور اسے محض خام خیالی قرار دیتے ہیں۔ پھر بعض لوگوں نے قدرت کی اہمیت کو بے حد گھٹایا اور یہ سمجھا کہ بنیادی طور پر انسان کا کمال اس کی کمزوری میں ہے۔ اس مکتب میں کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جو قدرت نہ رکھتا ہو کیونکہ اگر اسے قدرت حاصل ہو تو تجاوز کرتا ہے۔ سعدی کو بھی ایک رباعی کہتے ہوئے ایک ایسی ہی بڑی غلط فہمی ہوئی جبکہ وہ کہتے ہیں:

من آن مورم کہ در پایم بمالند   نہ زنبورم کہ از نیشم بنالند

چگونہ شکر ایں نعمت گزارم

کہ زور مردم آزاری ندارم

میں بھڑ نہیں کہ میرے ڈنک سے لوگ رویا کریں، بلکہ میں
وہ چیونٹی ہوں جسے وہ پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔
میں خدا کی نعمت کا شکر کیوں کر ادا کروں کہ مجھ میں لوگوں
کو تکلیف دینے کی طاقت نہیں ہے۔
(گلستان سعدی۔ باب سوئم)

نہیں جناب! کیا یہ طے شدہ امر ہے کہ انسان کو چیونٹی بننا چاہیے
یا زنبور.......تاکہ وہ کہے کہ اگر چیونٹی ہونے یا زنبور ہونے کے درمیان
انتخاب کرنا ہے تو میں چیونٹی ہونے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اصل بات یہ
ہے کہ نہ چیونٹی ہو کہ ہاتھ اور پاؤں کے نیچے مسلے جاؤ اور نہ تتیّا ہو
کہ لوگوں کو ڈنک مارو۔ اس کی بجائے یوں کہنا چاہیے تھا:

نہ آن مورم کہ در پایم بمالند
نہ زنبورم کہ از نیشم بنالند
چگونہ شکر این نعمت گزارم
کہ دارم زور و آزاری ندارم

میں بھڑ نہیں کہ میرے ڈنک سے لوگ رویا کریں، میں وہ
چیونٹی بھی نہیں ہوں کہ جسے وہ پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔
میں خدا کی اس نعمت کا شکر کیوں کر ادا کروں کہ طاقت
رکھتا ہوں اور کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔

شکر کا مقام یہ ہے کہ انسان زور رکھتا ہو لیکن کسی کو تکلیف نہ
پہنچاتا ہو۔ اگر وہ زور نہ رکھتا ہو اور کسی کو تکلیف بھی نہ پہنچاتا ہو تو یہ کوئی

بڑی بات نہیں ہے۔ وہ سینگ نہیں رکھتا کہ کسی کو ان سے مارے لیکن اگر وہ سینگ رکھتا اور کسی کو سینگ نہ مارتا تو یہ ایک کارنامہ ہوتا۔

پھر سعدی یہ کہتے ہیں :

بدیدم عابدی در کوہساری
قناعت کردہ از دنیا بہ غاری
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی
کہ باری بند از دل برگشائی

میں نے ایک عابد کو دیکھا کہ جس نے ایک غار میں پناہ لی ہوئی ہے اور وہاں عبادت میں مشغول ہے۔
میں نے اسے کہا کہ تم شہر میں کیوں نہیں آتے تاکہ لوگوں کی خدمت کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرو۔

تاہم ایک مقام پہ سعدی نے اس کے برعکس بھی کہا ہے :

صاحب دلی بہ مدرسہ آمد ز خانقاہ
بشکست عہد صحبت اہل طریق را
گفتم میان عالم و عابد چہ فرق بود
تا اختیار کردی از آن این فریق را
گفت آن گلیم خویش بدر می برد ز موج
این سعی می کند کہ بگیرد غریق را

ایک عابد خانقاہ سے مدرسہ میں آگیا اور اس نے اہل طریقت کی صحبت کا عہد توڑ ڈالا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ عابد اور عالم میں کیا فرق ہے کہ تو خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسے آ گیا ہے۔

اس نے جواب دیا کہ عابد صرف اپنا دامن بچاتا ہے اور عالم گنہگاروں کو نیکی کی طرف لے آتا ہے۔

انہوں نے عالم اور عابد کے فرق کے بارے میں صحیح بات کہی ہے اور یہ جو انہوں نے کہا ہے:

میں نے ایک عابد کو دیکھا کہ جس نے ایک غار میں پناہ لی ہوئی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ تم شہر میں کیوں نہیں آتے تاکہ لوگوں کی خدمت کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرو۔

جب وہ عابد ـــــ سعدی کے جواب میں اپنا عذر پیش کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سعدی بھی اس کا عذر قبول کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بگفت آنجا پری رویانِ نغزند
چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

وہ کہنے لگا کہ شہر میں بہت سے حسین چہرے ہیں اور جب کیچڑ زیادہ ہو تو ہاتھی بھی پھسل پڑتے ہیں۔

یعنی شہر میں حسین لوگ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ میری نگاہ ان پر پڑے اور میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکوں، اس لیے میں یہاں آ گیا ہوں اور میں نے اپنے آپ کو غار کے دامن میں مقید کر لیا ہے۔

انسان کے اس کمال کے کیا کہنے کہ وہ پہاڑوں میں جا کر اپنے آپ کو ایک جگہ مقید کر لیتا ہے تاکہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچا سکے۔ یہ تو کوئی کمال نہ ہوا۔

جناب سعدی ـــــ قرآن مجید نے آپ کے لیے احسن القصص کی داستان نقل کی ہے ـــــ قرآن کا بہترین قصہ، یعنی حضرت یوسفؑ کا قصہ!

۱۶۔ اس میں شک نہیں کہ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اور صبر کرے تو وہ ایسے نیکوکاروں کا اجر ہرگز برباد نہیں کرتا۔

(سورۂ یوسفؑ۔ آیت ۹۰)

خواہش کو پورا کرنے کی تمام شرائط موجود ہیں اور اس کے تمام وسائل اور امکانات بھی فراہم ہیں۔ ادھر محل کے سب دروازے بند ہیں اور فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی آپ اپنی عفت کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے سامنے کے بند دروازوں کو کھول لیتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب آپ کنوارے جوان ہیں اور بے انتہا خوب صورت ہیں لیکن بجائے اس کے کہ آپ عورتوں کا پیچھا کریں، خود عورتیں آپ کے پیچھے آتی ہیں۔ کوئی دن نہیں گزرتا جب سیکڑوں خط اور سیکڑوں پیغام آپ کے لیے نہ آتے ہوں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مصر کی معزز ترین عورتیں آپ پر دل و جان سے عاشق ہو گئی ہیں۔

قرآن یوں درس دیتا ہے کہ شرائط فراہم کر دی گئی ہیں اور آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ کیونکہ آپ سے کہا جاتا ہے: یا تم میری خواہش پوری کرو یا میں تمہیں قتل کرا دوں گی اور تمہارا خون بہاؤں گی۔

تب حضرت یوسف علیہ السلام کیا کرتے ہیں؟ آپ اس فعل سے باز رہتے ہوئے کہتے ہیں:

لـ اے میرے پالنے والے! جس بات کی یہ عورتیں مجھ سے خواہش رکھتی ہیں، اس کی بہ نسبت قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اگر تو ان عورتوں کے فریب کو مجھ سے دفع نہ فرمائے گا تو مبادا میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں۔

(سورۂ یوسفؑ۔ آیت ۳۳)

اے پروردگار! یہ عورتیں مجھے جس چیز کی دعوت دیتی ہیں، اس سے میرے لیے قید خانہ بہتر ہے۔ اے خدا! تو مجھے قید خانے بھیج دے اور ان عورتوں کے چنگل میں گرفتار ہونے سے بچا لے۔ میں شہوت کے عمل کی طاقت رکھتا ہوں لیکن پھر بھی وہ کام نہیں کرتا۔

لہٰذا انسان کا کمال انسان کی کمزوری میں نہیں ہے۔ ہمارے بہت سے ادبی اشعار میں یہ نظر آتا ہے کہ انسان کا کمال اس کی کمزوری میں بتایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بابا طاہر عریان ہمدانی بھی اپنے اشعار میں کہتے ہیں:

ز دست دیدہ و دل ہر دو فریاد
کہ ہر چہ دیدہ بیند دل کند یاد
بسازم خنجری نیشش ز فولاد
زنم بر دیدہ تا دل گردد آزاد

میں اپنی آنکھ اور دل کے خلاف فریادی ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں دیکھتا ہوں، میرا دل اس چیز کی خواہش کرتا ہے۔ لہٰذا میں ایک خنجر چاہتا ہوں تاکہ اس کے ساتھ اپنی آنکھ پھوڑ دوں اور میرے دل کو سکون میسر ہو۔

اے بابا طاہر ـــــ بہت خوب! آپ ایک چیز سنتے ہیں اور آپ کا دل اس کی خواہش کرنے لگتا ہے، لہٰذا آپ کو ایک خنجر حاصل کرنا چاہیے تاکہ اپنا کان کاٹ ڈالیں۔

انہوں نے عجیب کامل انسان تیار کیا ہے ـــــ بابا طاہر کا کامل انسان بڑا شاندار ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو نہ ہاتھ رکھتا ہے نہ پاؤں ـــــ نہ کان رکھتا ہے نہ آنکھیں ـــــ نہ اعضائے مردانہ رکھتا ہے، غرضیکہ وہ کچھ بھی نہیں رکھتا۔

ہمیں اپنی ادبیات کے کونوں کھدروں میں ایسے "تعجب خیز" اور "ذلیل پرور" اخلاق بہت ملتے ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ آخر انسان بشر ہے اور غلطی کر جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ تفریط کی حالت میں رہتا ہے۔ جب انسان ان مکاتبِ فکر کا مقابلہ اسلام کے حقیقی مکتب سے کرتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی اسلام خدا کے علاوہ کسی اور کی جانب سے نہیں آیا۔ کیونکہ سقراط ایک گوشہ لیتا ہے اور غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ افلاطون بھی ایک گوشہ لیتا ہے اور غلط فہمی میں پھنس جاتا ہے۔ بوعلی سینا ایک گوشہ لیتا ہے اور غلط فہمی میں جا پڑتا ہے۔ محی الدین عربی یا مولوی معنوی بھی ایک گوشہ لیتے ہیں اور غلط فہمی میں گرفتار رہتے ہیں۔ کارل مارکس ایک گوشہ لیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اسی طرح نطشے، ژاں پال سارتر وغیرہ میں سے بھی ہر ایک ـــــ اخلاق کا ایک گوشہ لیتا ہے اور غلطی کھاتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ ایک بشر ہوں اور انہوں نے اپنی رائے ایک بشر کی سوچ کے ساتھ ظاہر کی ہو اور پھر بھی ان کا مکتب اتنا جامع،

بلند اور ترقی پذیر ہو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مفکرین بچے ہیں اور آنحضرتؐ ایک معلم ہیں جو اپنی بات آخر میں کہتے ہیں اور وہ بات کتنی بلند ہوتی ہے۔

بہر حال مکتبِ قدرت بھی ایک مکتب ہے اور مکتبِ عجز اس کے مقابل کا مکتب ہے۔

کامل انسان کے بارے میں ایک اور مکتب بھی ہے، جسے مکتبِ "محبت" کہا جا سکتا ہے اور اسے مکتبِ "معرفت" یعنی "معرفۃ النفس" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ مشرقی ایشیا میں اب سے چند ہزار سال پہلے بڑے بلند خیالات موجود تھے۔ اس وقت بھی بہت قدیم ہندی کتابیں موجود ہیں۔ جن کا فارسی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ "جوگ آبشت" بھی موجود ہے جو بہت ہی گرانقدر ہے۔

چند سال پہلے ہمارے بزرگوار استاد علامہ طباطبائیؒ سلمہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا کتاب پڑھی تو وہ اس کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کتابوں میں بڑے بلند مطالب ہیں، جن کی طرف نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے۔

اس مکتب میں انسان کے تمام کمالات کا محور "خود شناسی" ہے۔ یعنی اے انسان! اپنے آپ کو پہچان ـــــ ہاں پہلے اپنے آپ کو پہچان ـــــ سقراط نے بھی کہا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو پہچان! پھر تمام پیغمبروں نے بھی اور پھر پیغمبر اسلامؐ نے بھی فرمایا ہے: اپنے آپ کو پہچان!

؎ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ (غرر الحکم - حرف میم)

لیکن اس مکتب میں فقط اسی ایک نکتے پر تکیہ کیا گیا ہے کہ "اپنے آپ کو پہچان"۔ مشہور کانگریسی رہنما ایم۔ کے۔ گاندھی کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں انکے مقالات اور خطوط شامل ہیں اور اس کا نام ہے "یہ ہے میرا مذہب"۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ اس میں ایک جگہ گاندھی کہتے ہیں:

میں نے اپنشدوں کے مطالعہ سے تین اصول اخذ کیے ہیں اور یہ عمر بھر میری زندگی کا دستور العمل رہے ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ فقط ایک حقیقت وجود رکھتی ہے اور وہ "نفس کا پہچاننا ہے"۔ فارسی ترجمے میں لکھا ہے "شناختن ذات است" یعنی ذات کا پہچاننا ہے لیکن ترجمے میں غلطی ہوئی ہے اور وہ غلطی اس لیے ہوئی ہے کہ ذات اور نفس ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ فارسی ترجمے میں کہنا چاہیے تھا "شناختن نفس"۔ اسی بنا پر گاندھی فرہنگ اور مغرب کی دنیا پر بڑے عمدہ انداز سے حملہ کرتا ہے اور کہتا ہے: فرنگی نے دنیا کو پہچانا اور اپنے آپ کو نہیں پہچانا۔ چونکہ اس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا اس لیے اپنے آپ کو بھی تباہ کیا اور دنیا کو بھی تباہ کر رہا ہے۔ یہاں اس نے عجیب اور غیر معمولی طور پر اعلیٰ انداز میں دادِ سخن دی ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو پہچان لے وہ خدا کو بھی پہچان لیتا ہے اور پھر دوسروں کو بھی پہچان لیتا ہے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ فقط ایک طاقت وجود رکھتی ہے اور وہ "اپنے آپ پر تسلّط" کی طاقت ہے۔ جو شخص اپنے آپ پر مسلّط ہو جائے اس کا

دوسری چیزوں پر تسلّط صحیح اور درست ہے۔ یعنی وہ مسلّط ہو جاتا ہے اور اس کا مسلّط ہونا درست بھی ہوتا ہے۔ نیز فقط ایک نیکی وجود رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے لیے اسی چیز کو دوست رکھے جسے وہ اپنے لیے دوست رکھتا ہے اور دوسروں کے لیے وہی چیز پسند کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

معرفت سے ان کا مقصود معرفۃ النفس (اپنے آپ کو پہچاننا) ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہندی فلسفے میں "مراقبہ" یعنی "اپنے اندر اترنے" کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ اب اس نے سخت ریاضتوں کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس میں کچھ دوسری چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ میں ان کا ذکر نہیں کرتا اور مختصراً کہتا ہوں کہ اس فلسفے کی بنیاد "نفس کی پہچان" اور "مراقبے" پر ہے۔

ایک شخص کامل انسان کو "بے طبقہ انسان" سمجھتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ جو انسان طبقوں میں اور بالخصوص اونچے طبقوں میں ہو وہ ہمیشہ ایک معیوب انسان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ طبقاتی معاشرے میں کوئی بھی درست اور سالم انسان کا وجود نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک کامل انسان یعنی بے طبقہ انسان وہ انسان ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ ایک جیسی حالت میں زندگی بسر کرے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مکاتب بھی ہیں جو زیادہ تر انسان کی آزادی اور آگاہی کے پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ اس آگاہی میں ان کی بیشتر توجہ انسان کی اجتماعی آگاہی کی جانب ہوتی ہے۔ مثلاً ایگزسٹینشلزم (Existentialism) کا مکتب جو زیادہ تر اجتماعی آزادی،

آگاہی اور ذمہ داری پر دھیان دیتا ہے۔ ان کے نزدیک کامل انسان کے معنی آزاد، آگاہ اور ذمہ دار انسان کے ہیں اور آزادی کا لازمہ جنگ و جدل ہے کہ جو بجائے خود ایک علیحدہ مکتب ہے۔

مکتب انتفاع

اس ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ ان مکاتب کے ساتھ ایک اور مکتب فکر بھی وجود رکھتا ہے اور وہ مکتب انتفاع ہے۔ گویا یہ مکتب اور مکتب قدرت کسی حد تک ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس مکتب کا کہنا ہے کہ کامل انسان "حکیم" ہوتا ہے یا کامل انسان خدا تک پہنچتا ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اور صرف فلسفہ بافیاں ہیں۔ نہیں ــــ بلکہ کامل انسان کے معنی انتفاع گیر انسان کے ہیں۔ اگر آپ اپنے انسانی کمال تک پہنچنا چاہتے ہیں تو عالم فطرت سے انتفاع کی کوشش کریں۔ کیونکہ آپ فطرت سے جتنا زیادہ انتفاع کریں گے، اتنے ہی زیادہ کامل انسان ہوں گے۔

لہٰذا علم کے مورد میں بھی وہ حکمت کو نہیں بلکہ علم کو انسان کا کمال سمجھتے ہیں۔ پھر وہ علم کو بھی فطرت کی پہچان سے تعبیر کرتے ہیں اور فطرت کی پہچان محض اس پر تسلّط پانے کے لیے کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ انسان کی خدمت کرے اور وہ اس سے بہرہ مند ہو۔ آخر میں ان کی تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ انسان کے لیے علم کی اہمیت بھی ذاتی نہیں بلکہ ایک وسیلے کے طور پر ہے یعنی علم انسان کے لیے فطرت پر تسلط پانے اور اسے مسخر کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ کیونکہ جب انسان فطرت کو تسخیر کر لیتا ہے تو اس سے بہتر طور پر بہرہ مند، مستفید اور انتفاع کرتا ہے۔

اگر آپ انسان کو کمال تک پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ کوشش کریں کہ انسانوں کو فطرت سے استغناء کے مقام تک لے جائیں۔ اس لیے کہ فطرت سے استغناء کے علاوہ کسی کمال کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ جو علم کے ذاتی تقدس قدر اور کمال کی باتیں کی جاتی ہیں یہ نری لفاظی ہے اور علم ایک آلے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ علم انسان کے لیے ایسے ہی ہے جیسے گائے کے لیے سینگ چیتے کے لیے پنجے یا شیر کے لیے دانت ہیں۔ مختصر یہ کہ علم انسان کے لیے اس کے ہاتھ میں ایک آلے کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تھا ان نظریات کا ایک سلسلہ جو کامل انسان کے بارے میں وجود رکھتے ہیں۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کی رائے بیان کریں گے۔ اور بتائیں گے کہ اسلام "عقل" "عشق" "قدرت" "اجتماعی ذمہ داری" اور "بے طبقہ معاشرہ" وغیرہ کو کیا اہمیت دیتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک لمبی چوڑی داستان ہے۔

میں نے پچھلی نشست میں عرض کیا تھا کہ انسان کے کمال کے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ وہ موت کا سامنا کیسے کرتا ہے مثلاً جب موت آتی ہے تو وہ کیسے سوچتا ہے اور موت سے کتنا خوفزدہ ہوتا ہے۔ موت کا خوف انسان کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے اور اس کی بہت سی بدنصیبیاں موت کے خوف سے جنم لیتی ہیں۔ یہ موت کا خوف ہی ہے جس کی وجہ سے انسان پستی، ذلت اور ہزاروں دوسری مصیبتیں برداشت کر لیتا ہے۔

اگر کوئی شخص موت سے نہ ڈرے تو اس کی زندگی سراسر بدل جاتی ہے۔ چنانچہ عظیم اور بہت ہی عظیم انسان وہ ہوتے ہیں جو موت کا سامنا کرتے

وقت انتہائی دلاوری کے ساتھ اور اس سے بھی بڑھ کر خندہ پیشانی کے ساتھ موت کو گلے لگاتے ہیں، لیکن اس موت کو جو خودکشی نہ ہو بلکہ کسی ہدف کی خاطر ہو۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تبلیغ حق اور فرض کی ادائیگی میں شہادت خوش آیند ہے۔

۳۔ میری نظر میں یہ موت خوش نصیبی ہے اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا ایک اذیت ہے۔ (حسین ؑ ابن علی ؑ)

اولیاء حق کے علاوہ اس طرح موت کا سامنا کرنے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔۔۔۔ ان لوگوں کے علاوہ کہ جن کے لیے موت ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہونے یا امام حسین علیہ السلام کی تعبیر کے مطابق ایک پل عبور کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ صبح عاشور آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

۴۔ موت ایک پل کے علاوہ کچھ نہیں جس پر سے تم گزر رہے ہو۔

اے میرے ساتھیو! ہمارے لیے ایک پل ہے۔ جس پر سے ہمیں گزرنا ہے اور اس کا نام "موت" ہے۔ جب ہم اس پل پر سے گزر جائیں گے تو ایک ایسی جگہ پہنچیں گے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جوں جوں موت نزدیک آ رہی تھی، آپ کا چہرہ اتنا ہی بشاش ہوتا جا رہا تھا۔

ایک شخص عمر سعد کے ہمراہ اور واقعات کربلا کا رپورٹر تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور امام حسین ؑ شہید ہونے والے تھے۔ ان آخری لمحات میں ان پیشہ ور نیک لوگوں کی طرح جو ایسے مواقع پر ثواب کا کام کرتے ہیں۔ جب انہیں کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔۔۔۔ اس نے عمر سعد سے درخواست کی اور کہا:

اب میں حسینؑ ابن علیؑ کو پانی پلاؤں یا نہ پلاؤں۔ انہیں شہید تو ہو ہی جانا ہے لہٰذا مجھے اجازت دو کہ میں ان کے لیے کچھ پانی لے جاؤں، اگرچہ اسکا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ لیکن جب وہ پانی لے کر گیا تو وہ ازلی اور ابدی لعین دشمن) امام علیہ السلام کا مقدس سر لیے ہوئے واپس آ رہا تھا۔ جو شخص امامؑ کے لیے پانی لایا تھا وہ کہتا ہے:

۵۵ امام علیہ السلام کے چہرے کی بشاشت نے مجھے فرصت نہ دی کہ میں ان کے بارے جلنے کے متعلق سوچوں ــــ یعنی اس عالم میں کہ آپ کا سر کٹا ہوا تھا ــــ پھر بھی آپ کا چہرہ بشاش تھا......

پس کامل انسان، وہ شخص ہے جس کے چہرے پر بیرونی حوادث کا کوئی اثر نہ ہو۔ علیؑ وہ انسان ہیں جو اجتماعی مراحل اور مراتب کے لحاظ سے سب سے نچلے درجے پر ہیں۔ یہ سب سے نچلا درجہ کیا ہے؟ اقتصادی نقطۂ نگاہ سے سب سے نچلا درجہ محنت "مزدوری" کا ہے۔ یعنی وہ حالت کہ جب انسان محنت کرتا ہے اور اس کی اُجرت لیتا ہے۔ چنانچہ امام علی علیہ السلام بھی ایک ایسے شخص ہیں جو مزدوری کرتے تھے لیکن یہ بات بھی نہیں کہ ان کے پاس کچھ نہ تھا ــــ نہیں ــــ بلکہ علیؑ کے پاس جو کچھ ہوتا، حتیٰ کہ جنگی غنائم بھی خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ پھر دوسرے ہی دن کام کے لیے تشریف لے جاتے اور محنت سے روزی کماتے تھے۔

وہ تو نچلے درجے کا تذکرہ ــــ اب دیکھیے کہ معاشرتی مراحل میں سب سے اونچا مرحلہ حکومت اور خلافت کا ہے۔ یہ تاریخ ہے بقول علی الوری

جو کہتے ہیں: علیؑ نے کارل مارکس کا فلسفہ الٹ دیا۔ کیونکہ آپ جس طرح محل میں سوچتے تھے، جھونپڑیوں میں بھی اسی طرح سوچتے تھے۔ یعنی آپ کی سوچ میں جھونپڑے اور محل کی اقامت سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

وہ کہتے ہیں: علیؑ محنت مزدوری کرتے ہوئے بھی ویسے ہی سوچتے تھے ـــــ جیسے خلافت کے عہدے پر ہوتے ہوئے سوچتے تھے۔ پس اسی بنا پر انہیں "کامل انسان" کہا جاتا ہے۔

ہم یہاں کس چیز کے لیے جمع ہوئے ہیں؟ یہاں ہم ایک کامل انسان کا سوگ منانے بیٹھے ہیں۔ بتایئے اب سنیے کہ علیؑ کو رات کے وقت دفن کیا گیا ـــــ کیوں؟ اس لیے کہ جس طرح آپ غیر معمولی طور پر مخلص دوست رکھتے تھے اسی طرح آپ کے بدترین دشمن بھی تھے۔ ہم نے اپنی کتاب جاذبۂ دافعہ میں بتایا ہے کہ ایسے انسان جہاں غیر معمولی طور پر قوی کشش رکھتے ہیں، وہاں اسی نسبت سے رد کرنے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ وہ انتہائی مخلص دوست رکھتے ہیں، جو ان پر جان قربان کر دینا معمولی بات سمجھتے ہیں ـــــ لیکن وہ دشمن بھی ایسے رکھتے ہیں جن سے زیادہ خونخوار افراد ڈھونڈے نہیں ملتے۔ ان دشمنوں میں بالخصوص داخلی دشمن یعنی تقدس مآب دشمن خوارج تھے۔ جو دینی اعتقاد سے آراستہ اور با ایمان ہوتے ہوئے بھی نرے جاہل تھے۔ ان کے متعلق خود علیؑ نے اعتراف کیا تھا کہ وہ مومن تو ہیں مگر ہیں جاہل! آپ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: آپ خوارج (مارقین) اور معاویہ کے ساتھیوں (قاسطین) کا آپس میں مقابلہ کرتے اور فرماتے ہیں:

لا تقتلوا ان (خوارج) کو میرے بعد قتل نہ کرنا کیونکہ یہ ان (معاویہ کے

ساتھیوں) سے مختلف ہیں۔ یہ حق چاہتے ہیں لیکن احمق ہیں جب کہ وہ حق کو جانتے ہیں اور جان بوجھ کر حق کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔

علیؑ کے اتنے دوست ہوتے ہوئے بھی انہیں رات کو خفیہ طور پر کیوں دفن کیا گیا؟ ہاں —— آپ کے جسد مبارک کو خوارج کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسا کیا گیا۔ وہ کہتے تھے کہ علیؑ مسلمان نہیں ہیں اور اس بات کا خطرہ تھا کہ مبادا وہ رات کے وقت آپ کی قبر کھود ڈالیں اور آپ کی میت باہر نکال لیں۔

امام علی علیہ السلام سنہ ۴۰ھ میں شہید ہوئے اور امام صادق علیہ السلام نے سنہ ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔ چنانچہ اس واقعہ سے پورے سو سال بعد —— یعنی امام صادقؑ کے آخری دور تک سوائے ائمہ علیہم السلام اور کچھ اصحاب کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ علی کو کہاں دفن کیا گیا ہے۔

رمضان کی ۲۱ ویں رات کو امام حسن علیہ السلام نے جنازے کی ایک شبیہ بنا کر اسے آراستہ کیا اور فرمایا: اس کو مدینے لے جاؤ اور وہاں دفن کردو۔ تب عام لوگوں نے خیال کیا کہ امام علی علیہ السلام کو یہاں سے مدینے لے جا کر دفن کیا گیا ہے۔ پھر اس رات فقط علیؑ کی اولاد اور کچھ خاص شیعوں نے آپ کو دفن کرنے کے کام میں شرکت کی۔ اس کے بعد وہ لوگ کبھی کبھی آتے اور کوفہ کے نزدیک موجودہ مقام پر اپنے مولا کے مدفن کی زیارت کرتے تھے۔ امام صادقؑ کے زمانے میں خوارج کا خاتمہ ہو گیا اور وہ خطرہ دور ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے صفوان (دعائے علقمہ کے ناقل) کو حکم دیا کہ وہ مدفن علیؑ کی جگہ پر

بطور علامت ایک چھپر بنا دے۔ اس کے بعد سب کو معلوم ہو گیا کہ علیؑ کا مدفن کہاں ہے تب اور لوگ اپنے امیر المومنینؑ کے مقبرے کی زیارت کے لیے نجف اشرف آنے لگے اور آتے رہیں گے۔

ہمارے مولا کے جنازے کے ساتھ تھوڑے سے لوگ تھے جن میں آپ کے چند اصحاب شامل تھے۔ ان میں سے ایک بزرگوار صعصعہ بن صوحان ہیں جو امیر المومنینؑ کے خاص اور مخلص دوستوں میں سے تھے۔ وہ بڑے اچھے خطیب تھے اور امیر المومنینؑ کے حضور اشعار پڑھا کرتے تھے۔ جاحظ نے البیان میں ان کے بارے میں کچھ واقعات نقل کیے ہیں۔

میں اس سے زیادہ ذکر مصائب نہیں کر سکتا اور انہیں چند کلموں پر اکتفا کروں گا۔ پس جس وقت امام علیؑ کو دفن کیا گیا تو سب پر غیر معمولی غم و اندوہ طاری ہو گیا اور مارے غم کے ان کے گلے رندھے ہوئے تھے دریں اثنا صعصعہ اس حال میں آگے بڑھے کہ ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ انہوں نے مولا علیؑ کی قبر سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اپنے سر پر ڈال لی۔ پھر انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے دل پہ رکھا اور اپنے شہید امامؑ سے یوں مخاطب ہوئے:

کہ میرے مولا! آپ نے کتنی سعادتمندانہ زندگی گزاری اور کتنے سعادتمند ہو کر اس دنیا سے گئے۔

آپ کی ولادت خدا کے گھر میں ہوئی اور آپ خدا کے گھر میں ہی شہید ہوئے۔ یا علیؑ! آپ کتنے عظیم تھے اور ہم سب لوگ کتنے کمتر ہیں۔ اگر لوگ آپ کے منصوبوں پر عملدرآمد کرتے تو یہ عالم ہوتا:

۵۷ یعنی ان کے لیے زمین و آسمان سے (مادی اور روحانی)

نعمتیں بڑی کثرت سے آئیں۔
لیکن افسوس کہ لوگوں نے آپ کی قدر نہ پہچانی اور بجائے اس کے کہ آپ کے احکام پر عمل کرتے ـــــ انھوں نے آپ کو بے انتہا دکھ دیے۔ پھر آخر کار یہ ہوا کہ انھوں نے آپ کو پھٹے ہوئے سر کے ساتھ قبر او رمٹی کی جانب روانہ کر دیا۔

لا حَوْلَ وَلا قُوَّةَ اِلّا بِاللّٰه الْعَلِيِّ الْعَظِيْم

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

چھٹی نشست

کامل انسان اور مختلف نظریات (۱)

وہی خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول (محمدؐ) بھیجا کہ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔

(سورۂ جمعہ۔ آیت ۲)

قدما کی اصطلاح میں "کامل انسان" اور آجکل کی اصطلاح میں "مثالی انسان" کی پہچان بڑی لازم اور ضروری ہے۔ ہر مکتب فکر میں تربیت اور اخلاق کا نظام اس کے نقطۂ نظر سے "کامل انسان" یا "مثالی انسان" کی پہچان پر مبنی ہے۔

کامل انسان کے بارے میں انسان کی رائے جاننے کے لیے ہم مجبور ہیں کہ اس سلسلے میں جو مکاتب فکر موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کا جائزہ لیں، اس پر تفصیلی بحث کریں اور پھر ہر ایک کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر بیان کریں۔ گزشتہ

رات میں نے مجمل طور پر مختلف مکاتب کا ذکر کیا تھا اور آج رات ہم مکتب عقل کے نظریات سے اپنی بحث شروع کرتے ہیں:

میں نے عرض کیا تھا کہ قدیم فلاسفروں کے عقیدے کے مطابق انسان کا بنیادی جوہر اس کی عقل ہے۔ جس طرح انسان کا بدن اس کی شخصیت کا جزو نہیں اسی طرح اس کی روحانی اور نفسیاتی قوتوں اور صلاحیتوں میں سے کوئی بھی اس کی حقیقی شخصیت کا جزو نہیں ہے۔ انسان کی حقیقی شخصیت اس کی وہی قوت ہے جو سوچتی ہے اور وہی سوچنے والا "انسان" ہے یعنی وہ جو سوچتا ہے نہ وہ جو دیکھتا ہے ـــــ جو چیز دیکھتی ہے وہ اس سوچنے والی ہستی کا ایک آلہ ہے ـــــ نہ وہ جو تخیل کا عمل کرتا ہے کیونکہ وہ بھی اس سوچنے والے کا ایک آلہ ہے۔ اسی طرح مثلاً وہ عنصر بھی حقیقی انسان نہیں جو کسی کو چاہتا ہے، دوست رکھتا ہے یا شہوت اور غصہ رکھتا ہے۔ کیونکہ انسان کا اصلی جوہر سوچنا ہے اور کامل انسان وہ ہے جو سوچنے میں کمال کی حد تک پہنچ گیا ہو۔ پھر سوچنے میں کمال کی حد تک پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جہان ہستی کو جیسا کہ وہ ہے ـــــ دریافت اور معلوم کر لیا ہو۔

اس مکتب میں کچھ اور چیزیں بھی قابل توجہ ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ انسان کا حقیقی جوہر اور خوبی اس کی عقل ہے۔ دوسری یہ کہ عقل ایک ایسی قوت ہے جو اس بات کی قدرت رکھتی ہے کہ دنیا کو جیسی کہ وہ ہے دریافت کرے اور دنیا کی حقیقت کو کما حقہ اپنے اندر منعکس کرے۔ گویا کہ وہ ایک آئینہ ہے جو دنیا کی شکل کو اپنے اندر صحیح اور درست طور پر منعکس کر سکتا ہے جن اسلامی حکماء نے یہ نظریہ قبول کر لیا ہے۔ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ

اسلامی ایمان یعنی وہ ایمان جو قرآن میں آیا ہے یہی ہے۔ یعنی یہ دنیا جیسی کہ وہ ہے اس کی عام طور پر پہچان، دنیا کی مبدا کی پہچان، دنیا کی روش کی پہچان، دنیا کے نظام کی پہچان اور اس بات کی پہچان کہ دنیا کس نقطے کی جانب لوٹ رہی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ جو قرآن میں خدا پر ایمان اور خدا کے فرشتوں پر ایمان کہ جو وجود کے واسطے اور مرحلے ہیں، نیز دنیا کے مخلوق ہونے اور اس بات پر ایمان کہ خدا نے دنیا کو یونہی نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ اس نے دنیا کی رہنمائی کی ...... اور یہی نوع انسان کی رہنمائی انبیاء کے ذریعے کی ہے۔ علاوہ ازیں اس بات پر ایمان کہ ہر چیز خدا کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لیے کہ وہ خدا کی طرف سے آتی ہے اور خدا کی طرف ہی واپس جاتی ہے —— اسی کا نام معاد ہے —— یعنی جس معاد کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ یہی ہے اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ان حکماء نے اپنی تفاسیر میں —— ایمان کی تفسیر ایک معرفت، پہچان اور حکمت کی شکل میں کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایمان کے معنی پہچان کے ہیں۔ لیکن "دنیا کی یہ پہچان ایک فلسفیانہ اور حکیمانہ پہچان ہے" یہ علمی پہچان نہیں کہ جو ایک ادھوری پہچان ہوتی ہے، فلسفیانہ" کامل اور حکیمانہ پہچان کے معنی یہ ہیں کہ ہم دنیا کے مبدا، اور منتہا" ہستی کے مراتب اور دنیا کے پورے طرز عمل کو دریافت کریں اور جان لیں۔ چند ایک ایسے مکاتب فکر ہیں جو ہمیشہ عقلیت پسندوں کے اس مکتب کے خلاف برسرپیکار رہے ہیں۔ چنانچہ وہ پہلا مکتب جو ان کی ضد ہے اور جس نے اسلام کے دور میں ان کے خلاف جنگ کی —— وہ مکتب اشراق یعنی "عرفا" اور

"اہل عشق" کا مکتب ہے جس کی تشریح ہم بعد میں کریں گے۔

ایک اور مکتب "اہل حدیث" کا ہے کہ اخباری اور اہل حدیث عقل کی اس اہمیت سے انکار کرتے ہیں جو انہوں نے اسے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل کو وہ قدر و قیمت حاصل نہیں جو تم اسے دیتے ہو۔ اس کے بعد گویا کہ جدید دور میں عقلیت پسندوں کے مقابلے پر مکتبِ حس یعنی "مکتب حسیون" اٹھ کھڑا ہوا ہے اور گزشتہ تین چار صدیوں میں اس مکتب نے کافی ترقی کر لی ہے۔

حسیون آئے اور انہوں نے کہا: عقل وہ قدر و قیمت نہیں رکھتی جس کا تم اسے اہل سمجھتے ہو۔ ہاں عقل کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ وہ حس کی تابع ہے اور انسان میں بنیادی چیز اس کے حواس اور محسوسات ہیں۔ انسان کی عقل زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ حواس اسے جس بات سے زیادہ آگاہ کرتے ہیں وہ اس کے بارے میں کوئی کام انجام دیتی ہے۔

آپ ایک کارخانے کو لیں جس میں کچھ خام مواد لایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کارخانے کی مشینری اس خام مواد کا تجزیہ کرتی ہے۔ مثلاً اگر وہ روئی کاتنے اور کپڑا بننے کا کارخانہ ہے تو پہلے روئی صاف کی جائے گی، پھر سوت کاتا جائے گا اور بعد میں اسے ایک خاص کپڑے کی شکل میں بنا جائے گا۔ عقل بھی ایک کارخانہ ہے جس سے سوائے اس کے کوئی کام نہیں ہو سکتا کہ حواس کے راستے سے اس کو جو خام مواد ملے وہ اس پر کچھ کام انجام دیتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عقلیت پسندوں کا مکتب پورے طور پر اعتبار سے نہیں گرا بلکہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ تاہم بالفعل ہم عقلیت پسندوں اور دوسرے مکاتب کا باہم موازنہ کرنا ان کا تفصیلی مطالعہ کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ہمیں یہاں

اسلام کا نظریہ بیان کرنا ہے۔

عقلیت پسندوں کے مکتب میں کچھ باتیں پائی جاتی ہیں جن پر ہم ایک ایک کر کے نظر ڈالنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ اسلام کے نظریے سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں؟

عقلیت پسندوں کی پہلی بحث اور نظریہ "عقلی معرفت کا اعتبار اور اصالت" ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ انسانی عقل اس بات پر قادر ہے کہ اس دنیا کے حقائق دریافت کر سکے اور عقلی بیان ہی حقیقی بیان اور قابل اعتماد و قابل استناد ہے۔ تاہم بہت سے دوسرے مکاتب ہیں جو عقل کو اس قدر معتبر نہیں سمجھتے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا اسلامی علوم سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ عقل معتبر ہے یا نہیں؟ چنانچہ اسلامی علوم میں ہمیں عقل کے لیے ایسی غیر معمولی حمایت نظر آتی ہے جو دنیا کے کسی دوسرے دین میں دکھائی نہیں دیتی۔ یعنی دوسرے ادیان کی جانب سے عقل ——— اور عقل کے سند، حجت اور معتبر ہونے کی حمایت نہیں کی گئی۔

اب اسلام کا مقابلہ مسیحیت سے کریں [illegible] دیکھیں کہ مسیحیت ایمان کی قلمرو میں عقل کی دخل اندازی کے [illegible] قائل نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جہاں انسان کو کسی چیز پر ایمان لانا ہو، وہاں وہ سوچنے کا حق نہیں رکھتا۔ کیونکہ سوچنا عقل کا کام ہے اور وہ ان مسائل میں دخل اندازی کا حق نہیں رکھتی۔ جس چیز پر ایمان رکھنا ضروری ہو، اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیے اور عقل کو چون و چرا کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

ایک با ایمان پادری اور لوگوں کے ایمان کے محافظ کا فرض یہ ہے کہ

وہ عقل کی سوچ بچار اور استدلال کے ایمان کی قلمرو میں دخل دینے کا سدّباب کرے ـــــ اور درحقیقت یہی مسیحی تعلیمات کی بنیاد ہے۔

لیکن اسلام میں اس معاملے کی صورت اصلاً اس کے برعکس ہے اسلام میں عقل کے علاوہ کسی چیز کو اصول اسلام اور اصولِ دین میں مداخلت کا حق نہیں ہے یعنی اگر آپ سے اصول دین میں سے ایک کے بارے میں پوچھا جائے تو آپ کہیں گے کہ وہ خدائے یگانہ کے وجود کی توحید ہے۔ پھر اگر پوچھا جائے کہ آپ کس دلیل کی بنا پر ایمان لاتے ہیں تو اسلام آپ سے عقل کی راہ کے علاوہ کوئی اور راہ قبول نہیں کرتا۔ اگر آپ کہیں کہ میں نہیں جانتا اور میں نے اندھا قبول کیا ہے کہ خدا ایک ہے میرے پاس اس کی کوئی دلیل بھی نہیں اور آپ کو اس سے کیا غرض؟ آپ نتیجے کو لیں ـــــ مبادی سے آپ کا کیا کام؟ میں نے اپنی دادی کے قول پر اعتبار کیا ہے اور پھر میں نے ایک حقیقت کے بارے میں خود یقین پیدا کیا ہے۔ اب خواہ وہ یقین دادی اماں کے قول سے ہو یا میں نے خواب دیکھا ہو یا اپنے باپ دادا سے سنا ہو۔ اسلام کہتا ہے: نہیں ... جس اعتقاد کی بنیاد خواب، تقلید یا معاشرے کے اثر پر ہو وہ قابل قبول نہیں ہے۔ بس سوائے ایسی تحقیق کے جس میں عقل نے دلیل اور برہان کے ساتھ مطالب کو دریافت کیا ہو، یہاں کوئی دوسری چیز قبول نہیں ہے۔

مسیحیت کے اصول ایمان ـــــ عقل کے داخلے کی حد تک ایک ممنوعہ علاقہ ہیں اور ایک مسیحی پادری کا فرض ہے کہ وہ عقلی اور فکری قوتوں کے حملے سے اس علاقے کی حفاظت کرے لیکن اسلام میں ایمان کا علاقہ ایک

ایسا علاقہ ہے جو عقل کے لیے مخصوص اور اس کے اختیار میں ہے۔ حتیٰ کہ عقل کے علاوہ کوئی دوسری طاقت اس علاقے میں داخلے کا حق نہیں رکھتی۔

اسلامی مآخذ میں اس موضوع پر غیر معمولی طور پر بلند اور عمیق باتیں کہی گئی ہیں۔

سب سے پہلے قرآن مجید ہے جو ہمیشہ تعقل کی بات کرتا ہے اور شاید آج رات میں اس بات میں کامیاب ہو جاؤں کہ ایک حدیث کے ضمن میں قرآن کی چند آیات پڑھوں۔ یعنی امام موسیٰ کاظمؑ کی وہ حدیث پڑھوں جس میں قرآن سے استنباط کرتے ہوئے عقل کی اصالت بیان کی گئی ہے۔ انشاءاللہ!

علاوہ ازیں ہماری روایات اور احادیث میں عقل کو اتنا بنیادی اور اہم گردانا گیا ہے کہ جب آپ حدیث کی کتابیں کھولیں تو دیکھیں گے کہ ان کا پہلا باب ہی "کتاب العقل" ہے۔ مثلاً اگر آپ اصول کافی کو دیکھیں تو اس کی پہلی کتاب 'کتاب العقل' ہے۔ چنانچہ کتاب العقل میں آپ اول سے آخر تک دیکھیں گے کہ اہل تشیع کی احادیث عقل کی حمایت کرتی ہیں۔ اس ذیل میں امام موسیٰ کاظمؑ کی ایک ایسی تعبیر ہے جو غیر معمولی طور پر عجیب ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> خدا کی دو حجتیں ہیں ...... اس کے دو پیغمبر ہیں۔ ایک پیغمبر باطنی ہے، وہ انسان کی عقل ہے اور دوسرا پیغمبر ظاہری ہے۔
>
> (اصول کافی جلد ا کتاب العقل والجہل)

ظاہری پیغمبر انسانوں میں سے ہیں اور انہوں نے لوگوں کو دعوت حق دی ہے۔ چنانچہ خدا کی دو حجتیں ہیں اور یہ دونوں ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں یعنی اگر عقل ہو اور انبیاء نہ ہوں تو انسان اکیلا اپنی خوش بختی کا راستہ

طے نہیں کرسکتا۔ اسی طرح اگر انبیاء ہوں، مگر انسان عقل نہ رکھتا ہو تو بھی وہ خوش قسمتی کے راستے تک نہیں پہنچ پاتا۔ گویا کہ عقل اور پیغمبر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک کام انجام دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر عقل کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس اس قسم کی بہت زیادہ تعبیریں ہیں۔ مثلاً "عقل مند کا سونا جاہل کی عبادت سے بہتر ہے" "عقلمند کا کھانا جاہل کے روزہ رکھنے سے بہتر ہے" "عقلمند کی خاموشی اور سکون جاہل کی حرکت سے بہتر ہے" نیز خدا نے کوئی پیغمبر مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ پہلے اس کی عقل کو اس طرح کمال کی حد تک پہنچایا کہ اس کی عقل اس کی ساری امت سے زیادہ کامل تھی۔

ہم رسول اکرمؐ کو "عقل کل" کہتے ہیں اور یہ بات مسیحیت کے ذوق کے ساتھ ہرگز مطابقت نہیں رکھتی۔ درحقیقت مسیحیت میں عقل اور دین کا دائرہ الگ الگ ہے جبکہ ہم آنحضرت کو "عقل کل" کہتے اور سمجھتے ہیں۔

اس بنا پر شناخت کے عمل میں عقل کی اصالت یعنی حجیت عقل کے معنی یہ ہیں کہ عقل ایک صحیح معرفت حاصل کرسکتی ہے۔ لہٰذا اسلام اس مطلب کی قطعی طور پر تائید کرتا ہے جو حکماء کے نظریے کا ایک حصہ ہے۔

فلسفیوں کے نقطہ نگاہ کے مطابق انسان کا جوہر فقط اس کی عقل ہے اور باقی سب آلے اور وسیلے اس کے طفیلی ہیں۔ اگر بدن دیا گیا ہے تو یہ عقل کے لیے ایک آلہ ہے۔ اگر آنکھیں دی گئی ہیں، کان دیے گئے ہیں، حافظہ دیا گیا ہے اور تخیل کی قوت دی گئی ہے، غرضیکہ جو قوتیں اور استعدادیں ہمارے وجود میں ہیں، وہ ہماری ذات کے لیے آلے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہماری ذات

وہ عقل کی سوچ بچار اور استدلال کے ایمان کی قلمرو میں دخل دینے کا سدّباب کرے ـــــــ اور درحقیقت یہی مسیحی تعلیمات کی بنیاد ہے۔

لیکن اسلام میں اس معاملے کی صورت اصلاً اس کے برعکس ہے اسلام میں عقل کے علاوہ کسی چیز کو اصول اسلام اور اصولِ دین میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔ یعنی اگر آپ سے اصول دین میں سے ایک کے بارے میں پوچھا جائے تو آپ کہیں گے کہ وہ خدائے یگانہ کے وجود کی توحید ہے۔ پھر اگر پوچھا جائے کہ آپ کس دلیل کی بنا پر ایمان لائے ہیں تو اسلام آپ سے عقل کی راہ کے علاوہ کوئی اور راہ قبول نہیں کرتا۔ اگر آپ کہیں کہ میں نہیں جانتا اور میں نے از خود قبول کیا ہے کہ خدا ایک ہے میرے پاس اس کی کوئی دلیل بھی نہیں اور آپ کو اس سے کیا غرض؟ آپ نتیجے کو لیں ـــــــ مبادی سے آپ کا کیا کام؟ میں نے اپنی دادی کے قول پر اعتبار کیا ہے اور پھر میں نے ایک حقیقت کے بارے میں خود یقین پیدا کیا ہے۔ اب خواہ وہ یقین دادی اماں کے قول سے ہو یا میں نے خواب دیکھا ہو یا اپنے باپ دادا سے سنا ہو۔ اسلام کہتا ہے نہیں ... جس اعتقاد کی بنیاد خواب، تقلید یا معاشرے کے اثر پر ہو وہ قابل قبول نہیں ہے۔ بس سوائے ایسی تحقیق کے جس میں عقل نے دلیل اور برہان کے ساتھ مطالب کو دریافت کیا ہو، یہاں کوئی دوسری چیز قبول نہیں ہے۔

مسیحیت کے اصول ایمان ـــــــ عقل کے داخلے کی حد تک ایک ممنوعہ علاقہ ہیں اور ایک مسیحی پادری کا فرض ہے کہ وہ عقلی اور فکری قوتوں کے حملے سے اس علاقے کی حفاظت کرے لیکن اسلام میں ایمان کا علاقہ ایک

ایسا علاقہ ہے جو عقل کے لیے مخصوص اور اس کے اختیار میں ہے۔ حتیٰ کہ عقل کے علاوہ کوئی دوسری طاقت اس علاقے میں داخلے کا حق نہیں رکھتی۔

اسلامی مآخذ میں اس موضوع پر غیر معمولی طور پر بلند اور عمیق باتیں کہی گئی ہیں۔

سب سے پہلے قرآن مجید ہے جو ہمیشہ تعقل کی بات کرتا ہے اور شاید آج رات میں اس بات میں کامیاب ہو جاؤں کہ ایک حدیث کے ضمن میں قرآن کی چند آیات پڑھوں۔ یعنی امام موسیٰ کاظمؑ کی وہ حدیث پڑھوں جس میں قرآن سے استناد کرتے ہوئے عقل کی اصالت بیان کی گئی ہے۔ انشاء اللہ!

علاوہ ازیں ہماری روایات اور احادیث میں عقل کو اتنا بنیادی اور اہم گردانا گیا ہے کہ جب آپ حدیث کی کتابیں کھولیں تو دیکھیں گے کہ ان کا پہلا باب ہی "کتاب العقل" ہے۔ مثلاً اگر آپ اصول کافی کو دیکھیں تو اس کی پہلی کتاب 'کتاب العقل' ہے۔ چنانچہ کتاب العقل میں آپ اول سے آخر تک دیکھیں گے کہ اہل تشیع کی احادیث عقل کی حمایت کرتی ہیں۔ اس ذیل میں امام موسیٰ کاظمؑ کی ایک ایسی تعبیر ہے جو غیر معمولی طور پر عجیب ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> خدا کی دو حجتیں ہیں ــــــ اس کے دو پیغمبر ہیں۔ ایک پیغمبر باطنی ہے، وہ انسان کی عقل ہے اور دوسرا پیغمبر ظاہری ہے۔
>
> (اصول کافی جلد ا کتاب العقل والجہل)

ظاہری پیغمبر انسانوں میں سے ہیں اور انہوں نے لوگوں کو دعوت حق دی ہے۔ چنانچہ خدا کی دو حجتیں ہیں اور یہ دونوں ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں یعنی اگر عقل ہو اور انبیاء نہ ہوں تو انسان اکیلا اپنی خوش بختی کا راستہ

طے نہیں کرسکتا۔ اسی طرح اگر انبیاء ہوں، مگر انسان عقل نہ رکھتا ہو تو بھی وہ خوش قسمتی کے راستے تک نہیں پہنچ پاتا۔ گویا کہ عقل اور پیغمبر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک کام انجام دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر عقل کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس اس قسم کی بہت زیادہ تعبیریں ہیں۔ مثلاً "عقل مند کا سوتا جاہل کی عبادت سے بہتر ہے" "عقلمند کا کھانا جاہل کے روزہ رکھنے سے بہتر ہے" "عقلمند کی خاموشی اور سکون جاہل کی حرکت سے بہتر ہے" نیز خدا نے کوئی پیغمبر مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ پہلے اس کی عقل کو اس طرح کمال کی حد تک پہنچایا کہ اس کی عقل اس کی ساری امت سے زیادہ کامل تھی۔

ہم رسول اکرمؐ کو "عقل کل" کہتے ہیں اور یہ بات مسیحیت کے ذوق کے ساتھ ہرگز مطابقت نہیں رکھتی۔ درحقیقت مسیحیت میں عقل اور دین کا دائرہ الگ الگ ہے جبکہ ہم آنحضرت کو "عقل کل" کہتے اور سمجھتے ہیں۔

اس بنا پر شناخت کے عمل میں عقل کی اصالت یعنی حجیت عقل کے معنی یہ ہیں کہ عقل ایک صحیح معرفت حاصل کرسکتی ہے۔ لہٰذا اسلام اس مطلب کی قطعی طور پر تائید کرتا ہے جو حکماء کے نظریے کا ایک حصہ ہے۔

فلسفیوں کے نقطہ نگاہ کے مطابق انسان کا جوہر فقط اس کی عقل ہے اور باقی سب آلے اور وسیلے اس کے طفیلی ہیں۔ اگر بدن دیا گیا ہے تو یہ عقل کے لیے ایک آلہ ہے۔ اگر آنکھیں دی گئی ہیں، کان دیے گئے ہیں، حافظہ دیا گیا ہے اور تخیل کی قوت دی گئی ہے، غرضیکہ جو قوتیں اور استعدادیں ہمارے وجود میں ہیں، وہ ہماری ذات کے لیے آلے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہماری ذات

عقل ہے۔

کیا ہم اسلام کے حوالے سے اس مطلب کی تائید کر سکتے ہیں؟ نہیں! ہمیں اس بات کی تائید اسلام سے نہیں مل سکتی کہ انسان کا جوہر فقط عقل ہے اور بس۔ بلکہ اسلام ان دوسرے نظریوں کی تائید کرتا ہے جن کے مطابق عقل انسان کا تمام وجود اور تمام ہستی نہیں اور یہ اس کے وجود کی ایک شاخ ہے۔

اب ہم دوسرے مطالب کی جانب آتے ہیں۔

عموماً ہمارے فلسفے کی کتابوں حتیٰ کہ ملا صدرا کی کتابوں میں کہ جنہوں نے ان میں کسی حد تک عارفوں کا ذوق بھی داخل کر دیا ہے۔ یہ بات موجود ہے کہ اسلامی ایمان کی تفسیر فقط "پہچان" سے کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے معنی "پہچان" کے ہیں اور بس۔ یعنی خدا پر ایمان کے معنی خدا کی پہچان کے ہیں، پیغمبر پر ایمان کے معنی پیغمبر کی پہچان کے ہیں، فرشتوں پر ایمان کے معنی فرشتوں کی پہچان کے ہیں اور یوم آخر (معاد) پر ایمان کے معنی بھی معاد کی پہچان کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں ایمان کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے معنی معرفت اور پہچان کے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ اور مراد نہیں ہے۔ تاہم یہ بات کسی بھی وجہ سے اس بات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی جو اسلام کہتا ہے۔ اسلام میں ایمان "پہچان" سے بڑھ کر ایک حقیقت ہے۔ اب آپ اس بات کی طرف توجہ فرمائیں:

پہچاننے کا مطلب جاننا ہے۔ ایک انسان جو آب شناس ہے۔ پانی کو پہچانتا ہے۔ ایک اور شخص جو ستارہ شناس ہے، وہ ستاروں کو پہچانتا ہے ایک اور انسان جو جامعہ شناس ہے، وہ معاشرے کو پہچانتا ہے۔ ایک اور شخص جو

ماہر نفسیات ہے اور وہ لوگوں کی نفسیات کو جانتا ہے۔ ایک اور حیوان شناس ـــــ حیوان کو پہچانتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی متعلقہ چیز کی حقیقت اس شخص پر واضح ہے اور وہ اسے جانتا ہے۔ کیا قرآن میں بھی ایمان کے معنی فقط پہچاننے کے ہیں؟ کیا خدا پر ایمان کے معنی فقط خدا کو سمجھنے کے ہیں۔ کیا پیغمبر پہ ایمان کے معنی فقط ان کو سمجھنے کے ہیں؟ نہیں ـــــ قرآن میں ایمان کا مطلب یہ نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ "پہچان ـــــ ایمان کا رکن اور ایمان کا جزو ہے" اور "پہچان" کے بغیر ایمان ایمان نہیں ہے ـــــ لیکن فقط "پہچان" ہی ایمان نہیں ہے۔ ایمان میلان ہے، ایمان تسلیم ہے۔ ایمان میں میلان کا عنصر، تسلیم کا عنصر، خضوع کا عنصر اور مہر و محبت کا عنصر بھی رچا بسا ہوا ہے لیکن پہچان میں میلان کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ایک شخص کے ستارہ شناس ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ ستارے سے میلان بھی رکھتا ہے۔ نہیں ـــــ وہ فقط ستارے کو پہچانتا ہے۔ ایک شخص کے معدن شناس ہونے کے یہ معنی نہیں کہ معدنیات سے میلان بھی رکھتا ہے۔ ایک شخص کے آب شناس ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ پانی سے میلان بھی رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات انسان ایک ایسی چیز کو پہچانتا ہو جس سے وہ بے حد نفرت کرتا ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سیاست میں اکثر ایک دشمن اپنے دشمن کو اپنے آپ سے زیادہ پہچانتا ہے۔ مثلاً اسرائیل میں ممکن ہے کہ وہ اشخاص مسلمانوں سے زیادہ ہوں۔ جو عرب شناس اور مسلمان شناس ہوں حتیٰ کہ بعض ایک معنی میں اسلام شناس بھی ہوں۔ مسلمہ طور پر اس وقت اسرائیل میں مصر شناس، سوریہ شناس، الجزائر شناس ایران سے کہیں زیادہ موجود ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ایران میں ایک بھی حقیقی مصر شناس نہ ہو، جب کہ اسرائیل کے پاس ایسے سیکڑوں آدمی موجود ہیں لیکن اگر اسرائیل مصر کو پہچانتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس سے میلان رکھتا ہے؟ یا اگر مصر اسرائیل کو پہچانتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس سے میلان رکھتا ہے؟ اتفاقاً معاملہ اس کے برعکس ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔

مسلم علمار کہتے ہیں:

اسلام میں ایمان فقط پہچان نہیں ہے جیسا کہ فلسفی دعویٰ کرتے ہیں اس بات کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے بہترین پہچاننے والوں کے بہترین نمونے بتلائے ہیں اور بہترین پہچاننے والوں کا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ وہ خدا کو اونچے درجے تک پہچانتے ہیں، معاد کو اونچے درجے تک پہچانتے ہیں اور اس کے باوجود وہ پھر کافر ہیں ــــــ مومن نہیں ہیں۔ وہ کون ہیں؟ وہ شیطان ہے! کیا شیطان خدا کو جانتا ہے یا اس شخص کو جو مادہ پرست اور خدا کا دشمن ہے؟ ہاں ــــــ شیطان ہمارے اور آپ کے مقابلے میں خدا کو بہت زیادہ پہچانتا ہے۔ اس نے ہزارہا سال خدا کی عبادت کی ہے۔ کیا شیطان فرشتوں کو پہچانتا ہے یا نہیں پہچانتا؟ انہیں فرشتوں کو جن پر ایمان لانے کا حکم ہمیں قرآن نے دیا ہے۔ جی ہاں ــــــ وہ ہزاروں سال فرشتوں کی صف میں رہا ہے اور وہ ایک ہی درجے میں عمل کرتے رہے ہیں۔ وہ جبرائیل کو مجھ سے اور آپ سے بہت بہتر طور پر پہچانتا ہے۔ پیغمبروں کا معاملہ کیسا ہے؟ کیا وہ پیغمبروں کو پہچانتا اور جانتا ہے کہ یہ پیغمبر ہیں یا ایسا نہیں ہے؟ جی ہاں! وہ سب پیغمبروں کو پہچانتا ہے اور ہم سے بھی بہتر پہچانتا ہے۔

معاد کا معاملہ کیسا ہے؟ جہاں تک معاد کا تعلق ہے وہ خود ہمیشہ خدا سے قیامت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، یوں وہ معاد کو بھی مکمل طور پر پہچانتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود قرآن شیطان کو کیوں کافر قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

۸۰؎ مگر ابلیس نے جو شیخی میں آگیا (سجدہ نہ کیا) اور کافروں میں ہو گیا۔ (سورۂ ص۔ آیت ۷۴)

جیسا کہ فلسفی کہتے ہیں کہ ایمان فقط پہچان ہے تو شیطان کو پہلا مومن ہونا چاہیے لیکن وہ مومن نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسا پہچاننے والا ہے جو جانتا ہے یعنی پہچانتا ہے لیکن اس کے باوجود حق سے دشمنی رکھتا اور مخالفت کرتا ہے۔ وہ جس حقیقت کو پہچانتا ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا، اس کے لیے کوئی میلان اور لگاؤ نہیں رکھتا اور اس حقیقت کی جانب حرکت نہیں کرتا ——
پس ایمان فقط پہچان نہیں ہے۔

۸۱؎ ہم نے انسان کو بہت اچھے انداز سے پیدا کیا، پھر رفتہ رفتہ پست تر حالت کی طرف پھیر دیا مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے۔ (سورۂ تین۔ آیت ۶)

ہمارے بعض حکماء اس آیت مبارکہ کے بارے میں "مگر وہ لوگ جو ایمان لائے" کہتے ہیں کہ یہ حکمت عملی ہے —— تاہم ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ "وہ لوگ جو ایمان لائے" اس میں ایک ایسی چیز ہے جو حکمت نظری سے بالاتر ہے اور حکمت نظری اس کا ایک پایہ ہے اور یہ پوری حکمت، دریافت، علم اور معرفت نہیں ہے، اس میں پہچان سے بالاتر ایک چیز وجود رکھتی ہے جو تسلیم اور میلان ہے۔

پس یہاں تک ہم نے عقلیت پسندوں کے مکتب کے تین مسئلے بیان کیے ہیں:

① عقل حجت ہے، جو چیزیں وہ دریافت کرتی ہے وہ قابل اعتماد ہیں اور وہ صحیح معرفت حاصل کر سکتی ہے۔ (اسلام بھی اس کی تائید کرتا ہے)

② عقل آدمی کا واحد جوہر ہے اور اسلام اس کی تائید نہیں کرتا۔

③ یہ دعویٰ کہ اسلامی ایمان بس عقل کی دریافت، معرفت اور پہچان ہے ــــ اس کے سوا وہ کوئی چیز نہیں، اس کے متعلق بھی ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلام اس کی نفی کرتا ہے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ایمان اصالت رکھتا ہے، ایمان عمل کی تمہید ہے اور کوئی اصالت نہیں رکھتا۔ یہاں ہم اس بات سے قطع نظر کرتے ہیں کہ آیا ایمان کو فقط معرفت سمجھیں یا معرفت کو ایمان کا ایک جزو گردانیں؟ کیونکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ معرفت ــــ ایمان کا جزو ہے۔ ایمان کوئی اصالت رکھتا ہے یا نہیں رکھتا؟ یہاں پھر دو عظیم مکاتب ایک دوسرے کے مقابلے پر صف آرا ہوتے ہیں۔

یہ ہم جو کہہ رہے ہیں کہ ایمان اصالت رکھتا ہے تو اس سے مراد کیا ہے؟

کیا یہ اس نقطۂ نگاہ سے ہے کہ ایمان انسان کے عمل کی اعتقادی بنیاد ہے؟ یعنی اس لحاظ سے کہ دنیا میں انسان کو چاہیے کہ کوشش کرے، سرگرم ہو، جہاد کرے اور ہمیشہ مصروف عمل رہے۔ لیکن ضروری ہے کہ یہ سرگرمی کسی نقشے کی بنیاد پر ہو، اس کا کوئی مقصد ہو، اس میں کوئی ترتیب ہو اور کوئی اعتقادی بنیاد بھی ہو۔ چونکہ انسان بہرحال ایک موجود ہے اور اس کی فعالیت فطری ہے، اس لیے اگر وہ چاہے کہ اس کی زندگی کا ایک لائحہ عمل ہو اور یہ بھی چاہے کہ وہ زندگی میں اپنا مقصد پالے تو یہ ایک فطری اور اعتقادی بنیاد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

پس ضروری ہے کہ اسے ایک فکری اور اعتقادی بنیاد مہیا کی جائے تاکہ وہ اس پر اپنے فکری نظام کی بنیاد رکھ سکے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص ایک عمارت، ایک مکان یا ایک ہال بنانا چاہتا ہو۔ ہال بنانے والے کا مقصد یہی ہے کہ اس کی چار دیواری ہو، چھت ہو اور دروازے ہوں۔ لیکن جو کام زمین کھود کر بنیادوں میں کیا جاتا ہے اور پھر اس پر دیواریں اٹھائی جاتی ہیں اگرچہ وہ ہال بنانے والے کا ہدف اور مقصد نہیں ــــ لیکن اس غرض سے کہ عمارت کھڑی رہے، نہ ہلے اور نہ گرے تو پھر ضروری ہے کہ بنیاد اس طرح تیار کی جائے کہ وہ عمارت مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

آجکل کے اجتماعی مکاتب ــــ مثلاً کمیونزم میں فکری اور اعتقادی اصول موجود ہیں جن کی بنیاد مادیت MATERIALISM پر ہے اور وہ مادیت پر مبنی اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی اصولوں کا ایک ضابطہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک فکری نظام کے نقطہ نظر سے وہ اصول، اعتقادی لحاظ سے اس کی فکری بنیاد ہیں، مگر وہ فکری اصول اس کا ہدف نہیں ہیں۔ درحقیقت مادیت ایک کمیونسٹ کا ہدف نہیں ہے اور وہ اس کے لیے کوئی اصالت نہیں رکھتا۔ بنیادی طور پر وہ لوگ بھی جو مادیت کی گود میں جا گرے ہیں۔ اس کی وجہ وہ احمقانہ مخالفتیں ہیں جو ایک کلیسا نے ان سیاسی، اجتماعی اور خصوصاً آزادی پسندانہ خیالات کے بارے میں کیں۔ اس مذہبی حماقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی دنیا میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ انسان کو چاہیے کہ یا تو وہ خدا کو چھوڑ کر معاشرے میں آزاد اور حقدار بن کر رہے اور اپنے آپ کو حقدار سمجھے یا خدا پر اعتقاد رکھے، ــــ اپنے آپ کو حقدار نہ سمجھے اور اپنے آپ کو آزاد نہ جانے۔ بعد میں آزادی

کی اس منزل کے لیے ایک راستہ تیار کرنے کی خاطر سب سے پہلے مذہب کی بنیاد پر ضرب لگائی گئی۔ ایک کمیونسٹ کے لیے مادیت واقعی کوئی اصالت نہیں رکھتی لیکن وہ سوچتا ہے (اور اس کی یہ سوچ بھی غلط ہے) کہ مادیت کے بغیر ان اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی اصولوں کی کسی طور پر توجیہ نہیں ہو سکتی۔ پس ان کی توجیہ کرنے کے لیے ہم مادیت کے فکری اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

آج کی دنیا میں بہت سے ایسے کمیونسٹ پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے تجربہ کیا اور کہا کہ مادیت ہمارے لیے کوئی اصالت نہیں رکھتی اور ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم صرف کمیونزم چاہتے ہیں تو اہ وہ مادیت کے بغیر ہی کیوں نہ ہو۔ کیا کئی ایک کمیونسٹ ایسے نہیں ہیں جو مذہب کی مخالفت میں رفتہ رفتہ کمی کر رہے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادیت کے فکری اصولوں پر ان کا ایمان کوئی اصالت نہیں رکھتا اور وہ اصول فقط ان کی سوچ کی اعتقادی اور فکری بنیادیں ہیں۔ چونکہ کوئی نظریہ جہاں بینی کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا، اس لیے وہ اپنی جہاں بینی کو اس عمارت کی بنیاد قرار دیتے ہیں تاکہ اس نظریے کے سارے جزئیات جہاں بینی پر منطبق کریں لیکن اس نظریے کے تمام جزئیات کی بنیاد اور ہدف جہاں بینی ہی ہے۔

اسلام میں کیا صورت ہے؟ اسلام میں ایمان —— جو خدا پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، انبیاء و اولیاء پر ایمان اور معاد پر ایمان ہے، کیا اس نے یہ چیزیں فقط اس لیے پیش کی ہیں کہ ان کے ذریعے ایک فکری اور اعتقادی بنیاد فراہم کر کے وہ اپنے اس نظریے IDEOLOGY کو (جو اصلی ہدف بھی ہے) ایک فکری اصول پر استوار کرنا چاہتا ہے اور اس لیے یہ فکری اصول اس لیے دیئے تاکہ وہ بنیاد کا کام دیں۔ ورنہ خود یہ فکری اصول کوئی اصالت نہیں رکھتے؟ یا ایسا ہے

کہ یہ اصول خود اصالت رکھتے ہیں کیونکہ اسلام کے نظریے کی فکری اور اعتقادی بنیاد ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت صرف بنیاد میں ڈالے گئے مواد کی نہیں ہے۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ اگر ایک عمارت کو بنیاد پر کھڑا نہ کیا جائے تو یہ ایک لغو عمل شمار ہوتا ہے۔

اسلام میں ـــــ باوجودیکہ اسلامی ایمان، فکری اور اعتقادی بنیاد ہے اور اسلامی نظریہ اس بنیاد پر استوار ہوا ہے۔ وہ بنیادی حیثیت رکھتے ہوئے بھی اصالت رکھتا ہے یعنی اس بارے میں فلسفی حق پر ہیں کہ ایمان خود اصالت رکھتا ہے اور اس کی حیثیت فقط عمل کے لیے ایک تمہید کی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے عمل ہے، جو کچھ ہے فعالیت ہے اور جو کچھ ہے کوشش ہے لیکن اگر ایمان کو عمل سے الگ کر لیں تو کیا کچھ ہو سکتا ہے؟ نہیں ـــــ اگر ہم ایمان کو عمل سے نکال لیں تو ہم نے ایک ستون گرا دیا اور اسی طرح اگر عمل کو ایمان سے نکال لیں تو بھی ہم نے ایک ستون گرا دیا۔

قرآن ہمیشہ فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے"

یعنی عمل کو منہا کر کے ایمان نیک بختی کا ایک رکن ہے اور اس کا دوسرا رکن عمل ہے۔

نیک بختی کا خیمہ ایک ستون پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ایمان ذاتی قیمت اور اصالت رکھتا ہے اور درحقیقت اس دنیا میں اور بالخصوص دوسری دنیا میں انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ ایمان رکھتا ہو کیونکہ اسلام میں روح واقعی ایک مستقل چیز ہے اور اس کا اپنا کمال ہے۔ روح انسان

کے مرنے کے بعد باقی رہتی ہے اور اگر وہ اپنے کمالات تک نہ پہنچے تو ناقص اور فاسد ہے اور خوش بختی حاصل نہیں کر سکتی۔

آپ قرآن مجید کو دیکھیں کہ وہ ان موضوعات پر کیا فرماتا ہے:

۸۲ اور جو شخص اس دنیا میں (عقل کا) اندھا بنا رہا وہ آخرت میں اندھا اور راستے سے بھٹکا ہوا ہوگا۔

(سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۲)

صاف ظاہر ہے اس آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دنیا میں جس شخص کی ظاہری آنکھیں اندھی ہوں گی وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ابو بصیر جو امام صادق ؑ کے اصحاب میں تھے اور ان کی ظاہری آنکھیں نابینا تھیں، آیا دوسری دنیا میں ان کی حالت خراب ہوگی ؟ نہیں ——— بلکہ اس دنیا میں جس شخص کی باطن کی آنکھیں حقائق دیکھنے کو اور اس چیز کا ادراک کرنے سے جس پر اسے ایمان رکھنا چاہیے (یعنی اپنے خدا اور اس کی نشانیوں کو دیکھنے سے) اندھی ہوں گی وہ اس دنیا میں اندھا اٹھایا جائے گا اور اس کے علاوہ کوئی تغییر ممکن نہیں ہے۔

اگر ہم فرض کریں کہ ایک شخص اس دنیا میں ایمان نہیں رکھتا ——— تاہم اگر اس دنیا کے تمام اچھے کام انجام دیے ہوں، وہ تمام اچھی کوششیں کی ہوں جو انسان کرتا ہے، قرآن کی اصطلاح میں تمام امر بالمعروف انجام دیے ہوں، تمام نہی عن المنکر پر عملدرآمد کیا ہو، اس نے دنیا میں عظیم ترین پرہیزگاروں جیسی زندگی گزاری ہو اور اس نے اپنی زندگی خلق خدا کے لیے وقف کر دی ہو، لیکن اگر وہ خدا کو نہ پہچانتا ہو، عالم ہستی کو نہ پہچانتا ہو اور

معاد و قیامت کو نہ پہچانتا ہو تو وہ اندھا ہے اور بلاشبہ اس دنیا میں بھی اندھا ہو گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایمان اعمال کی تمہید ہے اور جس شخص کے اعمال اچھے ہیں، اگر اس کا ایمان درست نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں ـــــ یہ بات نہیں، بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ ایمان بھی رکھتا ہو۔

۸۳ھ وہ کہے گا الٰہی! میں آنکھ والا تھا، تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا۔ خدا فرمائے گا اس طرح کہ ہماری آیتیں تیرے پاس آئی تھیں، تو انھیں بھلا بیٹھا تھا۔ اسی طرح آج تو بھی بھلا دیا جائے گا۔ (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۱۲۵-۱۲۶)

قیامت کے دن ایک بندہ اندھا اٹھایا جاتا ہے اور وہ اعتراض کرتا ہے کہ اے خدا! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ میں جو دنیا میں آنکھیں رکھتا تھا، یہاں اندھا کیوں ہوں؟

جواب ملتا ہے کہ تو دنیا میں جو آنکھیں رکھتا تھا وہ یہاں کام نہیں آتیں۔ یہاں دوسری آنکھوں کی ضرورت ہے۔ وہ معنوی اور باطنی آنکھیں ہیں جنہیں تم نے دنیا میں اندھا کر لیا تھا اور آج یہاں بھی اندھے ہو۔ اس دنیا میں ہماری نشانیاں موجود تھیں لیکن تو نے بجائے اس کے کہ ہماری نشانیوں کو دیکھتا، ہمیں پہچانتا، حقیقت کو سمجھتا اور عالم حقیقت میں حقیقی بصیرت کے ساتھ آتا ـــــ تو نے اس دنیا میں حقیقت کو نہ سمجھا اور وہاں اپنے آپ کو اندھا کر لیا تھا۔

ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن یہ بھی کہتا ہے:

۸۴ھ بے شک یہ لوگ اس دن اپنے پروردگار کی رحمت سے

الگ تھلگ کر دیے جائیں گے۔ (سورۂ تطفیف - آیت ۱۵)

یہ ان لوگوں کا حال ہے جو اس دنیا میں حق و حقیقت کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے اور ایمان و یقین کی منزل پر نہیں پہنچ پاتے۔

ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اے انسان! تو اس دنیا میں آیا ہے تاکہ تیری آنکھ اس دنیا میں اس دنیا کو دیکھے اور تیرا کان اس دنیا میں اس دنیا کی آواز سنے۔

میں نے کئی بار کہا ہے کہ میں بڑا خوش نصیب ہوں جو دیکھتا ہوں کہ ہمارے جوان نہج البلاغہ کی جانب توجہ رکھتے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ نہج البلاغہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھیں۔ آپ دیکھیں کہ نہج البلاغہ اس قسم کے ناشنوا کانوں سے کیا بات کہتی ہے۔ کیونکہ نہج البلاغہ ایمان کی اصالت کی قائل ہے۔ نہج البلاغہ یہ نہیں کہتی کہ ایمان کی حیثیت فقط فکری اور اعتقادی بنیاد کی سی ہے۔ میں بھی یہ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ بنیاد نہیں ہے، بلکہ بنیادی اور اعتقادی حیثیت کے ساتھ ساتھ یہ ذاتی قیمت بھی رکھتا ہے۔

امام علی علیہ السلام اہل اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

۸۵ھ وہ اسے پکارنے کی وجہ سے عفو و بخشش کی ہواؤں میں سانس لیتے ہوں۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۱۹ صفحہ ۶۰۸)

یہ وہ لوگ ہیں جو اس حالت میں خدا کو پکارتے ہیں، استغفار کرتے ہیں اور استغفار میں محو ہو جاتے ہیں تو اچانک اپنے اندر بخشش کی ٹھنڈی ہوا محسوس کرتے ہیں۔

امام علیؑ مزید فرماتے ہیں:

۸۶ھ بے شک اللہ سبحانہ، نے اپنی یاد کو دلوں کا صیقل قرار دیا ہے جس کے باعث وہ (امر و نہی سے) بہرا ہونے کے بعد سننے لگے اور اندھے ہونے کے بعد دیکھنے لگے اور دشمنی و عناد کے بعد فرمانبردار ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے ہر عہد اور انبیاءؑ سے خالی دور میں رب العزت کے کچھ مخصوص بندے ہمیشہ مخصوص رہے ہیں کہ جن کی فکروں میں وہ سرگوشیوں کی صورت میں (حقائق و معارف کا) القاء کرتا ہے اور ان کی عقلوں سے الہامی آوازوں کے ساتھ کلام کرتا ہے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۱۹۔ صفحہ ۲۰۶)

یعنی وہ ہر دور میں وجود رکھتے ہیں اور کوئی دور ایسا نہیں جس میں وہ موجود نہ ہوں۔ امام علیؑ کے ارشاد کے مطابق وہ ہمارے دور میں بھی وجود رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اندر اور اپنی سوچ کے اندر اپنے خدا کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ فخر رازی کی ایک بڑی پر کشش اور عمدہ رباعی ہے:

ترسم بروم عالم جان نادیدہ
بیرون روم از جہاں، جہان نادیدہ
در عالم جان چوں روم از عالم تن؟
در عالم تن عالم جان نادیدہ

وہ کہتا ہے:

مجھے ڈر ہے کہ میں مر جاؤں گا لیکن میرے دل کی آنکھ کھلی نہ ہوگی۔ میں دنیا

کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا لیکن حقیقت میں اس کو دیکھا ہی نہ ہوگا۔

اس سے رازی کی مراد یہ نہیں کہ اس نے دروازوں اور دیواروں کو نہیں دیکھا یا سمندر اور ستاروں کو نہیں دیکھا، نہیں ـــــ دنیا سے اس کی مراد دنیا کی روح اور دنیا کا مبدا ہے کہ اسلام جسے "ایمان" سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے تن کی دنیا میں روح کی دنیا کو نہیں دیکھا۔ پھر جب میں تن کی دنیا سے روح کی دنیا میں جاؤں گا تو اسے وہاں کیسے دیکھ سکوں گا؟ مجھے چاہیے تھا کہ اسے یہیں دیکھ لیتا لیکن نہیں دیکھ سکا۔

اور جو شخص اس دنیا میں (عقل کا) اندھا بنا رہا، وہ آخرت میں
اندھا اور راستے سے بھٹکا ہوا ہوگا۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۲)

رازی کی جو رباعی اوپر درج ہوئی ہے، وہ اسی آیت کی تشریح کر رہا ہے۔ اس آیت کا تعلق ایمان اور معرفت سے ہے۔ یعنی خدا کی معرفت، خدا کے فرشتوں کی معرفت جو عالم وجود کے واسطے ہیں، خدا کے انبیاء اور اولیاء کی معرفت جو ہماری جانب ایک اور انداز میں خدا کے فیض کا واسطہ ہیں اور اس بات کی معرفت کہ ہم اس دنیا میں آئے ہیں تو کیوں آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ اس بات کی معرفت کہ ہمیں بالآخر اور بہرحال (معاد و قیامت میں) خدا کی جانب لوٹنا ہے اور یہ کہ ہر چیز کو خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ ساری معرفتیں بجائے خود اصالت رکھتی ہیں اور ان حقائق پر ایمان بھی ایک اصالت رکھتا ہے لیکن خود اصالت رکھنے کے ساتھ یہ اسلام کے فکری اور اعتقادی نظریے کی بنیاد بھی ہے اور ایک اصل ایمان کسی نظریے IDEOLOGY کے لیے ایک بہت اچھی فکری اور اعتقادی بنیاد بن سکتا ہے۔ پس کبھی عمل کو ایمان پر

قربان نہ کرو اور ایمان کو بھی عمل پر قربان نہ کرو، گویا ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔

اب مجموعی طور پر فلسفیوں کا مجوزہ کامل انسان ـــــ درحقیقت "کامل انسان" نہیں ہے، بلکہ ایک ناقص انسان ہے یعنی وہ اپنے اندر کمال کا صرف ایک حصہ رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو عقلی کمال کی اصالت کے قائل ہیں، اگرچہ ان کی یہ بات صحیح ہے لیکن انہوں نے انسانی کمالات کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے انسان کے تمام کمالات کو اس کے عقلی کمال میں تلاش کیا ہے۔ اس بنا پر فلسفیوں کا مجوزہ کامل انسان "آدھا کامل" ہے فلسفیوں کا مجوزہ کامل انسان فقط دانائی کا ایک مجسمہ ہے جو فقط عالم ہستی کو جانتا ہے یعنی جو کامل انسان انہوں نے فرض کیا ہے وہ ایک ایسا وجود ہے جو رموز فطرت کو خوب جانتا ہے۔ لیکن شوق، حرکت، حرارت اور صفائے باطن سے یکسر خالی ہے۔ کیونکہ وہ فقط جانتا ہے اور بس! یعنی وہ ایک ایسا وجود ہے جس کا تمام تر کمال یہ ہے کہ وہ خوب جانتا ہے اور وہ بہت خوب جانتا ہے۔ اس کا یہ جاننا ـــــ اس کائنات کو اپنی ذہنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور بقول ان کے وہ ایک وسیع دنیا ہے جو ایک گوشے میں سمٹ گئی ہو تاہم یہ اسلام کا بتایا ہوا کامل انسان نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کی رو سے ایک نیم کامل انسان ہے۔

عقل کی قدر و قیمت اور فلسفیوں کی جانب سے عقل کی تائید کہ جو بجا و درست ہے۔ میں اس کی تائید میں حضرت موسیٰ کاظم ؑ کی روایت نہیں بیان کر سکا۔ لیکن اس موضوع کے تحت بہت زیادہ مطالب ہیں اور اگر ہم اس

اس بارے میں گفتگو کرنا چاہیں تو اس کے لیے مزید ایک یا دو راتیں درکار ہونگی۔
بہرطور آج رات میں اپنی تقریر یہیں ختم کرتا ہوں۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

ساتویں نشست

کامل انسان اور مختلف نظریات (۲)

وہی تو خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول (محمدؐ) بھیجا کہ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا، اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔

(سورۂ جمعہ - آیت ۲)

اس مقدس جلسے میں جو بحث کی جانے والی ہے، یہ اس گفتگو کے تسلسل میں ہے جو چند یوم قبل مسجد جاوید میں کی گئی تھی۔ تاہم مجھے یہ علم نہیں کہ کتنے معزز حاضرین نے ان جلسوں میں شرکت کی اور کتنے شریک نہیں ہوئے۔ لہٰذا ہم یہ بحث اس انداز میں کریں گے کہ جو حضرات ان جلسوں میں شریک نہیں ہوئے وہ بھی اس کا مطلب سمجھ لیں۔ وہاں ایک رات ہم نے مختصر طور پر کامل انسان کے متعلق مختلف مکاتب کے نظریات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا

کہ فلسفیوں کے نقطۂ نظر کے مطابق "کامل انسان" ایک طرح کا ہے، عرفاء کے خیال میں ایک اور طرح کا اور بہت سے جدید فلسفیوں کے نظریے کے مطابق ایک اور طرح کا ہے۔ اس وقت ہم نے مختلف مکاتب کا اجمالی طور پر تعارف کرایا تھا اور ان کے بارے میں تفصیلی بحث ہم بعد میں کریں گے۔ مکتبِ عقل، مکتبِ عشق، مکتبِ محبت، مکتبِ قدرت اور مکتبِ خدمت وغیرہ کے بارے میں میں نے اجمالاً عرض کیا تھا۔ آج رات ہم ان مکاتب میں سے ایک مکتب کے متعلق تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے اور اس مکتب کے مختلف حصوں کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر بیان کریں گے۔

پچھلی نشست میں ہماری بحث مکتبِ عقل یعنی عقلیت پسندوں سے مخصوص تھی لیکن آج کی نشست میں ہماری بحث کامل انسان کے متعلق مکتب عرفان و تصوف کے نقطۂ نظر کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ عرفان و تصوف کے نقطۂ نظر کے مطابق کامل انسان کے بارے میں بحث ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ کامل انسان کے متعلق ارسطو اور ابن سینا وغیرہ جیسے فلسفیوں نے جو کچھ بیان کیا، وہ لوگوں میں قبولیت نہیں پا سکا کیونکہ وہ محض ان فلسفیوں کا ایک قول تھا جو فلسفے کی کتابوں کے متن میں آیا اور پھر وہاں سے باہر نہیں نکلا لیکن مکتب عرفا و تصوف نے کامل انسان کے متعلق اپنا نقطۂ نظر لوگوں کے درمیان نظم و نثر دونوں ذریعوں سے پھیلایا ہے۔ عرفان و تصوف کی کتابیں خواہ وہ نظم میں ہوں یا نثر میں ہوں، وہ ان مطالب کو تمثیل اور شعر کی زبان میں بیان کرتی ہیں۔ فلسفیوں کے مکتب کی طرح یہ مکتب بھی کچھ ایسے قابل قبول مطالب اور مسائل کا حامل ہے جو اسلام کے نقطۂ نظر کے

مطابق قابل قبول ہیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ تنقید و تنقیح سے مبرا نہیں ہیں اور اسلام کا مطلوبہ کامل انسان ـــــ اہل عرفان و تصوّف کے مجوزہ کامل انسان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ فلسفی تنہا عقل کو ہی انسان کی ذات اور جوہر سمجھتے ہیں اور جو چیزیں عقل کے علاوہ ہیں وہ انسان کی ذات سے خارج ہیں اور اس کے لیے صرف وسیلوں اور آلوں کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ انسان کی من، انسان کی سوچنے کی قوت یعنی انسان کی منطقی سوچ بچار ہے۔

عرفاء انسان کی عقل اور انسان کی فکر کو اس کی من (ذات) سمجھتے، بلکہ وہ عقل اور فکر کو انسان کے لیے ایک آلہ خیال کرتے ہیں۔ وہ ہر شخص کی حقیقی من اور ذات اس چیز کو سمجھتے ہیں جسے وہ "دل" کہتے ہیں۔ حکیم اور فلسفی من کو وہ چیز سمجھتا ہے جسے وہ عقل سے تعبیر کرتا ہے اور عارف انسان کی واقعی من اس چیز کو سمجھتا ہے جسے وہ دل سے تعبیر کرتا ہے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک عارف جس چیز کو دل کہتا ہے، اس سے مراد گوشت کا وہ لوتھڑا نہیں جو انسان کی بائیں جانب ہوتا ہے، بلکہ دل سے مراد انسان میں احساس، خواہش اور غور و فکر کا مرکز ہے۔

عارف عشق اور احساس کو بہت اہمیت دیتا ہے جو انسانی احساسات میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ البتہ جس عشق کا عارف ذکر کرتا ہے وہ ہمارے عمومی عشق و محبت سے مختلف چیز ہے۔ جبکہ ہمارا عشق عام طور پر جنسی پہلو رکھتا ہے لیکن ایک عارف کا عشق وہ عشق ہے جو پہلے خدا تک بلند ہوتا ہے، کیونکہ عارف کا حقیقی معشوق خدا ہے۔ علاوہ ازیں جس عشق کا عارف ذکر کرتا ہے وہ صرف عارف تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ عارف کا عقیدہ یہ ہے کہ عشق تمام موجوداتِ عالم

میں رچابسا ہوا ہے۔ عرفانی کتابوں اور بعض فلسفیانہ کتابوں ــــــ مثلاً اسفار میں کہ جس کا جھکاؤ عرفان کی طرف ہے "فی سریان العشق فی جمیع الموجودات" کے تحت ایک مستقل باب نظر آتا ہے۔ یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ عشق ایک ایسی حقیقت ہے جو وجود کے تمام ذرات میں جاری وساری ہے۔ اس ہوا میں بھی عشق ہے اور اس کے علاوہ آپ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ مجاز ہی مجاز ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں مولوی معنوی نے کہا ہے:

عشق بحری است آسمان بروی کفی
چوں زلیخا در ہوای یوسفی

عشق ایک سمندر ہے اور یہ زمین و آسمان سمندر کے جھاگ کی طرح ہے جو پانی سے اس طرح محبت رکھتا ہے، جس طرح زلیخا کو یوسفؑ سے محبت تھی۔
(مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۵۲۰)

حافظ شیرازی کہتے ہیں:

ما در ایں در نہ پی حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بد حادثہ اینجا بہ پناہ آمدہ ایم
رہرو منزل عشقیم ز سرحد عدم
تا بہ اقلیم وجود ایں ہمہ راہ آمدہ ایم

ہم اس دنیا میں دولت اور اقتدار حاصل کرنے نہیں آئے ہیں
تو ایک حادثے کے باعث یہاں پناہ لینے آنا پڑا۔
اصل میں ہم راہ عشق کے مسافر ہیں اور اس کی خاطر ہی عدم سے وجود کے مرحلے تک پہنچے ہیں۔

یہ اشعار کتنے بلند پایہ ہیں ـــــ حافظ کے یہ اشعار صحیفۂ سجادیہ کے ایک جملے کا ترجمہ ہیں۔ جیسا کہ حمد و ثنا کے بعد امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

۸۷۔ خدا نے موجودات کو عدم سے پیدا کیا اور ابداع کیا۔ ابداع کے معنی یہ ہیں کہ اس کے لیے پہلے سے کوئی نمونہ نہ تھا۔ بعد میں اس نے ان موجودات کو اپنی محبت کی راہ پر ڈالا۔ (صحیفۂ سجادیہ۔ دعاء اوّل)

جیسا کہ حافظ شیرازی نے اوپر دی گئی رباعی میں کہا ہے کہ اصل میں ہم راہِ عشق کے مسافر ہیں اور اس کی خاطر ہی عدم سے وجود کے مرحلے تک پہنچے ہیں۔

جب عرفاء یہ کہتے ہیں کہ انسان میں اور تمام دنیا میں ایک سے زیادہ حقیقت کا وجود نہیں ہے اور وہ ایک حقیقت عشق ہے تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر انسان کی حقیقت کیا ہے؟ ایک عارف کسی فلسفی کی مانند یہ نہیں کہتا کہ انسان کی حقیقت "فکر" ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ انسان کی حقیقت اس کا دل ہے اور دل وہی چیز ہے جو عشقِ الٰہی کا مرکز ہے۔ پس یہاں عارف اور فلسفی میں ایک تفاوت ہے اور وہ یہ کہ عرفان میں "من" وہ چیز ہے جو "عشق" کرتی ہے، نہ وہ جو "فکر" کرتی ہے۔

جب انسان ـــــ کامل انسان کے مقام پر پہنچنا چاہے تو فلسفی کے نقطۂ نظر کے مطابق اسے کن ذرائع کے ساتھ جانا چاہیے؟ وہ کہتا ہے منطق کے ساتھ، منطق کے پاؤں کے ساتھ، استدلال کے سہارے کے ساتھ، قیاس کی مدد کے ساتھ، صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب دینے، سوچنے سمجھنے اور ان مقدمات کے نتیجے تک پہنچنے کے ساتھ انسان ـــــ "کامل انسان" کے مرتبے تک جا پہنچتا

ہے لیکن عارف کا نظریہ کچھ اور ہے :

در سر عارف سواد و حرف نیست

جز دل اسپید، ہمچوں برف نیست

عارف کے تصور میں دو حرف (توحید و نبوّت) کے علاوہ

کچھ نہیں ہوتا اور اس کا دل شک و شبہ سے پاک ہوتا ہے۔

عارف ـــــ حرف، سواد، مقدمہ، صغریٰ، کبریٰ، استدلال اور نتیجے وغیرہ کی بات نہیں کرتا اور ان سب باتوں کی بجائے کہتا ہے :

تصفیہ نفس اور اصلاح نفس کرو، برے اخلاق کو اپنے آپ سے دُور کرو اور جہاں تک ممکن ہو غیر حق کی جانب سے اپنی توجہ ہٹاؤ، نیز اپنے خیالات پر زیادہ سے زیادہ قابو پاؤ۔ تمہارے دل میں خدا کے علاوہ جو کسی دوسرے کا خیال آتا ہے وہ دیو (شیطان) ہے۔ پس جب تک دیو وہاں موجود ہے، فرشتہ جو خدا کا نور ہے وہ تیرے دل میں ہرگز نہیں آئے گا۔

حافظ شیرازی کہتے ہیں :

بر سر آنم کہ گر ز دست بر آید

دست بہ کاری زنم کہ غصہ سر آید

خلوت دل نیست جای صحبت اغیار

دیو چوں بروں رود فرشتہ در آید

صحبت احکام، ظلمت شب یلداست

نور ز خورشید جوی گو کہ در آید

بر در ارباب بی مروت دنیا
چند نشینی که خواجہ کی بدر آید
ترک گدائی مکن کہ گنج بیابی
از نظر رہروی کہ در نظر آید

میں اس بات پر آمادہ ہوں کہ ہاتھوں کو کام میں لگائے رکھوں تاکہ غم غلط ہو جائے۔

دل میں دو مخالف جمع نہیں ہوتے اور جب شیطان وہاں سے نکلتا ہے تو پھر فرشتہ آتا ہے۔

اہل عقل کی صحبت اندھیری رات کی طرح ہے۔ تم سورج سے روشنی حاصل کرو کہ جو تمہارے اندر آئے۔

دنیا کے بے مروت امرا کے دروازے پر کب تک بیٹھے دیکھتے رہو گے کہ صاحب کب باہر آتے ہیں۔

جو صاحب نظر سالک ہے اس سے طلب فیض ترک نہ کرو تاکہ تمہیں معرفت کا خزانہ مل جائے۔

ایک انسان کے ـــــ کامل انسان ـــ کے مقام پر پہنچنے کے لیے یہ مکتب جو وسیلہ بتاتا ہے' وہ اصلاح نفس' تصفیہ نفس اور خدا کی جانب توجہ ہے۔ انسان خدا کی طرف جتنی زیادہ توجہ کرے' غیر خدا کی جانب توجہ کو جتنا زیادہ اپنے ذہن سے دور کرے' جتنا زیادہ اپنے آپ کے اندر ڈوب جائے اور باہر سے جتنا زیادہ اپنا رابطہ منقطع کرے' وہ اتنا ہی بہتر طور پر کامل انسان کے بلند مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارف لوگ بحث اور استدلال

کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔

مولوی معنوی نے کہا ہے:

پای استدلالیان چوبیں بود

پای چوبیں سخت بی تمکین بود

اہل منطق کا پاؤں لکڑی کا ہے اور لکڑی کا پاؤں بڑا ہی ناپائیدار ہوتا ہے۔ (مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۵۶)

وہ ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

بحث عقلی گر در و مرجان بود

آں دگر باشد کہ بحث جان بود

بحث جان اندر مقامی دیگر است

بادۂ جان را قوامی دیگر است

عقل و منطق کی بحث اگر موتی اور مونگے کی طرح چمک رکھتی ہو تو بھی روحانی بحث اس سے جدا چیز ہے۔

روح کی بحث کا مقام اور ہے اور اس کی ترکیب کسی اور جوہر سے ہوتی ہے۔ (مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۱۴۱)

اس راستے کی انتہا کیا ہے؟

فلسفی کے راستے کی انتہا یہ تھی کہ اس نے کہا: انسان ایک "دنیا" بن جائے لیکن وہ عقل و فکر کی دنیا ہو، چنانچہ فلسفی نے کہا:

"یہ انسان کے کمال کی انتہا یہ ہے کہ تمام دنیا کا نقش خواہ وہ مبہم ہی کیوں نہ ہو، اس کی عقل کے آئینے میں پڑتا ہے یعنی

وہ دنیا کو اپنے اندر دیکھتا ہے۔

فلسفی کے راستے کی انتہا دانائی اور دنیا کو دیکھنا تھا۔ عارف کے راستے کی انتہا کیا ہے؟

عارف کا کام راستے کی انتہا تک پہنچنا ہے نہ کہ دیکھنا ــــ کہاں پہنچنا؟ حق تک اور ذاتِ حق تک پہنچنا۔ عرفا کا عقیدہ ہے کہ اگر انسان اپنے باطن کی صفائی کرے، عشق کی سواری کے ساتھ حرکت کرے اور راستے کی منزلیں ایک کامل تر انسان کی زیرِ نگرانی طے کرے تو اس راستے کی انتہا یہ ہے کہ اس کے اور ــــ خدا کے درمیان سے حجاب اٹھ جاتا ہے اور خود ان کی تعبیر کے مطابق وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ قرآن میں "لقاء اللہ" کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے لیکن عارف یہ نہیں کہتا کہ میں ایسے مقام پر پہنچ جاؤں کہ جہاں "فکر" کی ایک دنیا بن جاؤں اور وہ آئینہ بن جاؤں کہ ساری دنیا مجھ میں منعکس ہو جائے۔ اس کی بجائے وہ کہتا ہے: میں جا رہا ہوں تاکہ دنیا کے مرکز تک پہنچ جاؤں۔

۸۹ اے انسان! تو اپنے پروردگار کی حضوری کی کوشش کرتا ہے۔ پس تو اس کے سامنے حاضر ہو گا۔

(سورۂ انشقاق۔ آیت ۶)

جب تو ادھر کو چلے اور وہاں پہنچ جائے تو گویا تو نے ہر چیز کو پا لیا۔

۹۰ اللہ کی بندگی ایک جوہر ہے جس کی انتہا آقائی یعنی قدرت و توانائی ہے۔

جب تو وہاں پہنچ گیا تو ہر چیز پا گیا۔ لیکن تو کوئی چیز لینا نہیں چاہتا۔

معمہ یہ ہے کہ تو ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ جہاں ہر چیز تجھے دی جاتی ہے لیکن تو اس (ذات حق) کے سوا کسی چیز کی جانب توجہ نہیں دیتا۔

ابو سعید ابوالخیر نے کیا خوب کہا ہے:

ہر کس کہ تو را شناخت جان راچہ کند
فرزند و عیال و خانمان راچہ کند
دیوانہ کنی و ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہان راچہ کند

اے خدا! جس شخص کو تیری معرفت حاصل ہو جائے اسے جان، مال اور عیال سے کیا سروکار!

تو نے اسے اپنا دیوانہ کر لیا اور پھر اس کو دو جہان پر اختیار دیتا ہے، تیرا دیوانہ بھلا دو جہان کو کیا کرے گا؟

ایک وقت ہوتا ہے جب تو اسے دونوں جہان دیتا ہے لیکن وہ ان کو نہیں چاہتا۔ جس دن تک وہ تجھے نہیں پہچانتا وہ ہر چیز چاہتا ہے لیکن اس وقت تو اسے نہیں دیتا۔ مگر جب وہ تجھے پہچان لیتا ہے اور تو اسے ہر چیز دیتا ہے تو اس وقت وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ جس نے تجھے پہچان لیا اگر تو نے اسے تمام چیزیں بھی بخش دیں تو وہ کسی چیز کی جانب توجہ نہیں دیتا کیونکہ تو دنیا اور آخرت سے بلند تر ہے۔

یہاں اگر ہم چاہیں کہ اس موضوع پر اسلام کا نظریہ بیان کریں کہ آیا یہ چیزیں اسلامی معیارات سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں تو اس کے لیے وقت نہیں ہے لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ عرفا کا مطلوبہ کامل انسان

کیسا ہے۔ وہ ایسا انسان ہے جو خدا تک پہنچتا ہے اور جب وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے تو خدا کے تمام اسماء وصفات کا کامل مظہر بن جاتا ہے اور اصطلاح میں وہ ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں ذات حق ظہور کرتی اور جلوہ دکھاتی ہے۔ جیسے ہم نے مکتب فلسفہ کے بیان میں کہا ہے کہ وہ شخص جسے فلسفی کامل انسان سمجھتے ہیں ـــــ اسلام کے نقطۂ نگاہ کے مطابق نیم کامل ہے، کامل انسان نہیں ہے۔

یہاں ہم اس بارے میں بحث کرنا چاہتے ہیں کہ آیا اسلام میں تہذیب نفس اور تزکیۂ نفس کے نام سے کوئی مسئلہ پیش کیا گیا ہے یا نہیں؟ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کیونکہ یہ قرآن کے متن میں آیا ہے:

۱۹ے جس نے اپنے نفس کو گناہ سے پاک رکھا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گناہ سے دبا دیا وہ نامراد رہا۔

(سورۂ شمس۔ آیت ۹-۱۰)

اس کے بعد قرآن یکے بعد دیگرے گیارہ قسمیں کھاتا اور فرماتا ہے: نجات ان لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے تزکیۂ نفس کیا... اور بدبخت وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفس اور باطن کو فاسد اور تباہ کر دیا ہے۔ آیا اسلام میں تزکیۂ نفس معرفتِ حق کی جانب ایک راستہ ہے یا معرفت کا راستہ فقط دلیل، برہان اور استدلال ہے جو حکماء اور فلسفیوں کا راستہ ہے۔ بلاشبہ اس حد تک تزکیۂ نفس کے راستے کو اسلام کی تائید حاصل ہے۔ رسول اکرمؐ کا ایک ارشاد ہے جسے شیعہ وسنی دونوں نے روایت کیا اور وہ مسلمات میں سے ہے کہ آپ نے فرمایا:

۹۲۔ جو شخص چالیس شب و روز خالص اللہ کی یاد میں رہے تو خدا علم و حکمت کے چشمے اس کے قلب سے اس کی زبان پر جاری کر دے گا۔ (سفینۃ البحار۔ مادہ خلص)

جو شخص چالیس دن رات تک اپنے آپ کو خدا کے لیے خالص کر سکے یعنی چالیس دن رات تک خدا کی رضا کے علاوہ کوئی اور خواہش اس کے وجود پر حاکم نہ ہو۔ چنانچہ وہ خدا کے لیے بولے، خدا کے لیے خاموش رہے، خدا کے لیے دیکھے، خدا کے لیے آنکھیں بند کرلے، خدا کے لیے غذا کھائے، خدا کے لیے غذا چھوڑ دے، خدا کے لیے سوئے اور خدا کے لیے جاگے۔

یعنی اپنا لائحہ عمل اس طرح ترتیب دے کہ سوائے خدا کے کسی دوسری چیز کے لیے قطعاً کوئی کام نہ کرے اور چالیس دن رات تک ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو وہ ابراہیمؑ خلیل اللہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ جن کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

۹۳۔ میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سراسر اللہ کے لیے ہے۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۱۶۲)

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اگر کوئی شخص اس بات میں کامیاب ہو جائے کہ چالیس دن رات تک ہوا و ہوس کو مکمل طور پر رخصت کر دے اور ان ۴۰ دن رات میں کوئی حرکت نہ کرے بجز اس کے کہ وہ خدا کے لیے ہو اور کوئی کام نہ کرے بجز اس کے کہ وہ خدا کے لیے ہو اور اس کی زندگی خدا کے سوا کسی اور کے لیے نہ ہو تو چالیس دن رات کے بعد معرفت اور حکمت کے چشمے اس کے اندر سے ابلتے

اور اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بھی اس علم کو قبول کرتا ہے جسے "علم افاضی" کہتے ہیں۔ یعنی وہ علم جو انسان کے باطن سے ابھرتا ہے جبکہ اس سلسلے میں وہ عقلی علم کو قبول کرتا ہے کیونکہ خود اس کی دعوت دیتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ ؑ سے کہتا ہے:

۹۴ ہم نے اس کو اپنی بارگاہ سے بہرۂ ولایت دیا اور اسے اپنی طرف سے کچھ علم عنایت کیا۔ (سورۂ کہف۔ آیت ۶۵)

ہمارا ایک بندہ ہے، تم جاؤ اور اس سے علم سیکھو۔

یعنی ہم نے اس بندے کو اپنے پاس سے علم عطا کیا ہے یعنی اس نے کسی بشر سے علم نہیں سیکھا بلکہ ہم نے علم کو اس کے اندر اور باطن سے ابھارا ہے۔ چنانچہ اسلامی مباحث میں "علم لدنی" کا کلمہ بھی اسی آیۂ شریفہ سے لیا گیا ہے۔

حافظ شیرازی اپنی مرموز زبان میں حدیث کے معنی بیان کیے ہیں:

شنیدم رہروی در سر زمینی
ہمی گفت این معما با قرینی
کہ ای صوفی شراب آنگاہ شود صاف
کہ در شیشہ بماند اربعینی

میں نے سنا کہ ایک راہگیر اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ اے صوفی! شراب صاف اور تیز ہوتی ہے جبکہ وہ چالیس روز تک صراحی میں پڑی رہے۔

رسول اکرم ؐ نے فرمایا:

۹۵ اگر شیاطین بنی آدم کے دلوں کے ارد گرد حرکت نہ کرتے

اور ان میں غبار اور تاریکی پیدا نہ کرتے تو یہ بنی آدم اپنے دل
کی آنکھ کے ساتھ عالم ملکوت کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔

(معراج السعادۃ۔ صفحہ ۱۱)

آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے:

۹۶۔ اگر تمہارے دل خواہشوں میں نہ کھوئے ہوتے یا تم لمبی
چوڑی باتیں نہ کیا کرتے تو جو میں سنتا ہوں، تم بھی سنتے۔

(مسند احمد حنبل۔ صفحہ ۲۶۶)

اس مضمون کی ایک اور روایت بھی آئی ہے:

۹۷۔ اگر تم لمبی چوڑی باتیں نہ کیا کرتے اور تمہارے دلوں میں
خیالی چمن نہ کھلے رہتے تو تم وہ دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں اور
وہ سنتے جو میں سنتا ہوں۔ (معراج السعادۃ)

یعنی اگر تم زیادہ بولنے والے نہ ہوتے کہ یہ زبان انسان کو بہت نقصان
پہنچاتی ہے۔ نیز اگر تمہارے دل کی حالت ایک باغ جیسی نہ ہوتی کہ جس میں
ہر حیوان چرتا ہے تو جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھ سکتے اور جو میں سنتا ہوں
تم بھی سن سکتے تھے۔ یعنی ان اسرار و رموز کو دیکھنے یا سننے کے لیے انسان کا پیغمبر
ہونا ضروری نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ شخص بھی سن سکتا ہے جو پیغمبر نہ ہو۔
جیسے کہ حضرت مریمؑ سنا کرتی تھیں۔

امام علی علیہ السلام دس سال کے تھے جب وہ رسول اکرمؐ کی خدمت
میں آئے۔ وہ مسجد میں بھی آنحضرتؐ کی ہمراہ تھے اور کوہِ حرا میں بھی ان کے
ہمراہ تھے۔ جب رسول اکرمؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ کی دنیا بدل گئی تھی۔

اس وقت آپ غیب اور ملکوت سے جو آوازیں سن رہے تھے ــــــ وہ علیؑ بھی سن رہے تھے۔ جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں:

۹۸ھ جب آپ پر (پہلے پہل) وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی۔ جس پر میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! یہ آواز کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ شیطان ہے جو اپنے پوجے جانے سے مایوس ہو گیا ہے۔ (اے علیؑ!) جو میں سنتا ہوں تم بھی سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھتے ہو، فرق اتنا ہے کہ تم نبی نہیں ہو، بلکہ میرے وزیر اور جانشین ہو اور تم یقیناً بھلائی کے راستے پر ہو۔

(نہج البلاغہ۔ مفتی جعفر حسین خطبہ۔ ۱۹۰ صفحہ ۵۳۴)

لہٰذا نفس کی صفائی، اخلاص اور ہوا و ہوس کو دور کرنے کا اثر فقط یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں انسان کے قلب کو صاف کرتی ہیں، بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ اور بلند تر اثر رکھتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سے علم اور حکمت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے: ایک دن اصحاب نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم میں نفاق کی کوئی بات تو نہیں! آپ دیکھیے کہ وہ مومن لوگ تھے لیکن انہوں نے اپنے اندر ایک ایسی حالت دیکھی کہ ان کے اندر خوف پیدا ہوا کہ کہیں ہم منافق نہ ہوں اور ہمیں پتہ بھی نہ چلے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: کیوں؟ انہوں نے عرض کیا: اس لیے کہ جب ہم آتے ہیں، آپ کی خدمت میں بیٹھتے ہیں، آپ باتیں کرتے ہیں، وعظ

اور نصیحت فرماتے ہیں، خدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، قیامت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور بتاتے ہیں تو توبہ و استغفار کی بدولت ہم میں ایک بڑی اچھی اور بلند حالت پیدا ہو جاتی ہے لیکن بعد میں جب ہم آپ کے حضور سے رخصت ہوتے ہیں، اپنے بیوی بچوں کے پاس جاتے ہیں اور کچھ ان کے پاس بیٹھتے ہیں تو اچانک دیکھتے ہیں کہ ہماری پہلی حالت لوٹ آتی ہے اور ہم وہی پہلے والے آدمی ہیں۔ یا رسول اللہؐ! کیا یہ نفاق نہیں ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں، یہ نفاق نہیں ہے۔ نفاق دوروئی ہے اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور جس کیفیت میں تم ہو، وہ دو الگ حالتیں ہیں یعنی بعض اوقات انسان کی روح بلند ہوتی اور اوپر جاتی ہے اور بعض اوقات نیچے آجاتی ہے۔ البتہ جب تم میرے پاس ہوتے ہو اور میری باتیں سنتے ہو تو قدرتی طور پر تم میں روح کی بلندی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر فرمایا کہ میرے پاس تم جس حالت میں ہوتے ہو اگر اس حالت پر باقی رہو تو:

> وہ فرشتے آئیں اور تم سے مصافحہ کریں۔ پھر یہ کہ تم پانی کی سطح پر بھی چل سکتے ہو۔ (اصول کافی جلد ۲ باب تنقل احوال قلب)

اگر یہ حالت تم میں ایک ملکہ (فطرت ثانیہ) کی شکل میں باقی رہے تو تم ان مقامات پر پہنچ سکتے ہو۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہماری عرفانی ادبیات جو آجکل دنیا کے ادبی شاہکاروں کا جزو ہیں، ان میں جو خوبی ہے وہ اسلام کی بدولت ہے۔

اب استعمار کے کارندے جو جی چاہے لکھیں، لیکن وہ تمام لطف جو مولوی معنوی میں ہے، حافظ شیرازی میں ہے، سعدی میں ہے اور ناصر خسرو میں ہے، غرض کہ جو لطف و حلاوت ان سب میں ہے وہ اسلام کی بدولت ہے۔

جیسا کہ حافظ نے تصریح کی ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے، قرآن کی بدولت ہے، سعدی شیرازی نے اس صاف باطنی اور غیبی چیزوں کو دیکھنے اور سننے کی قوت کو ایک اور شکل میں حضرت یعقوبؑ کی زبانی اس مطلب کو پیش کیا ہے:

یکی پرسید از آں گم گشتہ فرزند
کہ ای روشن روان پیر خرد مند
ز مصرش بوی پیرہن شنیدی
چرا در چاہ کنعانش ندیدی

حضرت یعقوبؑ کہ جن کے بیٹے حضرت یوسفؑ گم ہو چکے تھے، ایک شخص نے ان سے یہ سوال کیا کہ اے روشن ضمیر بزرگ! آپ نے اپنے بیٹے کی خوشبو مصر سے محسوس کر لی لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ اپنے شہر کنعان کے کنوئیں میں اس کو نہ دیکھ پائے تھے؟

یہ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی داستان ہے، جب مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے اپنا تعارف کرایا اور اپنی قمیص انہیں دی اور کہا کہ یہ لے جاؤ۔ وہ ابھی کنعان پہنچے نہیں تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا:

تلہ یعنی اگر تم مجھے سٹھیایا ہوا نہ سمجھو تو میں یوسفؑ کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ (سورۂ یوسف۔ آیت ۹۴)

خوب! آپ نے ان کی قمیص کی خوشبو مصر سے تو سونگھ لی لیکن کنعان کے کنوئیں سے ان کی خوشبو محسوس نہ کی کہ جہاں آپ خود رہ رہے تھے۔ یہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا؟ آپ نے انہیں کنعان کے کنوئیں ہی میں کیوں نہ دیکھ لیا؟

بہ گفتا حال ما برق جہان است
دمی پیدا و دیگر دم نہان است

حضرت یعقوبؑ نے جواب دیا کہ ہماری حالت کوندتی ہوئی بجلی کی مانند ہے جو لحظہ بھر کے لیے کوندتی ہے اور دوسرے لحظے مند ہو جاتی ہے۔

برقی از منزل لیلیٰ بدر خشید سحر
وہ کہ با خرمن مجنوں دل افکار چہ کرد

صبحدم لیلیٰ کے گھر سے جو بجلی چمکی، اس نے دکھیارے مجنوں کے دل و جان پر کچھ اور ہی اثر ڈالا۔

معنویات میں برق کی یہ تعبیر امیرالمومنینؑ کے لیے بھی ہے، جیسے سعدی شیرازی کے سابق الذکر شعر میں کہا گیا کہ ہماری حالت کوندتی ہوئی بجلی کی مانند ہے، وہ ایک لحظہ کے لیے کوندتی ہے اور دوسرے لحظے میں مند جاتی ہے۔

یہاں تک تو اس سوال کا ذکر تھا جو حضرت یعقوبؑ سے کیا گیا اور وہ جواب جو انہوں نے دیا۔ اس کے بعد سعدی کہتے ہیں:

اگر درویش جائی بماندی
سر و دست از دو عالم برفشاندی

اس وقت درویش کی جو حالت ہوتی ہے اگر وہ باقی رہے تو وہ
دونوں جہان سے بھی اوپر چلا جاتا ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: میرے قرب میں تمہاری جو حالت ہوتی ہے اگر تم اس پر باقی رہو تو:

فرشتے آئیں اور تم سے مصافحہ کریں، پھر یہ کہ تم پانی کی سطح
پر بھی چل سکتے ہو۔

اب ہم ان باتوں کی تائید کے لیے نہج البلاغہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے نوجوان جب نہج البلاغہ میں سے کوئی بات سنتے ہیں تو وہ ان کے دلوں کو زیادہ لگتی ہے اور وہ ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے کئی بار کہا ہے کہ خود نہج البلاغہ بھی امام علی علیہ السلام کی مانند ہے۔ کیونکہ انسان کا کلام خود اس آدمی کی مثل ہوتا ہے۔ کلام انسان کی روح کا نزول ہے اور اس کی روح کی تجلی ہے۔ ایک پست روح کا کلام پست ہوتا ہے اور ایک بلند روح کا کلام بلند پایہ ہوتا ہے۔ ایک یک جہتی روح کا کلام یک جہتی ہوتا ہے اور ایک ہمہ جہتی روح کا کلام ہمہ جہتی ہوتا ہے۔

چونکہ امام علی علیہ السلام ایک جامع الاضداد شخصیت ہیں اس لیے ان کا کلام بھی جامع الاضداد ہے۔ ان کے کلام میں عرفان، عرفان کی روح فلسفہ ـــ فلسفے کی روح آزادی خواہی، آزادی خواہی کی روح شجاعت شجاعت کی روح ـــ اور اخلاق، اخلاق کی روح ہے ـــ مختصر یہ کہ آپ جو صفت بھی دیکھنا چاہیں اس کی مثال خود علیؑ ہیں۔ جیسا کہ آپ اپنے ایک جامع کلام میں سالک کے متعلق فرماتے ہیں:

لئے (سالک) مومن نے اپنی عقل کو زندہ رکھا اور اپنے نفس کو مار ڈالا۔ یہاں تک کہ اس کا ڈیل ڈول لاغر اور تن و توش ہلکا ہو گیا۔ اس کے لیے بھرپور درخشندگیوں والا نور ہدایت چمکا کہ جس نے اس کے سامنے راستہ نمایاں کر دیا اور اسے سیدھی راہ پر لے چلے۔ مختلف دروازے اس کو دھکیلتے ہوئے سلامتی کے دروازہ اور دائمی قرارگاہ تک لے گئے اور اس کے پاؤں بدن کے ٹکاؤ کے ساتھ امن و راحت کے مقام پر جم گئے کیونکہ اس نے اپنے دل کو عمل میں لگائے رکھا اور اپنے پروردگار کو راضی و خوشنود کیا تھا۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۱۷ صفحہ ۵۹۹)

یوں سالک منزل بہ منزل بلند ہونے لگتا ہے۔ حتٰی کہ اس آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے جو سلامتی کی منزل اور اس راستے کی انتہا ہے۔

اس بنا پر کامل انسان کے لیے ان حدود میں پہنچنے تک یہ سوال باقی رہتا ہے وہ ایک سالک انسان ہے یا نہیں؟ کیونکہ کامل انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہو جس نے تہذیب نفس اور تزکیۂ نفس کر لیا ہو۔

اسلام کہتا ہے: ہاں اس سے بھی کچھ بڑھ کر آیا اسلام کا مطلوبہ کامل انسان ـــــ ایک سالک انسان ہے؟ ہاں! وہ اس دروازے سے اس دروازے تک اور اس منزل سے اس منزل تک چلتا ہے۔ حتٰی کہ وہ ایک دروازے تک پہنچتا ہے، جسے باب السلامتہ کہا جاتا ہے۔ آیا خدا سے قرب کی بات درست ہے؟ بلکہ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے

کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ ہاں وہ اپنے خدا کو بغیر کسی حجاب کے دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ پھر وہ ہماری طرح کا نہیں ہونا چاہتا کہ مشہور قول کے مطابق آثار سے مؤثر تک پہنچے۔ جیسا کہ ہم آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تا کہ خدا کا نشان پائیں۔ زمین کی طرف دیکھتے ہیں تا کہ خدا کا نشان پائیں۔ لیکن اس سالک اور کامل انسان کے لیے خدا اس درخت کے پتے اور اس زمین و آسمان سے زیادہ ظہور رکھتا ہے۔

امام حسینؑ بھی یہی فرماتے ہیں:

۱۰۲ـہ الٰہی کیا تیرے سوا کسی اور کا ظہور ایسا ہے کہ جو تیرے لیے نہیں ہے؟ حتیٰ کہ وہ تیرے لیے مظہر ہے۔ کیا تو اس وقت تک پوشیدہ اور اس کا محتاج ہے کہ کوئی راہنما تیری طرف رہنمائی کرے۔ کیا تو اس وقت تک دور ہے کہ کچھ نشانیاں تجھ تک رسائی کرائیں۔ وہ آنکھ اندھی ہو کہ جو تجھے نہیں دیکھتی اور ان نشانیوں پر نظر جمائے رکھتی ہے۔

ایک شخص نے امام علی علیہ السلام سے پوچھا: کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں نے جس خدا کو نہ دیکھا ہو اس کی ہرگز عبادت نہیں کرتا۔ پھر فرمایا: یہ خیال نہ کرنا کہ میں آنکھ سے دیکھنے کی بات کر رہا ہوں اور خدا کسی ایک سمت بیٹھا ہے۔

۱۰۳ـہ اس (خدا) کو آنکھیں ظاہری طور پر نہیں دیکھتیں لیکن دل اسے ایمان کی حقیقتوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

ہیں نے اسے ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ دل کی آنکھ سے دیکھا اور اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

اس حد تک عرفار کے مجوزہ کامل انسان کی اسلام کی جانب سے تائید کی جا سکتی ہے لیکن مکتب عرفان کی طرف سے ایک چیز کی تحقیر کی گئی ہے اور اسلام اس کے ساتھ موافق نہیں ہے۔ عرفان میں علم اور عقل کی بہت تحقیر کی گئی ہے اور اسی دلیل کی بنا پر عرفان کا مجوزہ کامل انسان ــــــ ایک نیم کامل انسان ہے۔

اسلام جہاں دل کو قبول کرتا ہے وہاں عقل کی بھی تحقیر نہیں کرتا، جہاں دل کو قبول کرتا ہے وہاں عشق کو بھی قبول کرتا ہے اور سیر و سلوک کو بھی قبول کرتا ہے ــــــ لیکن وہ عقل، فکر، استدلال اور منطق کی تحقیر کرنے پر ہرگز تیار نہیں اور وہ ان کا بے حد احترام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فروغ اسلام کے بعد کی صدیوں میں ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا کہ جس نے دل اور عقل کو ساتھ ساتھ رکھا ہے۔

چنانچہ شیخ اشراق شہاب الدین سہروردی کا تقریباً یہی راستہ ہے اور ان سے پہلے صدر المتالہین ملا صدرا شیرازی ہیں جو ان لوگوں میں سے ہیں جو قرآن کی پیروی کرتے ہوئے عقل اور دل دونوں راستوں کا احترام کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ بوعلی سینا[1] کی طرح دل کے راستے کی تحقیر کریں اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ بعض عرفار اور صوفیوں کی طرح عقل کی تحقیر کریں بلکہ وہ دونوں راستوں کو محترم شمار کرتے ہیں۔

---

[1] بوعلی سینا نے کچھ مدت کے بعد دل یعنی عشق کے راستے کی تحقیر کا نظریہ ترک کر دیا تھا۔

پس معلوم ہوا کہ اسلام اس بات سے موافق نہیں کہ علم، عقل اور عشق کی تحقیر کی جائے۔ لہذا اس تحقیر کو اسلام کی تائید حاصل نہیں ہے۔ قرآن کا مطلوبہ کامل انسان وہ ہے جس نے عشقی کمال بھی پیدا کیا ہو اور عقلی کمال بھی اس کی شخصیت کا جزو ہو۔

ایک اور مسئلہ جو عرفان کے کامل انسان میں ہے اور اسلام اس کی تائید نہیں کرتا وہ یہ ہے:

عرفان میں انسان کا جھکاؤ فقط اندر کی طرف ہے۔ یعنی باہر کا جھکاؤ اس اندر کے جھکاؤ میں دب گیا ہے۔ اس میں انفرادی پہلو زیادہ نمایاں ہے اور اجتماعی پہلو یوں کہیے کہ تقریباً مٹ گیا ہے یا اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ عرفان کا مجوزہ کامل انسان ایک اجتماعی انسان نہیں ہے، وہ ایک ایسا انسان ہے جو فقط اپنا سر اپنے گریبان میں ڈالے رکھتا ہے اور بس!

لیکن اسلام کا مطلوبہ کامل انسان دل و عشق، سیر و سلوک، علم افاضی و معنوی اور تہذیب نفس کے بارے میں تمامتر باتوں کی تائید کرتے ہوئے اپنے سے باہر بھی جھانکتا ہے، معاشرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ہمیشہ اپنا سر گریبان میں نہیں ڈالے رہتا۔ اگر وہ رات کو اپنا سر گریبان میں ڈالے رہتا ہے اور دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیتا ہے تو دن کے وقت معاشرے کے درمیان سرگرم عمل بھی ہوتا ہے۔

حضرت امام مہدی علیہ السلام کے اصحاب کی تعریف یوں کی گئی ہے اور وہ ہمارے لیے کامل مسلمان اور کامل انسان کے نمونے ہیں۔ ان کے متعلق بعض روایات میں آیا ہے:

؎ وہ رات کے وقت مست راہب اور دن کے وقت شیر نر ہیں۔ (سفینۃ البحار۔ مادہ صحب)

اگر آپ رات کو ان سے ملنے جائیں تو آپ کچھ راہبوں سے ملنے جاتے ہیں جو پہاڑی کی ایک غار میں رہتے ہیں اور انہیں عبادت کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا، لیکن دن کے وقت وہ شیر نر ہوتے ہیں ـــــ یعنی رات کے راہب اور دن کے شیر نر ہیں۔

خود قرآن مجید ان کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے:

؎ یہ لوگ توبہ کرنیوالے، عبادت کرنیوالے، حمد کرنے والے، (باطن ہیں) سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنیوالے، نیک کام کا حکم دینے والے اور برے کام سے روکنے والے ـ اور خدا کی حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (اے رسولؐ!) مومنین کو خوشخبری دیدو۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۱۲)

اس آیت میں توبہ کرنے والے سے سجدے کرنے والے تک تمام پہلو انسان کے باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہ "نیک کام کا حکم دینے والے اور برے کام سے روکنے والے ہیں" گویا باطن کے بعد وہ فوراً ان کے باہمی تعلقات اور معاشرے سے ان کے رابطے کو بیان کرتا ہے۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خدا کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحمدل

ہیں، تو ان کو دیکھے گا کہ رکوع اور سجود میں جھکے خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے خواستگار ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر کثرت سجود سے گھٹے پڑے ہوتے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف توریت میں اور یہی حالات انجیل میں بھی مذکور ہیں۔ وہ گویا کھیتی ہیں جس نے پہلے زمین سے سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا تو وہ موٹی ہوئی۔ تب وہ اپنی جڑ پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور اپنی تازگی سے کسانوں کو خوش کرنے لگی تا کہ ان کی ترقی سے کافروں کو جلائے، جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے خدا نے ان سے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

(سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

رسول اکرمؐ اور آپ کے ساتھی ان لوگوں کے مقابلے میں جو حق اور حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں اور وہ لوگ جو حق اور حقیقت کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں، ان کے خلاف ثابت قدمی اور قوت کے ساتھ ڈٹ جاتے ہیں اور اہل ایمان کے لیے مکمل طور پر محبت، مہربانی، خیر اور رحمت ہیں۔ یہ معاشرے کی جانب ان کے جھکاؤ کا پہلو ہے اور پھر اس معاشرے کی جانب جھکنے والوں کو آپ رکوع کی حالت میں اور سجود کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ جب کہ وہ اپنے خدا سے فراخی مانگ رہے ہوتے ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر قانع نہیں ہیں بلکہ بار بار زیادہ طلب کرتے ہیں اور حق تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں یعنی وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو دنیا جمع کرنا چاہتے ہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں، کیونکہ خدا کی رضا ان کے لیے ہر چیز سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ آپ ان

کے چہروں پر عبادت اور سجدوں کے آثار دیکھتے ہیں۔ یہ ایک اور نقطہ ہے جہاں تصوف کے کامل انسان میں ضعف نظر آتا ہے۔ البتہ مکتب عرفان کے بہت سے پیشرو جو اسلامی تعلیمات کے سخت پابند تھے انہوں نے اس کی جانب توجہ دی اور اپنے کلام میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔ لیکن بعض اوقات اس پہلو میں کم و بیش افراط پیدا ہو گئی اور "اندر" کی جانب جھکاؤ اس حد تک پہنچ گیا کہ "باہر" کی جانب جھکاؤ معدوم ہو گیا ہے، مگر اسلام اس چیز کی تائید نہیں کرتا۔

ایک اور پہلو بھی ہے اور اس کا تعلق "نفس کشی" سے ہے۔ ہماری اسلامی تعبیرات میں "نفس کشی" کا لفظ نہیں ہے۔ اس کی بجائے ہمارے پاس "مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا" کی تعلیم ہے۔ یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ" اس میں تہذیب نفس کی جانب اشارہ ہے اور اس کی غرض نفس کی اصلاح ہے۔ تاہم شعراء کی تعبیروں میں "نفس کو مارنا" اور "نفس کشی" کا ذکر زیادہ آیا ہے۔ اس ضمن میں کچھ دوسرے الفاظ بھی آتے ہیں جن کا مطلب اپنے آپ کو توڑنا اور اپنے آپ کو مارنا ہے۔ چنانچہ ہمارے عرفان میں خود بین نہ ہونے، خود پسند نہ ہونے اور خود خواہ نہ ہونے کے موضوع پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اسلام کا وہ بنیادی نکتہ غفلت کا شکار ہو گیا۔ جسے ہم کرامت نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اس بارے میں کسی حد تک مفصل بحث ہے اور جیسا کہ میں نے تقریر کے شروع میں کہا تھا کہ عرفاء نے کامل انسان کے بارے میں جو بحث کی ہے وہ بڑی شیریں ہے، کیونکہ انہوں نے نظم و نثر کی ادبی زبان میں اپنا نظریہ کھل کر بیان کیا اور پھیلایا ہے، لہٰذا اس کا ہمارے

معاشرے کے مقدر پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر ہم اس بلند پایہ اور عالی قدر انسان یعنی کامل انسان کو ویسا ہی سمجھتے ہیں، جیسا کہ عرفا نے متعارف کرایا ہے۔ پس ضروری ہے کہ جس بلند مرتبہ انسان کو عرفاء نے متعارف کرایا ہے۔ ہم اس کے بارے میں قدرے کھل کر بحث کریں۔

میں نے اس وقت جو گفتگو کی ہے اس کی غرض یہ تھی کہ میں آپ سے عرض کروں کہ یہ ایک اور محور نقطہ ہے۔ انشاء اللہ کل رات میں اس موضوع کے کچھ دوسرے حصوں پر بحث کروں گا۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

آٹھویں نشست

کامل انسان کے بارے میں اسلامی نظریہ

وہی تو خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول (محمدؐ) بھیجا کہ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے، اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔

(سورۂ جمعہ - آیت ۲)

ان راتوں میں ہماری یہ گفتگو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے کامل انسان کو پہچاننے کی ایک کوشش ہے۔

اس سے پیشتر ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان وہ واحد موجود ہے جو اپنی خصوصیت کو چھوڑ سکتا ہے۔ یعنی ہم کوئی ایسا پتھر نہیں لا سکتے جس میں پتھرپن نہ ہو، ہمیں کوئی ایسی بلی نہیں مل سکتی جو بلی پن سے عاری ہو۔ کوئی ایسا کتا نہیں مل سکتا جو کتا پن نہ رکھتا ہو اور کوئی ایسا چیتا نہیں جو چیتاپن نہ رکھتا ہو، بلکہ جو بھی چیتا

دنیا میں آتا ہے وہ اپنی جبلت کی بنا پر وہ خصلتیں رکھتا ہے جنہیں ہم حیوانیت کہتے ہیں لیکن یہ انسان ہے جو انسان کی صفت یعنی انسانیت نہیں رکھتا اور ضروری ہے کہ وہ اسے حاصل کرے کیونکہ انسان کا انسان ہونا اسکے حیوانی پہلو سے مربوط نہیں ہے یعنی وہ صفت جسے قدیم زبان میں انسانیت یا آدمیت کا نام دیا گیا۔ جیسا کہ سعدی نے کہا:

تن آدمی شریف است بہ جان آدمیت
نہ ہمیں لباس زیباست نشان آدمیت

انسان کا جسم اس کی روح کی بدولت محترم ہے اور تنہا یہ مناسب جسم ہی آدمیت کی علامت نہیں ہے۔

مجمل طور پر سبھی جانتے ہیں کہ محض اس لیے کہ انسان ایک زندہ موجود ہے یعنی علم حیاتیات کی رو سے ایک انسان ہے یا علم طب کی رو سے ایک انسان ہے تو یہ اس کو انسان کہنے کی کافی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا آدمی ہونا بجائے خود ایک الگ چیز ہے اور ہر وہ شخص جو ماں کے پیٹ سے آدمی کی صورت لے کر پیدا ہو وہ حقیقی معنوں میں آدمی نہیں ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:

ملا شدن چہ آسان آدم شدن چہ مشکل

عالم دین بن جانا کتنا آسان اور انسان بننا کس قدر مشکل ہے یعنی جیسے انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ عالم بالفعل نہیں بلکہ عالم بالقوۃ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ بالقوۃ انسان ہوتا ہے بالفعل انسان نہیں ہوتا۔ بالآخر بات یہ بنتی ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے ہر شخص کو آدمی بننا چاہیے اور ہر شخص کو انسان بننا چاہیے تو خود یہ انسانیت کیا چیز ہے؟ ایک ماہر علم حیاتیات

انسانیت کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا دنیا کے سخت سے سخت مادہ پرست مکاتب بھی انکار نہیں کرتے، تاہم اسے مادی پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا، اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ انسان خود اپنے لیے معنویت کا دروازہ ہے۔ ان میں سے ایک دروازہ انسان کا وجود ہے جس کے ذریعے وہ عالم معنا تک پہنچ سکتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ مادی مسائل کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں لیکن وہ محسوس نہیں ہوتیں۔ وہ چیزیں موجود ہیں چھوئی نہیں جا سکتیں اور مستقل حیثیت رکھتی ہیں لیکن تجربہ گاہوں میں نہیں ملتیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت ایک ایسی چیز ہے جو علم حیاتیات سے ماوری ہے۔ حتیٰ کہ دنیا کے کٹر مادہ پرست بھی ایسے غیر مادی انسانی امور کے قائل ہیں۔ جنہیں انسانی قدروں کا نام دیتے ہیں۔

لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ اصل انسانی قدروں کو اسلام کی بنیاد پر پہچانیں، یعنی ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اسلام اصل انسانی قدروں کی کیا تعریف کرتا ہے؟

ہم مختلف مکاتب کے خیالات پیش کر کے جب تک ان پر تنقید نہ کر لیں کہ جو حقیقی معنوں میں تنقید ہو، اس وقت تک ہم اس بارے میں اسلام کی پیش کردہ توجیہات کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تنقید فقط اعتراض کرنا نہیں بلکہ صراف کے عمل کی مانند ایک عمل ہے جو ایک صراف کسی سکے کے متعلق انجام دیتا ہے، یعنی وہ اسے کسوٹی پر پرکھتا ہے اور اس کے کھوٹا کھرا ہونے کا پتا چلاتا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ مثلاً اس میں اتنے فی صد خالص سونا، اتنی خالص چاندی ہے اور اتنی ملاوٹ ہے۔ ہماری تنقید کے معنی ان سارے کے سارے نظریات کو رد کرنے کے نہیں ہیں۔ اس کی بجائے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ فلاسفہ، عرفا

اور دوسرے مکاتب نے جو نظریے پیش کیے ہیں، وہ اسلامی معیارات پر کس حد تک پورے اترتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب تک ہم مختلف مکاتب کے خیالات پیش نہ کریں اور ان کا دقیق مطالعہ و تحقیق نہ کریں اس وقت تک ہم اسلام کے نقطۂ نظر کو نہیں سمجھ سکتے۔ بصورت دیگر ہر شخص یہ دعوےٰ کرے گا کہ انسانی قدریں یہ ہیں، وہ ہیں یا ان کے علاوہ کچھ اور ہیں۔ پھر وہ مطمئن بھی ہو گا۔ کیونکہ کوئی شخص اسے یہ کہنے والا نہ ہو گا کہ جناب! یہاں ایک اور چیز بھی ہے یا یہ کیوں ہے اور وہ کیوں نہیں ہے؟ لیکن جب مختلف مکاتب کا مطالعہ کر لیا جائے ان پر تنقید ہو جائے اور انہیں اسلامی معیار پر جانچ لیا جائے تو ہم منطق اور استدلال کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ جناب ـــــ اسلام نے انسان کے بارے میں یہ اور یہ قدریں معین کی ہیں۔ پھر ان حساسیتوں کی بنا پر جن کی اسلام نے اس سلسلے میں خود نشاندہی کی ہے، ہم ان مکاتب کی بنائی ہوئی انسانی قدروں کی فی صد قیمت بتا سکتے ہیں یعنی اس میں کتنے فی صد حقیقت ہے اور اس میں کتنے فیصد! بعض اوقات کچھ لوگ جلدی میں ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: جناب! جہاں تک ہو سکے آپ ہمیں جلدی سے بتائیں کہ اصل اسلامی قدریں کیا ہیں تاکہ ہم انہیں سمجھ لیں لیکن اگر مکاتب کا مطالعہ کیے بغیر ہی انہیں کچھ بتایا جائے تو وہ درست نہیں ہو گا۔ لہٰذا کچھ بتانے سے پہلے ہم دیگر مختلف مکاتب کا مطالعہ کر کے ان پر تنقید کریں گے۔

گزشتہ نشست میں ہماری بحث مکتب عرفان کے بارے میں تھی۔

مکتب عرفان ـــــ حتیٰ کہ اسلامی عرفان کہ جو دوسرے عرفانی نظریوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں اسلامی تعلیمات کا اثر بہت زیادہ ہے اور

کامل انسان کے بارے میں اس کا نظریہ اسلام کے کامل انسان کے بہت نزدیک ہے، لیکن اس کے باوجود بھی وہ تنقید کے قابل ہے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ مکتب عرفان ـــــ "کامل انسان" ـ کے بارے میں قدیم اور جدید مکاتب کے مقابلے میں زیادہ علم رکھتا ہے، پھر بھی یہ تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔

پچھلی نشست میں عرفان کے مطلوبہ کامل انسان پر ہم نے دو میں سے ایک اعتراض کا ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں ہم نے کہا تھا کہ انہوں نے عقل کی بےحد تحقیر کی ہے، بلکہ بعض اوقات وہ عقل کو بے اعتبار ٹھہراتے اور عشق کو عقل سے بالاتر قرار دیتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بقول حافظ:

جناب عشق را درگہ بسی بالاتر از عقل است

جذب عشق کا مقام ــــــ عقل سے بالاتر ہے۔

وہ عقل کی تحقیر کے معاملے میں کبھی کبھی افراط کی حد تک بھی بڑھ گئے ہیں۔ یعنی بنیادی طور پر انہوں نے تعقل، تفکر، منطق، استدلال اور برہان کو سخت بے اعتبار قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ اسے حجاب اصغر کا نام دیا ہے چنانچہ اگر انہوں نے دیکھا کہ ایک حکیم وفلسفی عقل کے راستے سے کسی روحانی مقام پر پہنچ گیا ہے تو وہ اس پر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ اس بارے میں ایک مشہور داستان بھی ہے جو بعض کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔

بوعلی سینا کا زمانہ چوتھی صدی کے آواخر اور پانچویں صدی کے اوائل کا ہے اور اس کی وفات ۴۲۸ ہجری میں واقع ہوئی۔ یہ عظیم مشائی، عقلی اور خشک حکیم ــــــ ایک بہت عظیم عارف، ابوسعید ابوالخیر کا ہم عصر

تھا۔ بوعلی اپنی جائے پیدائش ماوراء النہر (بلخ و بخارا) میں رہا کرتا تھا۔ بعد میں وہ سلطان محمود کے ڈر کے مارے وہاں سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ سلطان اسے اپنے دربار میں لے جانا چاہتا تھا اور وہ اس پر تیار نہ تھا چنانچہ وہ نیشاپور آیا اور وہاں اس نے ابوسعید ابوالخیر سے ملاقات کی۔

کہتے ہیں کہ انہوں نے تین دن، رات ایک دوسرے کے ساتھ خلوت کی اور باہم گفتگو کرتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ نماز با جماعت ادا کرنے کے علاوہ باہر نہیں آتے تھے۔ بعد میں جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور بوعلی سینا وہاں سے چلا گیا تو اس سے پوچھا گیا: تم نے ابوسعید کو کیسا پایا؟ بوعلی سینا نے کہا: جن چیزوں کو ہم عقل کے ذریعے درک کرتے ہیں وہ انکا اپنی آنکھوں کے ذریعے مشاہدہ کرتا ہے اور جب ابوسعید سے سوال کیا گیا کہ تم نے بوعلی سینا کو کیسا پایا؟ تو ابوسعید نے جواب دیا: جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ اندھا بھی اپنی لاٹھی کے سہارے وہاں آجاتا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم جس باطنی مقام پر بھی پہنچے وہ اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا ہمارے پیچھے آتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل عرفان عقل کی بہت زیادہ تحقیر کرتے ہیں ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم قرآن کی منطق کو ایک طرف رکھیں اور عقل کے متعلق عرفان کی منطق کو دوسری طرف رکھیں تو یہ آپس میں میل نہیں کھاتیں۔ عرفان کے مقابلے میں قرآن عقل استعمال کرنے پر زور دیتا ہے اور عقل کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس نے عقل و فکر حتیٰ کہ خالص عقلی استدلال پر تکیہ کیا ہے۔

عرفاء خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی ــــ اپنے سلسلوں کو امیرالمومنین امام علی علیہ السلام سے منسلک کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عرفاء نیز متعصب ترین سنیوں کے نزدیک بھی عرفان کا سلسلہ امام علی علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے

کہ ان کے ساٹھ ستر سلسلوں میں سے فقط ایک سلسلہ ایسا ہے جسے وہ ابوبکر پر ختم کرتے ہیں۔ وہ امام علیؑ کو قطب العارفین سمجھتے ہیں اور بقول ابن ابی الحدید ان عرفاء نے جو کچھ اپنی کتابوں میں لکھا۔ آپ نے نہج البلاغہ میں اسے چار سطروں میں بیان کر دیا ہے لیکن ایک دوسرے مقام پر آپ گویا فلسفی بن جاتے ہیں اور ایسا فلسفیانہ اور عقلی استدلال کرتے ہیں کہ کوئی فلسفی آپ کی گرد تک بھی نہیں پہنچ پاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام علی علیہ السلام ہرگز عقل کی تحقیر نہیں کرتے۔

لہٰذا یہاں اسلام کا مطلوبہ کامل انسان ـــــ عرفان کے مطلوبہ کامل انسان سے اس بنا پر مختلف ہے کہ اسلام کے کامل انسان کے وجود میں عقل ترقی کرتی ہے جب کہ عرفان کا پروردہ کامل انسان عقل کی تحقیر کرتا ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے:

از خود بطلب ہر آنچہ خواہی کہ دہی۔

یعنی جو چیز تو چاہتا ہے کہ تجھے دی جائے، وہ اپنے آپ سے طلب کر۔ اپنے آپ سے طلب کرنے کے معنیٰ ہیں کہ اپنے دل سے طلب کر اور اپنے اندر سے طلب کر!

عرفان ایک ایسا مکتب ہے جس کا جھکاؤ اندر کی طرف ہے اور وہ کہتا ہے کہ "دل سے طلب کر"۔

کیونکہ اس مکتب کے خیال میں "دل" ساری دنیا سے وسیع اور عظیم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ ساری دنیا کو ایک طرف رکھ دیں تو دل، ساری دنیا سے بڑا ثابت ہوگا۔ ان کے نزدیک دل سے مراد وہ روح الٰہی ہے جو ہر انسان میں پھونکی گئی ہے:

۲۹؎ تو جس وقت میں اسکو ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس
میں اپنی طرف سے روح پھونک دوں تو سب کے سب اس کے
سامنے سجدے میں گر پڑنا۔ (سورۂ حجر۔ آیت ۲۹)

وہ دنیا کو انسان صغیر (چھوٹا انسان) اور دل کو انسان کبیر (بڑا انسان)
کہتے ہیں۔ چونکہ وہ دنیا اور دل کو دو مختلف عالم سمجھتے ہیں، اس لیے دنیا کو
عالم صغیر اور دل کو عالم کبیر کہتے ہیں۔ جبکہ ہم اس دنیا کو عالم کبیر کہتے ہیں اور وہ
اسے عالم صغیر کہتے ہیں۔ گویا کہ اہل عرفان کے نزدیک یہ دنیا انسان صغیر ہے اور
انسان کبیر وہ چیز ہے جو آپ کے اندر وجود رکھتی ہے۔

جیسا کہ مولوی معنوی نے کہا ہے:

گر تو آدم زادہ ای چوں او نشین
جملۂ ذرات را در خود ببین
چیست اندر خم کا ندر نہر نیست
چیست اندر خانہ کاندر شہر نیست
ایں جہاں خم است دل چوں نہر آب
ایں جہاں حجرہ است و دل شہری عجاب

اگر تو آدم کا بیٹا ہے تو اسی کی طرح ایک جگہ بیٹھ جا اور دنیا
کی ہر چیز کو اپنے ہی اندر دیکھ لے۔

وہ کیا چیز ہے جو تالاب میں ہے اور دریا میں نہیں یا وہ کیا
چیز ہے جو گھروں میں ہے اور شہر میں نہیں ہے؟

یہ دنیا تالاب اور دل ایک دریا ہے، یہ دنیا گھر ہے اور دل

ایک شہر ہے۔ (مثنوی مولانا روم ۔صفحہ ۳۶۰)

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز گھر میں ہو اور شہر میں نہ ہو۔ جبکہ خود گھر بھی شہر کا ایک جزو ہے۔ پس جو کچھ گھر میں ہے وہ اس کا نمونہ ہے جو شہر میں ہے۔

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز پانی کے تالاب میں ہو اور نہر میں نہ ہو؟ جو کچھ تالاب میں ہے وہ اس چیز کا ایک چھوٹا سا جزو ہے جو دریا میں ہے۔ کیا انسان گھر کی تلاش میں جاتا ہے یا شہر کی تلاش میں؟ ظاہر ہے کہ جس کا گھر شہر میں ہو وہ شہر کی تلاش میں جاتا ہے۔ کیا انسان ایک تالاب اور چھوٹے سے برتن کی تلاش میں جاتا ہے یا دریا کی تلاش میں؟ ظاہر ہے کہ وہ پانی کے ایک چھوٹے سے برتن کی تلاش میں نہیں بلکہ دریا کی تلاش میں جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ عرفان کی بنیاد اندر کی جانب جھکاؤ، دل کی طرف توجہ، باطن کی طرف میلان اور باہر سے قطع تعلقی پر قائم ہے اور حد یہ ہے کہ وہ باہر کی قدر و قیمت کی نفی کرتا ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا ہم اپنے مطلوب یعنی حق کو باہر کی دنیا سے حاصل کر سکیں گے، تو عرفان و تصوف کہتا ہے کہ نہیں! بلکہ اسے اندر ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے:

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد
آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

گوہری کز صدف کون و مکاں بیرون بود
طلب از گمشدگان لب دریا می کرد

بی دلی در ہمہ احوال خدا با او بود
او نمی دیدش از دور خدایا می کرد
مشکل خویش بر پیر مغان بردم دوش
کو بہ تائید نظر حل معمی می کرد
گفتم ایں جام جہان بین بتو کی داد حکیم
گفت آن روز کہ ایں گنبد مینا می کرد
گفت آن یار کز او گشت سردار بلند
جرمش آن بود کہ اسرار ہویدا می کرد

دل نے ہم سے برسوں روشنی طلب کی ہے، جو چیز خود اس کے پاس تھی وہی غیر سے مانگتا رہا۔

وہ موتی جو زمین و آسمان کی حدوں کے پار ہے، دل اس کی طلب ان سے کرتا ہے جو ساحل سمندر پہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔

دل سے ناآشنا شخص کہ خدا ہر وقت اس کے ساتھ تھا، وہ اسے دیکھ نہ سکا اور لے خدا! لے خدا! کہہ کر دور سے پکارتا رہا۔

میں اپنی یہ الجھن لے کر اپنے مرشد کے پاس گیا جو اپنی نگاہ باطن سے ایسی گرہیں کھول دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کو یہ آئینہ کب ملا تھا؟ اس نے کہا جس دن کہ یہ نیلا آسمان بنایا گیا تھا۔

اس نے وہ بات کہی جس سے اس کو سولی پر لٹکا دیا گیا، اس کا جرم یہ تھا کہ راز حقیقت کو فاش کرتا تھا۔

اپنے باطن کی طرف اس توجہ میں عرفان وہاں تک آگے بڑھ گیا ہے، جہاں تک آپ کی سوچ پہنچتی ہے، اس بارے میں مولوی معنوی نے مثنوی کی چھٹی جلد میں ایک تمثیلی داستان بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

ایک آدمی خزانے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ خدا سے دعا کرتا اور کہتا: اے پروردگار! وہ سب لوگ جو دنیا میں آئے ـــــ انہوں نے خزانے جمع کیے اور پھر زمین میں دفن کر دیے۔ ایک وقت وہ دنیا سے خود بھی چلے گئے اور ان کے خزانے زمین کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ اے خدا! ان خزانوں میں سے کسی ایک کا پتہ مجھے بتا دے۔ وہ مدتوں رات سے صبح تک گریہ زاری کرتا رہا۔ آخر کار ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ ایک شخص نے اس سے پوچھا: تم خدا سے کیا چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا: خدا سے خزانہ لینا چاہتا ہوں۔ اس شخص نے کہا: میں خدا کی طرف سے مامور ہوں کہ تمہیں خزانے کا پتہ بتاؤں۔ اس نے کہا: بہت خوب!

پھر اس شخص نے ایک جگہ کی نشاندہی کی اور کہا: تم تیر کمان لے کر فلاں ٹیلے پر جاؤ اور ایک تیر کمان میں جوڑ کر پھینکو۔ تمہارا وہ تیر جہاں جا کر گرے گا وہیں خزانہ دفن ہے۔ جب وہ شخص جاگا اس نے خیال کیا کہ یہ بڑا واضح خواب ہے۔ وہ کہنے لگا: میں ابھی وہاں جاتا ہوں، جو نشانیاں بتائی گئی ہیں یا تو درست ہیں یا درست نہیں ہیں۔ اگر یہ نشانیاں درست ہیں تو پھر میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ چنانچہ وہ گیا ـــــ اس نے دیکھا کہ تمام نشانیاں درست ہیں اور مجھے فقط ایک تیر ہی پھینکنا ہے۔ جہاں وہ تیر گرے گا وہاں سے مجھے خزانہ مل جائے گا۔

وہ دل ہی دل میں کہنے لگا: او ہو! مجھے خواب میں یہ تو بتایا ہی نہیں گیا کہ تیر کس طرف پھینکنا ہے۔ پھر بولا: اس وقت تو میں قبلہ کی سمت کو تیر پھینکتا ہوں' خدا نے چاہا تو خزانہ اسی طرف سے برآمد ہو گا۔ چنانچہ اس نے کمان میں تیر جوڑا اور پوری قوت کے ساتھ قبلہ کی طرف پھینک دیا۔ پھر اس نے یہ دیکھنے کے لیے ادھر نگاہ ڈالی کہ تیر کہاں گرتا ہے۔ اس کے بعد وہ کدال اور بیلچہ لے کر گیا۔ تیر گرنے کی جگہ کو کھودنا شروع کر دیا۔ تاہم اس نے جتنی گہرائی تک کھودا خزانہ نظر نہ آیا۔ تب اس نے سوچا کہ اب مجھے کسی اور طرف تیر پھینکنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اس مرتبہ اس نے شمال کی طرف تیر پھینکا' لیکن خزانہ نہ ملا۔ پھر بڑی دیر تک وہ جنوب مشرق' جنوب مغرب' شمال مشرق' شمال مغرب کی طرف میں تیر پھینکتا رہا۔ لیکن خزانہ کہیں سے بھی نہ ملا۔ وہ شخص اس صورت حال سے ازحد پریشان ہو گیا۔

وہ دوبارہ مسجد میں آیا اور کہنے لگا: اے پروردگار! یہ تو نے میری کیسی رہنمائی کی کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ بعدۂ وہ بڑی مدت تک پہلے کی طرح نالہ و زاری کرتا رہا۔ کچھ عرصہ گزر گیا تو اس نے اسی شخص کو دوبارہ خواب میں دیکھا۔ اس نے اسے سرزنش کی اور کہا کہ تو نے مجھے غلط نشانیاں بتائی تھیں۔ اس نے پوچھا: کیا تمہیں وہ جگہ مل گئی؟ اس نے جواب دیا: ہاں! اس نے پوچھا: پھر تو نے کیا کیا؟ اس نے جواب دیا: میں نے تیر چلّے پر چڑھایا اور پوری قوت کے ساتھ قبلہ کی جانب چلا دیا۔ اس نے کہا: میں نے کب کہا تھا کہ تیر قبلہ کی جانب پھینکنا اور یہ کب کہا تھا کہ کمان قوت کے ساتھ کھینچنا۔ میں نے تیر کھینچنے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ تیر جہاں کہیں

گرے گا ـــــ وہیں سے خزانہ ملے گا۔

دوسرے دن وہ کدال، بیلچہ اور تیر کمان لے کر اس جگہ پہنچا ـــــ تیر کمان میں رکھا اور کہنے لگا: اب دیکھیے کہ تیر کہاں جاتا ہے؟ جب اس نے تیر چھوڑا تو دیکھا کہ وہ اس کے پاؤں کے قریب ہی گرا ہے۔ تب اس نے اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھودی اور اسے معلوم ہوا کہ خزانہ وہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر مولوی معنوی کہتے ہیں:

آں چہ حق است اقرب از حبل الورید
تو فکندی تیر فکرت را بعید
ای کمان و تیرہا بر ساختہ
گنج نزدیک و تو دور انداختہ

حقیقت تو تیری شاہ رگ سے بھی قریب تر ہے اور تو اپنے خیالی تیر ادھر ادھر پھینکتا ہے۔
اے تیر کمان والے شکاری (سالک) خزانہ تیرے نزدیک ہے اور تو دور دور خیال دوڑاتا ہے۔

(مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۵۸۸)

ماضی قریب کے ایک عالم و فاضل کا بیان ہے کہ میں نے یہی داستان ایک واعظ سے پڑھی جو عرفان کا ذوق رکھتا تھا اور اسے مثنوی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس وقت میں یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس قصے کا مطلب کیا ہے؟ میں نے واعظ سے پوچھا: مولوی معنوی، اس داستان میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟ وہ خود بھی اہل حال لوگوں میں سے تھا اور اس نے جواب میں اس

ایک جملے سے زیادہ کچھ نہیں کہا:

۷۔ اور خدا کی نشانیاں خود تمہارے اندر بھی ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ (سورۂ ذاریات ۔ آیت ۲۱)

یعنی مولوی معنوی کہنا چاہتے ہیں: اس خزانے کا نشان خود تمہارے اندر ہے، اس بنا پر اسے اپنے آپ سے طلب کرو۔ دل ایک عجیب شہر ہے ـــــ دنیا ایک مٹکا اور دل نہر ہے ـــــ دنیا ایک گھر ہے اور دل شہر ہے۔ عرفان میں ایسی چیزوں پر غیر معمولی تکیہ کیا گیا ہے۔ یعنی کتب عرفان میں باہر کی دنیا (فطرت) کی بے حد تحقیر کی گئی ہے۔ اہل عرفان کے ہاں فطرت کا تعارف ایک چھوٹی کتاب کے طور پر بھی نہیں کرایا جاتا۔ حالانکہ امیرالمومنین ؑ سے منسوب کلام میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: دنیا عالم اکبر اور انسان عالم اصغر ہے۔

۸۔ تیری دوا تیرے اندر ہے اور تجھے خبر نہیں۔ مرض تیرے ہی پاس سے ہوتا ہے اور تو سمجھتا نہیں۔

تو ایک کھلی کتاب ہے کہ جس سے چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔

کیا تو سمجھتا ہے کہ تو ایک حقیر کیڑا ہے اور تیرے اندر یہ بڑی وسیع دنیا سمٹ کر آگئی ہے۔ (کلام امیرالمومنین علی ؑ)

اب اگر ہم عرفاء کی اس منطق کو قرآن کی منطق کے سامنے رکھیں تو اگرچہ اس میں بہت سے مثبت پہلو موجود ہیں، لیکن از روئے قرآن یہ لنگڑی منطق ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ـــــ فطرت سے اتنی بے اعتنائی

نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے نزدیک آفاق و انفس کی آیات ایک دوسری کے پہلو میں ہیں:

"ہم عنقریب ہی اپنی نشانیاں اطراف میں اور خود ان کے اندر دکھا دیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی یقیناً حق ہے۔" (سورۂ حم سجدہ - آیت ۵۳)

اگرچہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کے لیے بلند ترین اور اعلیٰ ترین معرفت خود اس میں ہے اور اس کے باطن ہی سے ہاتھ آتی ہے۔ تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کے مقابل عام فطرت کی کوئی وقعت ہی نہ ہو۔ کیا فطرت خدا کی نشانی اور خدا کا آئینہ نہیں اور فقط دل ہی خدا کا آئینہ ہے؟ نہیں بلکہ جس طرح دل خدا کا آئینہ ہے، اسی طرح فطرت بھی خدا کا آئینہ ہے۔

یہاں ایک بہت ہی دقیق نکتہ ہے اور اسی کی بنیاد پر میں بالخصوص مکتب عرفان کے بارے میں زیادہ بحث کر رہا ہوں۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ مباحث میں کہا ہے کہ ہماری روحوں کے ساتھ مکتب عرفان کا نسبتاً زیادہ رابطہ رہا ہے کیونکہ فلسفیوں کی باتیں خود ان کے لیے تھیں اور ان کی کتابیں عام لوگوں کو نہیں پڑھائی گئیں یعنی وہ عوام کے ہاتھوں تک نہیں پہنچیں لیکن مکتب عرفان میں جو ذوق ہے، جوش ہے، حرارت ہے اور جو حسن و جمال ہے، اس کی بدولت وہ ہمارے گھر میں نفوذ رکھتا ہے۔ چنانچہ مولوی معنوی ہمارے سب گھروں میں نفوذ رکھتے ہیں، سعدی ہمارے سب گھروں میں نفوذ رکھتے ہیں اور حافظ بھی ہمارے سب گھروں میں نفوذ رکھتے ہیں۔

لہٰذا اس مکتب کی خوبیوں نے انسان کی بہت خدمت کی ہے اور اگر ان لوگوں میں سے چند ایک کے کلام میں کوئی انحراف یا لغزش واقع ہوئی تو

وہ بھی اپنی جگہ بڑا اثر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے مکتب فلسفہ کے مقابلے میں مکتب عرفان پر زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے۔

انسان کا فطرت سے رابطہ

یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہ کیا فطرت سے انسان کا رابطہ ایک بیگانے کا بیگانے سے رابطہ ہے؟ کیا یہ رابطہ سو فیصد بیگانے موجود سے رابطہ ہے؟ حتیٰ کہ اس سے بھی بڑھ کر کیا یہ رابطہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قیدی کا قید خانے سے، ایک پرندے کا پنجرے سے اور یوسفؑ کا چاہ کنعان سے رہا ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ فطرت ہمارے لیے ایک قید خانہ ہے ایک کنواں ہے یا ایک پنجرہ ہے تو پھر اس سے ہمارا رابطہ ـــــ ضد سے ضد کا رابطہ ہوگا۔ اس صورت میں فطرت کے حصار میں ہماری کوشش کیا ہونی چاہیے؟ ہاں پنجرے میں بند پرندے کی کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے نجات دلائے۔ اس کو کسی چیز سے غرض نہیں اور اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ اس پنجرے سے چھٹکارا پائے۔ ایک قیدی کا قید خانے میں سوائے اس کے کوئی کام نہیں کہ اگر ہو سکے تو دیوار توڑ کر بھاگ نکلے۔ یوسفؑ کو کنوئیں میں اس کے علاوہ کسی چیز کا انتظار نہیں تھا کہ کہیں سے کچھ مسافر آئیں اور پانی کے لیے ڈول کنوئیں میں لٹکائیں تو آپ اس کے ذریعے اوپر آجائیں۔ کیا قرآن اور اسلام ـــــ عالم فطرت کے ساتھ انسان کے رابطے کو قیدی اور قید خانے، یوسفؑ اور کنوئیں ـــــ اور پرندے اور پنجرے کا سا رابطہ سمجھتا ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ عرفان میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے۔

سنائی کہتے ہیں:

قفس بشکن چو طاؤسان یکی بر پر برایں بالا

موروں کی طرح پنجرہ توڑ کر ایک دم آسمان پر اڑ جا!

بقول دیگر:

ای یوسفؑ مصر در آی از چاہ

اے ملک مصر کے سلطان یوسفؑ اس کنوئیں سے نکل جا!

لیکن اسلام کی نظر میں عالم فطرت سے انسان کا کسان اور کھیتی جیسا رابطہ ہے۔ ایک سوداگر کا بازار تجارت سے رابطہ ہے اور ایک عابد کا معبد سے رابطہ ہے۔ ایک کسان کے لیے کھیتی ہدف نہیں بلکہ وسیلہ ہے یعنی اس کا گھر تو شہر میں ہے لیکن وہ اس کھیتی سے اپنی خوشی اور خوش بختی کے وسائل حاصل کرتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ وہ اس زمین کو آباد کرے ــــ کھیت پر جائے" ہل چلائے" بیج بوئے اور اگر گندم کے ساتھ گھاس پھونس اگ آئے تو اسے اکھاڑ پھینکے" پھر فصل کاٹے" اسے گاہے اور غلہ گھر لے آئے ــــ یہ ہوتے ہیں اس کے کرنے کے کام!

تاہم اگر ایک کسان اپنی کھیتی کو اپنا گھر سمجھ لے تو یہ اس کی غلطی ہے لیکن پھر بھی کھیتی کے ایک کھیتی ہونے کی بابت اسے غلطی نہیں کھانی چاہیے۔ ایک سوداگر کے لیے بازار کام کی جگہ ہے۔ یعنی وہ جگہ ہے جہاں وہ اپنا سرمایہ لگاتا اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں اضافے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان کے لیے بھی یہ دنیا ایک ایسی ہی چیز ہے۔

جیسا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: "یہ عالم آخرت کی کھیتی ہے۔

حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا:

۱۱۱؎ یہ دنیا دوستانِ خدا کی تجارت گاہ ہے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۱۳۱ صفحہ ۸۴۶)

ایک شخص امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور دنیا کی مذمت کرنی شروع کر دی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ امام علیؑ دنیا کی مذمت کرتے ہیں، لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ دنیا کی کس چیز کی مذمت کرتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دنیا کی ــــــ مثلاً عالم فطرت کی مذمت کرتے ہیں، جو حق پرستی اور حقیقت پرستی کی ضد اور تمام انسانی قدروں کی نفی کے مترادف ہے۔ اس نے کہا: دنیا بری جگہ ہے۔ اس پر امام علیؑ برہم ہوگئے اور فرمایا:

۱۱۲؎ اے دنیا کی برائی کرنے والے اور اس کی غلط سلط باتوں کے دھوکے میں آنے والے! تم اس پر گرویدہ بھی ہوتے ہو اور پھر اس کی مذمت بھی کرتے ہو۔ کیا تم دنیا کو مجرم ٹھہرانے کا حق رکھتے ہو یا وہ تمہیں مجرم ٹھہرائے تو حق بجانب ہے؟

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۱۳۱ صفحہ ۸۴۵)

میں نے اس بارے میں ایک مثل بیان کی ہے اور وہ کچھ اس طرح ہے:

ایک بڑھیا مصنوعی بناؤ سنگھار کے ساتھ آتی ہے اور ایک جوان کو دھوکا دیتی ہے۔ اس کے دانت بھی مصنوعی ہیں اور سر کے بال بھی مصنوعی ہیں۔ لیکن وہ بیچارا خیال کرتا ہے کہ یہ ایک نوجوان عورت ہے۔ پھر اچانک اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ اس کے بعد وہ بڑھیا ــــــ بڑھیا ہی کے روپ میں آکر کہتی ہے:

میری عمر زیادہ ہے۔ میرے منہ میں ایک دانت بھی نہیں، میرے سر کے بال بھی مصنوعی ہیں اور بس، میں ایسی ہوں جیسی نظر آتی ہوں —— کیا تم میرے ساتھ نکاح کرنے کو تیار رہو؟ اگرچہ وہ کہا کرے کہ میرے دانت نہیں ہیں اور میری زلفیں بھی نہیں ہیں لیکن پھر بھی وہ جوان کہے کہ یہ سب قابلِ تعریف باتیں ہیں تو درحقیقت اس عورت نے اسے دھوکا نہیں دیا بلکہ خود اس جوان نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔

امام علیؑ فرماتے ہیں:

جب دنیا نے کوئی چیز مخفی نہیں رکھی تو پھر اس نے تجھے دھوکا کب دیا ہے، کیا دنیا نے تجھے اس دن کا دھوکا دیا جس دن تو نے اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں دفن کیا؟ دنیا کہتی ہے میں جو ہوں سو ہوں اور مجھ میں ثبات نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے، تو مجھے ایسی ہی سمجھ جیسی کہ میں ہوں۔ تو مجھے اس طرح کیوں باور کرنا چاہتا ہے۔ جیسے تو خیال کرتا ہے —— حالانکہ میں ایسی نہیں ہوں، پس دنیا فریب نہیں دیتی۔

جیسا کہ سلسلۂ بیان میں فرمایا: اے انسان ادھر آ کہ حساب کریں ——

آیا تو نے دنیا پر سختی کی ہے یا دنیا نے تیرے ساتھ سختی کی ہے؟ تو خود اس دنیا کو دھوکا دے رہا ہے یا دنیا تجھے دھوکا دے رہی ہے؟ اس نے تجھے کب دھوکا دیا ہے اور کب گمراہ کیا ہے؟ وہ تو ہی ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چل پڑا ہے۔ پھر یہ بھی فرماتے ہیں: دنیا اولیاء اللہ کی تجارت کا بازار ہے اور خدا کے دوستوں کی مسجد ہے۔ اگر مسجد نہ ہو تو کیا عابد عبادت کر سکتا ہے؟ اگر بازار نہ ہو تو کیا سوداگر تجارت کر کے نفع کما سکتے ہیں؟

دنیا انسان کے لیے ایک قید خانہ ہے، کنواں ہے یا پنجرہ ہے اور انسان کا وظیفہ اس پنجرے اور اس کنویں سے باہر نکلنا ہے۔ یہ روح اور نفس کی معرفت اس اصول پر مبنی ہے جسے اسلام قبول نہیں کرتا۔ بلکہ یہ وہی تصور ہے جو ظہور اسلام سے پہلے یونان اور ہندوستان میں موجود تھا۔ وہ اصول یہ ہے کہ انسان کی روح ایک اور دنیا میں پیدا کی گئی اور پھر اسے اس دنیا میں اس طرح لایا گیا جیسے پرندے کو پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اگر بات یوں ہی ہو تو اس کے لیے پنجرے کو توڑنا ایک جائز اور درست عمل ہے۔ لیکن قرآن مجید سورۂ مومنون میں ایک بڑی عجیب تعبیر بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ صدر المتالہین ملا صدرا شیرازی کہتے ہیں:

میں نے روح کے جسمانیۃ الحدوث ہونے اور روحانیۃ البقاء ہونے کا نظریہ اس آیت سے دریافت کیا ہے۔ اس آیت میں انسان کے بارے میں بحث کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

۱۳۱۔ ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔
(سورۂ مومنون۔ آیت ۱۲)

وہ مرحلہ وار پہلے نطفہ بنا، نطفے سے علقہ (جما ہوا خون) علقہ سے مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) بنا، بعد میں ہڈیاں بنیں اور ہڈیوں پہ گوشت چڑھایا گیا، حتیٰ کہ فرمایا گیا:

۱۳۲۔ پھر روح کے ساتھ ہم نے اس کو ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔ (سورۂ مومنون۔ آیت ۱۴)

یعنی ہم نے اسی مادے اور طبیعت کو ایک دوسری چیز ـــــ روح

میں تبدیل کر دیا، گویا کہ روح اسی طبیعت سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر روح مجرد ہے لیکن یہ اس مادے ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ کسی اور جگہ مقیم نہیں تھی کہ وہاں کامل ہوئی اور پھر یہاں پنجرے میں ڈال دی گئی ہو۔ یہاں وہ اپنی ماں کے دامن میں ہے، اس لیے کہ مادہ روح انسان کی ماں ہے۔ چنانچہ جب انسان عالم فطرت میں زندگی بسر کرتا ہے تو وہ اپنی ماں کے دامن میں رہتا ہے۔ لہٰذا اسے یہیں سے بتدریج ترقی کرنی چاہیے نہ یہ کہ اس نے پہلے ہی یہ ترقی کر لی۔ اور اسے قید خانے اور کنوئیں میں ڈال دیا گیا ہو اور پھر کنوئیں سے باہر نکلے۔ یہ اسلام کا تصور نہیں ــــــ بلکہ اسلام کہتا ہے:

۱۱۵۔ پھر ہم نے اسے پست حالت کی طرف پھیر دیا، مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے ....

(سورۂ تین۔ آیت ۶)

اے انسان! تجھے ہمیشہ اپنی ماں (یعنی فطرت) کے دامن میں نہیں رہنا چاہیے۔ اگر تو اپنی فطرت سے بلند نہیں ہوگا اور اوپر نہیں آئے گا تو پھر تو ایک طبعی موجود ہو کر رہ جائے گا۔ ہاں تو پھر ہم نے اسے پست حالت کی طرف پھیر دیا" کا مصداق بن جائے گا" اور "مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے" کے مقام پر نہیں ہوگا ــــــ پست حالت میں رہے گا۔ پس اگر انسان پست حالت ہی میں رہے جو فطرت کی پستی ہے اور اوپر نہ جائے تو دنیا اس کے لیے جہنم بن جاتی ہے:

۱۱۶۔ جس شخص کے نیکی کے پلے بھاری ہوں گے وہ من بھاتے عیش میں ہوگا اور جس کے نیکی کے پلے ہلکے ہوں گے

تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے اور تم کو کیا معلوم کہ ہاویہ کیا ہے،
وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔ (سورۂ قارعہ۔ آیت ۱تا ۱۱)

اگر انسان فطرت کی پستی میں رہے تو اس کی ماں وہی جہنم ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا مولود ہے جسے خدائے تعالیٰ نے اس ماں کے دامن میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ یہ اس کے دامن سے نکلے اور بلند سے بلند تر ہو جائے یعنی وہ ماں کی گود سے نکل کر مدرسے میں جائے اور ترقی کے مختلف مدارج طے کرے۔ اگر یہ ماں کے دامن میں رہ جائے تو ہمیشہ کے لیے ہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو ۲۵ سال کی عمر میں ماں کے دودھ کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔

پس اسلام کی انسان شناسی اور جہان شناسی میں انسان ایک پہلے سے بنا بنایا پرندہ نہیں جو عالم قدس کی فضاؤں میں پرواز کرتا رہا اور پھر اس کو دنیا کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا :

طائر عالم قدسم چہ دہم شرح فراق

میں عالم بالا کا ایک پرندہ ہوں اور اس دنیا میں رہتے ہوئے

اس جدائی کو کس طرح بیان کروں۔

یعنی عالم قدس کا طائر ہونے کے باعث اس کا وظیفہ یہ ہو کہ دنیا کے پنجرے کو توڑ کر عالم قدس میں چلا جائے ____ مگر اسلام اس بات کو قبول نہیں کرتا۔ ہاں آپ نے سنا تو ہو گا کہ عالم ارواح کو عالم اجسام پر برتری حاصل ہے۔ یعنی روح ایک پرتو ہے جس کی پیدائش اسی عالم میں ہوئی۔ لیکن ایک اور پرتو بھی ہے جو عالم بالا سے اس عالم پر چمکا ____ نہ کہ سالم روح ایک اور جگہ پر

تھی اور پھر اس کو دنیا میں لا کر گویا پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہ یکسر ایک ہندی تصور ہے ــــــ یہ نظریۂ تناسخ ہے جو درحقیقت ایک ہندی اور افلاطونی تصور ہے۔

یونانیوں میں افلاطون کا بھی یہ اعتقاد تھا کہ انسان کی روح اس عالم سے پہلے ایک ایسے عالم میں پروان چڑھی جو ایک مثالی عالم ہے۔ پھر کسی مصلحت کے تحت اسے یہاں لا کر قید کر دیا گیا، لہٰذا اسے یہاں سے خلاصی پا کر اسی پہلے عالم میں لوٹ جانا چاہیے لیکن اسلام اس دنیا اور فطرت کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ پھر بھی ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تمام عرفا نے ایسی ہی غلطی کھائی ہے ــــــ نہیں، کیونکہ بزرگ عرفا نے بعض اوقات اپنے کلمات میں اس نکتے کی جانب توجہ دی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو معاشرے کی جانب میلان کو ترک کیا اور نہ فطرت کی جانب سے توجہ ہٹائی ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ قرآن نے آفاق و الفنس کی آیات اور نشانیوں کا ذکر ایک دوسرے کے ساتھ کیا ہے۔ ان بزرگ عرفا نے بھی اس نکتے پر پوری پوری توجہ دی ہے کہ فطرت خدا کا آئینہ ہے، خدا کا جمال ہے اور خدا کے جمال کا آئینہ بھی ہے۔

کیا وہ شبستری ہی نہیں جو اپنی ایک بلند پایہ اور شاہکار نظم میں کہتے ہیں:

بنام آنکہ جان را فکرت آموخت
چراغ جان بنور دل بر افروخت
ز فضلش ہر دو عالم گشت روشن
ز فیضش خاک آدم گشت گلشن

اس خدا کے نام سے (شروع) کرتا ہوں جس نے روح کو فکر و خیال
کی قوت عطا فرمائی اور اسے دل کی روشنی سے چمکایا۔
اس خدا کے فضل سے دونوں جہاں ظاہر و عیاں ہوئے اور
اس کے کرم سے اولاد آدمؑ میں رنگا رنگ پھول کھلے۔
حتیٰ کہ قرآنی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں:

به نزد آنکه جانش در تجلی است
همه عالم کتاب حق تعالی است
عرض اعراب و جوهر چون حروف است
مراتب همچو اعراب و وقوف است

وہ شخص کہ جس کی روح میں نور ہے، ساری دنیا اس کے لیے
خدا کی کتاب ہے۔
اس کے نزدیک دنیا کا باطن حروف، اس کا ظاہر اعراب اور
اشیاء کے مراتب حرکت و وقف کی مانند ہیں۔
اسی ذیل میں جامی فرماتے ہیں:

جهان مرآت حسن شاهد ما است
فشاهد وجهه فی کل مرآت

یہ دنیا ہمارے معشوق حقیقی کے حسن کا آئینہ ہے۔ جیسا کہ ہر
آئینہ میں اس کا رخ زیبا نظر آ رہا ہے۔
اگر ہم قرآن کو ایک طرف اور عرفان کو دوسری طرف رکھ کر دیکھیں
کہ قرآن اور عرفان نے عالم پر کتنی توجہ دی ہے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ عرفان

کے مقابلے میں قرآن نے اس طرف زیادہ توجہ دی ہے اور پھر اس نے نفس اور باطن نفس کی جانب توجہ اور رجوع کے مسئلے کا کسی طرح سے انکار بھی نہیں کیا۔ پس قرآن کا بتایا ہوا کامل انسان عقل اور دل کے ساتھ ساتھ فطرت کی جانب بھی میلان رکھتا ہے۔ ایک اور مسئلہ ترک خودی کا ہے، عرفان دل کو سمجھاتا ہے لیکن اس چیز کو حقیر شمار کرتا ہے جو نفس کے نام سے قرآن میں آئی ہے۔ عرفان کی تبلیغات کا ایک حصہ خودی کا ترک کرنا ہے جو اپنے آپ کی نفی کی طرف اور خود بینی کی نفی کی طرف جاتا ہے۔ یہ بات اپنی ذات کی حد تک درست ہے اور اسلام بھی اس کی تائید کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں دو قسم کی خودیاں اور دو نفس ہیں۔ چنانچہ اسلام جہاں ایک قسم کی خودی کی نفی کرتا ہے اور اسے دباتا ہے وہاں دوسرے قسم کی خودی کو انسان میں زندہ کرتا ہے جو بڑی دقیق چیز ہے۔ ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے انسان کا ایک دوست اور ایک دشمن ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے ہوں۔ اگر ہم اس دشمن کو تیر مارنا چاہیں تو ضروری ہے کہ ہم احتیاط کریں اور دوست کو بچائیں کیونکہ ذرا سی غلطی خطرناک ہو سکتی ہے۔ یہ دو قسم کی خودیاں انسان کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہو سکتی ہیں کہ جذبہ خودی جو پستی کا موجب ہے اسے کوئی ماہر شکاری ہی ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے اور دوسری قسم کی خودی جو تمام انسانی قدروں کی حامل ہے اس کو نقصان سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اسلام کا معجزہ یہ ہے کہ اس نے ہر دو قسم کی خودی کا تعین اتنی دقت سے کیا کہ ان کی پہچان میں کوئی مغالطہ نہیں ہونے پاتا لیکن عرفان میں بعض اوقات یہ تشخیص ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ اسلیے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دشمن خودی کو ضرب

لگانے کی بجائے دوست "خودی" کو ضرب لگاتا ہے یعنی انسان خود قربان ہو جاتا ہے ـــــ وہ چیز قربان ہو جاتی ہے جسے وہ دل اور انسان کہتے ہیں۔ اس طرح بجائے اس کے کہ نفس مارا جائے" یہ بہت ہی دقیق نکتہ ہے اور انشاءاللہ ہم آئندہ نشست میں ان مطالب کے بارے میں اپنا بیان جاری رکھیں گے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِہِ الطَّاھِرِیْن

نویں نشست

کامل انسان اور مختلف نظریات (۳)

"جس نے دنیا میں سر اٹھایا اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، اس کا ٹھکانا تو یقیناً دوزخ ہے۔ مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور اپنے جی کو خواہشوں سے روکتا رہا، تو اس کا ٹھکانا یقیناً بہشت ہے۔"

(سورۂ نازعات۔ آیات ۳۷ تا ۴۱)

مکتب عرفان میں کامل انسان کے بارے میں ایک اہم مسئلہ انسان کا اپنے نفس کے ساتھ رابطہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ایک اسلامی مسئلہ بھی ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ خود خواہی، خود پرستی اور ہوائے نفس کا مقابلہ کرنے کی بات اہل تصوف کی زبان پر بھی ہے اور اسلام کی تعلیمات عالیہ میں بھی موجود ہے بلکہ یہاں اور وہاں کی یہ تعبیر بھی کسی حد تک درست ہے کیونکہ مسلم عرفاء نے ان مسائل میں اسلام ہی سے رہنمائی حاصل کی ہے اور ان کی سبھی

تعبیرات اسلامی ہیں۔ ہم یہاں اس معاملے کے بارے میں ایک وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

"خودی" جسے عربی میں "نفس" کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ نفس کو انسان کے لیے ایک اندرونی دشمن قرار دیا جاتا ہے۔

سعدی کہتے ہیں:

تو با دشمن نفس ہم خانہ ای
چہ در بند پیکار بیگانہ ای

تو اپنے نفس کے ساتھ رہتا ہے جو تیرا دشمن ہے، پھر دوسروں سے جھگڑے کرنے میں کیوں لگا ہوا ہے۔

۱۸؎ یعنی تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ خطرناک خود تمہارا نفس ہے۔ (الحدیث) جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان رہتا ہے۔

سعدی گلستان میں کہتے ہیں:

ایک عارف سے پوچھا گیا: رسول اکرمؐ نے یہ حدیث کس لیے ارشاد فرمائی:
یعنی خود تمہارا نفس، تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا اور خطرناک دشمن ہے۔

اس نے جواب دیا: حضور اکرمؐ نے یہ اس لیے فرمایا کہ اگر تم اپنے کسی دشمن سے نیکی کرو اور جو مانگے اسے دیدو تو وہ تمہارا دوست بن جاتا ہے، سوائے نفس کے کہ تم اس کی جتنی مدارات کرو وہ اتنا ہی زیادہ تمہارا دشمن بن جاتا ہے۔

پس عرفا نے نفس پر ایک دشمن کے طور پر نگاہ ڈالی ہے —— یہ نفس وہی چیز ہے جسے ہم "خودی" "نفس پرستی" یا "خود پرستی" کہتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ "خود خواہی" کہ جسے برا اور ناپسندیدہ کہا جاتا ہے، وہ کیا چیز ہے ؟

خود خواہی کا ایک درجہ اور ایک قسم یہ ہے کہ انسان اپنے محور پر گھومتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف اپنے لیے کام کرتا ہے اور اس کے سارے کام اور کوششیں اپنے لیے ہوتی ہیں اور وہ خود اپنا محور ہوتا ہے۔ صبح سے جب وہ اٹھتا ہے اور کام کاج کرتا ہے تو رات تک اس کی تمام کوششیں اس کی اپنی زندگی کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ اپنے پیٹ کی خاطر سیر ہو کر کھاتا ہے اور اپنے بدن کی حفاظت کے لیے کپڑے پہنتا ہے اور مکان بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس میں رہ سکے۔ اگر انسان اپنے لیے اس حد تک سرگرم عمل ہو تو کیا یہ اخلاق کے خلاف اور ایک اخلاقی گناہ ہے ؟ نہیں ـــــ یہ اخلاق کی ضد بھی نہیں ہے اور کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔

قرآن انسان کے لیے تین مقامات کا قائل ہے۔ ایک "حیوان سے بالاتر" ـــــ دوسرا "حیوان کے ساتھ ہم درجہ" اور تیسرا "حیوان سے کمتر" یعنی حیوانیت کا مقام ہے۔ حیوانیت کی کیفیت میں وہ حیوان کے ساتھ ہم درجہ ہو جاتا ہے ـــــ کبھی وہ اپنے اندر کچھ صفات پیدا کر لیتا ہے تو حیوان سے بلند اور فرشتے سے بالاتر ہو جاتا ہے ـــــ منفی صفات پیدا کر لیتا ہے تو صفر سے نیچے گر کر حیوان سے بھی پست تر ہو جاتا ہے۔ انسان کی اس بلندی اور پستی کے نتیجے میں اس کا کردار بھی تین قسم کا ہوتا ہے۔

حامل اخلاق یعنی حیوان کی حد سے بالاتر

ضد اخلاق یعنی حیوان کے درجے سے پست تر

نہ حامل اخلاق اور نہ ضد اخلاق۔

اگر آپ کو دنیا میں ایک ایسا انسان مل جاتے کہ جو کبوتر یا بھیڑ کی خصلت رکھتا ہو یعنی وہ انسان کہ جس کو فقط اپنی فکر رہتی ہو تو وہ حیوان کی حد میں ہے، اس میں اخلاق نہیں ہے۔ لیکن اس کا طریقہ ضد اخلاق بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہ انسان بس اپنی زندگی کی فکر میں ہوتا ہے اور اپنے پیٹ کو سیر کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ کئی قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں درحقیقت اس کا وہ انسانی مقام آتا ہے جب وہ اپنی حیوانیت کی خدمت کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ اسکی حیوانیت کا نتیجہ خودکشی کی شکل میں نکلتا ہے۔ اگر ایک کبوتر دانہ دنکا جمع کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ سیر ہو جاتے اور یہ ایک عادی فعل ہے۔ ایک گھوڑا اس لیے چرتا ہے کہ وہ سیر ہو جاتے اور یہ بھی ایک عادی فعل ہے۔ اگر ایک انسان بھی اس حد میں رہنا چاہے تو یہ اس کا ایک عادی فعل ہے، یعنی وہ بھی ایک حیوان ہے۔

لیکن ایک ایسا وقت آتا ہے جب انسان ہوائے نفسانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زندگی کے لیے سرگرم عمل ہے۔ بلکہ وہ اس لیے کماتا ہے کہ جمع کرے اور پھر وہ خواہ جتنا بھی جمع کرلے ــــــ کچھ اور بھی جمع کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ جمع کرنے میں اس کی کوئی حد نہیں ہوتی ــــــ اور انسان کی بجائے وہ حرص و ہوا کا پتلا بن جاتا ہے۔ پھر جب وہ چاہتا ہے کہ اس میں سے کسی کو کچھ دے یا احسان کرے تو وہ بخل کا شکار ہو جاتا ہے ــــــ حرص کی طرح بخل بھی ایک بیماری

ہے۔ بخل کی بیماری بڑھتی ہے تو وہ امساک یعنی مال کو روکے رکھنے کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں سورۂ حشر کی نویں آیت میں شحّ (حرص و بخل) کا ذکر آیا ہے اور رسول اکرمؐ کی تعبیر کے مطابق ایسا شخص شحّ مطاع میں مبتلا ہوتا ہے۔
(تحف العقول صفحہ ۴۱)

یعنی اس کی ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ جو اس پر حاکم ہوتی ہے وہ خود یا اس کی فکر یا اس کی عقل یا ارادہ کوئی بھی اس کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ وہی نفسیاتی کیفیت اس پر حاکم ہوتی ہے جس نے اس کی روح پہ دولت کا نقش جما رکھا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت کے علاوہ اس کے عمل میں کسی قاعدے قانون اور عقل و منطق کا بھی کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اس کی عقل اور فکر اپنا کام کرے تو وہ سمجھ جائے کہ یہ خرچ کرنے کا مقام ہے۔ یعنی جان لے کہ اس کی بھلائی، اس کی مصلحت، اس کی منفعت، اس کی خوشی اور اس کی خوش بختی خرچ کرنے میں ہے، لیکن بخل اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی یہ حالت اخلاق کے منافی ہے۔ ایسی حرص اسے حیوان سے پست تر بنا دیتی ہے۔ اسی توقع پر ہم کہتے ہیں کہ اس شخص کی حالت اخلاق کے منافی ہے اور وہ ایک بیمار ہے۔

بات فقط اتنی نہیں ہے کہ انسان کا نفس حرص اور بخل وغیرہ سے دوچار ہو جاتا ہے۔ بلکہ کبھی یہ اپنی اصلیت میں بہت سی پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جو بدنی بیماریوں سے زیادہ پرخطر اور زیادہ مشکل ہو جاتی ہیں۔ یعنی ایسی باتیں جو بنیادی طور پر عقل اور منطق سے سازگار نہیں اور فقط اس بیماری سے مطابقت رکھتی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں آجکل "نفسیاتی مرض"۔

کہا جاتا ہے۔ جیسے حسد کی کیفیت اور یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو عقل و منطق کی ضد ہے۔ یعنی انسان اپنے اندر ایک ایسی حالت پیدا کر لیتا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے۔ تب وہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی خوش بختی کی فکر میں ہو ــــــ ہمیشہ دوسرے کی بدبختی کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ اس کی آرزو یہ نہیں ہوتی کہ وہ خود خوش بخت ہو اور اگر ہوتی ہے تو پھر اس سے دس گنا یہ آرزو بھی ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا بدبخت ہو جائے۔ اب بتائیں کہ یہ چیز کس منطق سے مطابقت رکھتی ہے؟ جبکہ یہ سوچ کسی حیوان میں بھی نہیں ہوتی کہ وہ کسی دوسرے حیوان کی بدبختی کی آرزو رکھتا ہو۔ ایک حیوان کو فقط اپنے پیٹ کی فکر ہوتی ہے اور بس! لیکن وہ انسان کہ جس میں کسی دوسرے انسان کی بدبختی کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان میں تکبر کی کیفیت اور ایسے ہی دوسرے نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ امراض اسکے نفس کے باطن میں یوں چھپے ہوتے ہیں کہ وہ خود بھی ان سے بے خبر ہوتا ہے۔

یہ وہ مشکلات ہیں جو خود انسان کا نفس ہی اس کے لیے پیدا کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہی نفس انسان کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ گویا کہ خود انسان ہی اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے ــــــ پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ انسان خود اپنے اندر سے دھوکا کھاتا ہے۔

قرآن اس کی تعبیر یہ کرتا ہے:

۱۹ یعقوبؑ نے کہا بلکہ یہ بات تم نے اپنے دل سے گڑھ لی، خیر صبر و شکر! مجھے تو خدا سے امید ہے کہ میرے سب بیٹوں کو میرے پاس پہنچائے گا۔ (سورہ یوسف۔ آیت ۸۳)

تسویل (غلط کو ٹھیک کہنا) ایک بے حد دقیق نفسیاتی تعبیر ہے جو قرآن میں آئی ہے۔ یعنی ہر شخص کسی نہ کسی وقت اپنے اندر سے دھوکا کھاتا ہے جب انسان کا نفس کسی چیز کو چاہتا ہے تو اسے انسان کے سامنے اس طرح جلوہ گر کرتا ہے، اس کی آرایش کرتا ہے، اسے زینت دیتا ہے اور اس پر ایسے جھوٹے نقش و نگار بناتا ہے کہ انسان خیال کرتا ہے ـــــ بس ایک چیز ہے جو اسے حاصل کرنی چاہیے۔ ہاں یہ انسان کا باطن ہی ہے جس نے یہ کام کیا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے۔

یہ بڑی عجیب تعبیر ہے ـــــ آجکل جب کہ علم نفسیات نے ترقی کر لی ہے۔ اس علم کے ماہرین نے ان نکات تک بڑی باریکی سے رسائی حاصل کی ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ بعض اوقات انسان دیوانہ ہو جاتا ہے، جبکہ اس کی کوئی اعصابی یا جسمانی وجہ موجود نہیں ہوتی اور وہ کسی باطنی اور نفسیاتی کیفیت سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً بعض اوقات ایک انسان سخت مصائب سے دوچار ہو جاتا ہے اور پھر انسان کی روح اپنے آپ کو ان دکھوں کے کرب سے بچانے کے لیے عقل کو چھٹی دے دیتی ہے۔ چنانچہ یہ علم نفسیات کا ایک اصول ہے۔

جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

ز ہشیاران عالم ہر کہ را دیدم غمی دارد
دلا دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمی دارد

میں نے دنیا کے عاقل لوگوں میں سے ہر ایک کو پریشان پایا ہے۔
اے دل! دیوانہ ہو جا کہ دیوانگی کی بھی اپنی ایک دنیا ہے۔

بہرحال نفس کا مکرو فریب انسان کا دوسرے کے ساتھ مکر کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کے نفس کا خود اس کے ساتھ مکر ہے جو بجائے خود ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔

عرفان میں ان نکات کی جانب اچھی طرح سے توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ یہ آخری دو مسئلے کہ جو انسان کو صد اخلاق کی کیفیت میں داخل کرتے اسے نفسیاتی بیمار بناتے اور حیوان سے بھی پست تر کردیتے ہیں' ان کو بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے ____ حتیٰ کہ ایسے نکات اٹھائے گئے ہیں جو واقعی حیرت انگیز ہیں۔ یعنی آج کا انسان تعجب کرتا ہے کہ ان لوگوں نے چھ سات سو یا ہزار سال پہلے کیونکر وہ دقیق نکتے بیان کیے ہیں۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ علم نفسیات اس بیسویں صدی میں ان کی گہرائی تک پہنچ رہا ہے۔ تاہم یہ بات ہم فخر اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان مسائل میں عرفاء کا مآخذ قرآن ہے اور انھوں نے قرآن ہی سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ المختصر یہ عرفاء با استعداد لوگ ہیں اور انہیں قرآن کا ایک لفظ یا ایک اشارہ بھی ہاتھ لگتا ہے تو وہ اس میں مضمر نکتے کا بڑی عمدگی سے پیچھا کر سکتے ہیں اور اسے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ مثلاً یہاں ہم تسویل کے بارے میں مولوی معنوی سے ایک نکتہ نقل کرتے ہیں۔

آجکل یہ بات مسلم ہے کہ بعض اوقات انسان کے باطنی شعور میں بعض چیزیں یا یوں کہیے کہ بعض شرارتیں بیٹھ جاتی ہیں۔ چونکہ وہ ظاہر نہیں ہوتیں ___ اس لیے انسان کو خود بھی ان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر اگر خاص حالات میں کچھ محرکات پیدا ہو جائیں تو اچانک وہ دیکھتا ہے کہ یہ چیزیں اس کی روح کی گہرائی سے ابھر رہی ہیں۔ اس صورت حال پر انسان خود تعجب کرتا ہے

اور اسے یقین نہیں آتا کہ اس کی روح میں ایسی چیزیں بھی موجود تھیں بعض اوقات انسان اپنے آپ پر نگاہ ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے تو اسے یقین آجاتا ہے کہ اس کے دل میں کوئی کدورت نہیں ہے۔ وہ کسی کے ساتھ کوئی کینہ نہیں رکھتا، کسی سے حسد نہیں کرتا، تکبر نہیں کرتا اور وہ خود بین نہیں ہے لیکن کسی وقت ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اچانک دیکھتا ہے کہ کئی ایک تکبر، غرور، حسد اور کینے اس کی روح کے اندر سے باہر آرہے ہیں جن کی بنیاد کا بھی پتہ نہیں چلتا، پھر جیسا کہ کہا گیا ہے:

نفس اژدرہاست او کی مردہ است

از غم بی آلتی افسردہ است

نفس ایک اژدہا ہے وہ کہاں مرا ہے بلکہ وہ تو موقع نہ ملنے سے پریشان ہو کر گرا ہوا ہے۔ (مثنوی مولانا روم صفحہ ۲۸۹)

مولوی معنوی کہتے ہیں:

انسان کا نفس سانپ کی مثال رکھتا ہے جو سردیوں میں ٹھٹھر جاتا ہے اور اگر انسان ان پر ہاتھ پھیرتا ہے تو بھی وہ حرکت نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ بچے بھی ایک کھلونے کی طرح اس سے کھیلتے رہتے ہیں لیکن وہ ان کو کچھ ضرر نہیں پہنچاتا۔ تب انسان یہ سمجھتا ہے کہ سانپ بالکل رام ہو گیا ہے۔ لیکن جونہی اس پر موسم گرما کی دھوپ پڑتی ہے اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ مولوی معنوی نے یہ بات ایک مفصل داستان میں بیان کی ہے۔

مولوی معنوی نے ایک اور مقام پر یہ بات اس انداز میں کہی ہے کہ تحلیل نفس کے ماہرین حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ وہ انسان کی پوشیدہ اور

سوئی ہوئی خواہشات کے بارے میں کہتے ہیں:

میل ہا ہمچوں سگانِ خفتہ اند
اندر ایشاں خیرو شر بہ نہفتہ اند
چوں کہ قدرت نیست خفتند ایں رده
ہمچو ہیزم پارہ ہا و تن زدہ

نفسانی خواہشیں سوئے ہوئے کتوں کی طرح ہیں کہ ان کی اچھائی برائی چھپی رہتی ہے۔
چونکہ ان کو پورا کرنے کی قوت نہیں ہوتی، اس لیے وہ جلانے کی ٹوٹی پھوٹی لکڑیوں کی طرح اوپر نیچے پڑی رہتی ہیں۔
(مثنوی مولانا روم صفحہ ۲۸۹)

آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض اوقات پانچ دس کتے ایک جگہ سو رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سر پنجوں پر رکھے آنکھیں بند کیے یوں آرام سے سوئے ہوئے ہوتے ہیں کہ انسان سمجھتا ہے "یہ بھیڑ یا بھیڑ کا بچہ ہے جو یوں گہری نیند سو رہا ہے:

تا کہ مرداری در آید درمیان
نفخ صور حرص کوبد بر سگان
چوں دراں کوچہ خری مردار شد
صد سگ خفتہ بداں بیدار شد

جب سوئے ہوئے کتوں کے کہیں قریب مردار آجائے تو ان کی حرص چیخ کر جاگ اٹھتی ہے۔
چنانچہ کسی گلی میں کسی گدھے کا مردار پھینکا جاتا ہے تو اس کے

یسے سیکڑوں کتے جاگ کر آجاتے ہیں۔ (مثنوی حوالۂ سابق)

یعنی اگر اسی اثنا میں ایک جانور کا مردار سامنے آجائے تو آپ دیکھیں گے کہ کتے کتنا غل مچاتے ہیں اور اچھلتے کودتے ہیں۔ ان کی آنکھیں باہر نکلی پڑتی ہیں۔ ان کے حلق سے خور خور کی آواز نکلتی ہے اور ان کے بدن کے تمام بال کھڑے ہو جاتے ہیں، جیسا کہ مولوی معنوی بیان کرتے ہیں:

حرص ہای رفتہ اندر کتم غیب
تا تحقق آورد و سر بر زد ز جیب
مو بموی ہر سگی دندان شدہ
وز برای جیلہ دم جنبان شدہ

جو خواہشیں کہیں دبی پڑی ہوتی ہیں، وقت آنے پر ان میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ تیزی سے ابھر آتی ہیں۔

تب ہر کتے کا ایک ایک بال نوکیلا دانت بن جاتا ہے اور وہ دم ہلا کر مردار کی طرف بڑھتا ہے۔ (مثنوی حوالۂ سابق)

پھر کہتے ہیں:

صد چنین اندرین تن خفتہ اند
چوں شکاری نیست شان بنهفتہ اند

اسی طرح انسان کے بدن کے اندر سینکڑوں خواہشیں دبی پڑی ہیں اور چونکہ شکار نظر میں نہیں ہے اس لیے وہ کتوں کی مانند سوئی ہوئی ہیں۔ (مثنوی حوالۂ سابق)

یہ کتنی بڑی حقیقت ہے! یہاں تک تمام مطالب درست اور بڑے

دقیق ہیں۔ نیز قرآن اور حدیث کے شواہد بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ اس نفس کے خلاف جنگ اور جہاد کرنا چاہیے۔ قرآن مجید بھی فرماتا ہے کہ نفس امارہ کے خلاف جنگ کرنی چاہیے۔

جس نے دنیا میں سر اٹھایا اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دی تھی اس کا ٹھکانا تو یقیناً دوزخ ہے۔ مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور اپنے جی کو خواہشوں سے روکتا رہا، تو اس کا ٹھکانا یقیناً بہشت ہے۔

(سورۂ نازعات۔ آیت ۳۷ تا ۴۱)

ایک اور آیت میں ہے:

۲۰ا۔ بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا کہ جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ (سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۳)

ایک اور مقام پر قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی بیان کرتا ہے:

۲۱ا۔ اور یوں تو میں بھی اپنے نفس کو بے لوث نہیں کہتا ہوں کیونکہ نفس برابر برائی کے لیے اکساتا ہے۔

(سورۂ یوسف۔ آیت ۵۳)

حضرت یوسف اپنے آپ سے مطمئن ہیں جب یہ کہتے ہیں: "نفس برابر برائی کے لیے اکساتا ہے" وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کے نفس کا نظام اتنا پیچیدہ ہے کہ ممکن ہے کسی وقت مجھ سے کوئی بات سرزد ہو جائے کیونکہ کوئی چیز ایسی بھی ہو سکتی ہے جس کو انسان سمجھ نہ پائے۔ لہذا میں کبھی بھی اپنے نفس پر اعتقاد نہیں کرتا تاکہ وہ کہیں شرارت نہ کرنے لگے۔

"جہاد نفس" اسلام کا خاص موضوع ہے۔ جب کچھ صحابہ ایک غزوے سے واپس آئے اور رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان پر نگاہ ڈالی اور فرمایا:

اے آفرین ہے ان لوگوں پر جو چھوٹی جنگ سے واپس آئے ہیں اور ایک بڑی جنگ ابھی ان کے ذمہ ہے۔

(وسائل الشیعہ جلد ۱۱ باب ۱)

صحابہ نے عرض کیا:

یا رسول اللہؐ! بڑی جنگ کیا ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: وہ اپنے نفس کے خلاف جنگ ہے۔

لیکن جہاد نفس یعنی خود خواہی سے جنگ اور خود کو پچھاڑنے کے مرحلے میں ہم عرفان و تصوف کے بزرگوں کے اقوال میں بعض اوقات ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جس کی اسلام تائید نہیں کرتا۔ ایسا ہی ایک مرحلہ سخت ترین ریاضتیں ہیں اور اسلام جب یہاں پہنچتا ہے تو قدم روک لیتا ہے۔ تب اسلام کہتا ہے: تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے۔ رسول اکرمؐ کے کچھ صحابہ بھی ایسی ہی سخت ریاضتیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم آنحضرتؐ نے ان کے اس ارادے کی شدت سے مخالفت فرمائی۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسی سخت ریاضتیں کرتے ہیں جن کی اسلام تائید نہیں کرتا۔

ریاضت اور نفس کے ساتھ جہاد کے مسئلے کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ریاضت کی شکل یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے بدن پر سختی کرتے ہیں۔ بہت ہی کم غذا کھاتے ہیں اور بہت ہی کم سوتے ہیں، یہ ریاضت اہل ہند

ہیں عام ہے۔

(۲) مجاہدہ بالنفس، یہ نفس کی خواہش کے خلاف چلنا ہے۔ ان کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے لیکن ہمیں ہم ایسی چیزیں بھی دیکھتے ہیں جو اسلام کی منطق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں۔ یعنی اسلام کا مطلوبہ کامل انسان ایسا نہیں ہوتا۔

ان میں سے ایک وہ روش ہے جو بعض اہل تصوف کا معمول رہی ہے۔ یہ روش سبھی کی تو نہیں، لیکن اس نے کم و بیش سب پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ اسے "ملامتی روش" کا نام دیا گیا ہے اور یہ ریاکاری کی ضد ہے۔ ریاکار آدمی کا باطن بُرا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو نیک ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ ملامتی روش کا انسان نیک ہوتا ہے لیکن اس غرض سے کہ لوگ اس کے معتقد نہ ہو جائیں' خود کو بُرا ظاہر کرتا ہے۔ یعنی وہ شراب نہیں پیتا لیکن ظاہر کرتا ہے کہ وہ شرابی ہے۔ زنا نہیں کرتا لیکن اس کے طور طریقے ایسے ہوتے ہیں جن سے لوگ یہ سمجھیں کہ وہ فاسق و فاجر ہے۔

وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ وہ جواباً کہتا ہے: میں یہ کام اس لیے کرتا ہوں تاکہ نفس کو ماروں اور نفس حقیقتاً مر جائے۔ ہاں نفس کے ساتھ جنگ کرنا واقعی ایک شدید اور مشکل کام ہے۔ نفس چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کی آبرو ہو، وہ ہر دلعزیز ہو اور لوگ اس پر اعتماد کرتے ہوں لیکن وہ شخص جان بوجھ کر ایسے کام کرتا ہے کہ لوگوں کا اس پر اعتماد قائم نہ ہونے پائے۔ وہ شخص چور نہ ہیں لیکن دکھاوے کا چورپن جانتا ہے اور لوگوں کا مال ایک جگہ سے جا کر چھپا دیتا ہے تاکہ لوگ آئیں اور اسے ڈنڈے ماریں۔ لیکن اگر انہیں پتہ نہیں چلتا

تو وہ ان کا مال دوبارہ اس کی اصلی جگہ پر رکھ دیتا ہے۔ وہ شراب کی بوتل اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا ہے حالانکہ شراب خوار نہیں۔

کیا یہ چیز اسلام کی منطق سے موافقت رکھتی ہے؟ نہیں ـــــ بلکہ اسلام یہ کہتا ہے: بندۂ مومن کا ظاہر اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ یہ حق نہیں رکھتا کہ کوئی ایسا کام کرے جس سے لوگوں کے درمیان اس کے شرف واحترام اور عزت و آبرو پر حرف آئے۔

اسلام یہ بھی کہتا ہے: جب تم نیک نہیں ہو تو ریاکاری نہ کرو اور نیکی کا دکھاوا نہ کرو لیکن بُرائی کا بھی جھوٹا دکھاوا نہ کرو۔ یہ دونوں جھوٹ ہیں اور جھوٹ ایک بُرا عمل ہے۔

عرفانی ادبیات میں بلند اور مقدس مطالب کو فسق و فجور کے الفاظ میں نیز معشوق، شراب اور بانسری کی زبان سے بیان کیا گیا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ عرفاء و صوفیاء اس چیز کا دکھاوا کرنا چاہتے تھے جو ان کے اندر موجود نہ تھی۔

حافظ کے ہاں یہ بات کچھ زیادہ دیکھنے میں آتی ہے حالانکہ بعض اوقات وہ خود کہتے ہیں کہ میں ریاکار نہیں اور ملامتی بھی نہیں ہوں۔

دلا دلالت خیرت کنم بہ راہِ نجات
مکن بہ فسق مباہات و زہد ہم مفروش

اے دل! میں تجھے نجات کا راستہ بتاتا ہوں کہ برائی پر شیخی نہ کر اور اپنی نیکی کا ڈھنڈورا بھی نہ پیٹتا رہ۔

بہر حال ملامتی روش نفس کے خلاف ایک قسم کا صوفیانہ جہاد ہے جسے

اسلام قبول نہیں کرتا۔ اگرچہ تمام صوفیوں کی یہ روش نہیں رہی اور خواجہ عبداللہ انصاری جیسے صوفیوں پر فقط شریعت کے آداب کا غلبہ رہا ہے۔ لیکن ایک گروہ کی یہی روش رہی ہے اور خراسان کے صوفیوں میں زیادہ تر ملامتی ہی گزرے ہیں۔

مکتبِ تصوف میں بعض اوقات نفس کے ساتھ جہاد کے سلسلے میں اپنے آپ کو پست اور ذلیل کر دیا جاتا ہے تاکہ نفس کو رام کر کے برائی پر ابھارنے سے باز رکھا جائے۔ اس طرح نفس یہاں تک لیے پست ہو جاتا ہے کہ ایک ایسے موقع پر جب انسان کو اپنی حیثیت کا دفاع کرنا چاہیے وہ ایسا نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ چیز جسے ہم "عزت مومن" کا نام دیتے ہیں، تصوف کے بعض مکاتب میں اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے سلسلے ہیں کہ جن میں سالک کے لیے اپنے استاد اور شیخ کی خدمت بجا لانا ضروری ہے اور وہ استاد اسے بعض اوقات ایسے کام کرنے کا حکم دیتا ہے جو بہت ہی ذلیل اور پست ہوتے ہیں۔

مثلاً اس پر لازم ہے کہ ایک عرصے تک جانوروں کا گوبر جمع کرتا رہے یا خاکروب وغیرہ کا کام کرے ——— اس کو یاور کرایا جاتا ہے کہ کام تمہارے نفس کو قابو میں لانے کے لیے ضروری ہے۔ بعض حالات میں یہ لوگ نفس کشی کی خاطر ایسے ذلیل کام کرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

ابراہیم ادھم کہ جو تصوف کے مشائخ میں سے ہے۔ وہ ایک شہزادہ تھا۔ پھر قصر شاہی سے بھاگ نکلا اور خلوت، سوگ اور نفس کشی کی حالت میں زندگی

گزارنے لگا۔ ابن ابی الحدید نقل کرتا ہے ابراہیم ادھم نے کہا: میں اپنی ساری زندگی میں اتنا خوش کبھی نہیں ہوا جتنا ان تین مواقع پر ہوا:

(۱) ایک موقع پر میں بحالت بیماری ایک مسجد میں پڑا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ اتنے میں مسجد کا خادم آیا اور اس نے سب کو اٹھا دیا ـــــ میں چونکہ اٹھ نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے میرے پاؤں پکڑے اور ایک لاش کی طرح باہر پھینک دیا۔ اس موقع پر میں بہت خوش ہوا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ میرا نفس جو وہاں بڑائی کا احساس کر رہا تھا، وہاں اس کو خوب رگیدا اور ذلیل کیا گیا۔

(۲) دوسرا موقع وہ ہے جب کہ ہم لوگ ایک کشتی پر سوار تھے کشتی میں ایک مسخرا بھی تھا جو لوگوں کا دل بہلانے کے لیے نقلیں کر رہا تھا۔ لوگ کشتی میں بیٹھے تھے اور اس مسخرے نے انہیں ہنسی مذاق میں لگا رکھا تھا۔ پھر اس نے اچانک کہا: جی ہاں ـــــ فلاں جگہ ایک کافر تھا۔ میں وہاں گیا اور جاتے ہی اس کی ڈاڑھی پکڑ لی اور اسے گھسیٹا۔ یہ کہہ کر اس نے مجلس پر نگاہ ڈالی ـــــ وہ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جو تختۂ مشق کا کام دے اور وہ اسے عملی مظاہرہ کا وسیلہ بنائے۔ تب اس کو کشتی میں مجھ سے زیادہ گھٹیا آدمی کوئی نظر نہ آیا ـــــ اس نے آکر میری ڈاڑھی پکڑ لی اور مجھے گھسیٹا۔ اس پر کشتی میں موجود سب لوگ ہنسنے لگے اور میں بھی بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس طرح میرے نفس کی خوب پٹائی ہو گئی۔

(۳) تیسرا موقع وہ ہے، جب کہ میں گرمیوں کے موسم میں ایک جگہ بیٹھا

تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری پوستین میں اتنی زیادہ جوئیں تھیں کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس میں جوئیں زیادہ ہیں یا پشم زیادہ ہے۔ یہ بھی ایک ایسا موقع تھا کہ جب میں بہت خوش ہوا کہ میرے نفس کو اپنی ذلت نظر آگئی۔ بلاشبہ یہ نفس کے خلاف جنگ اور جہاد ہے لیکن یہ ایسا جہاد بالنفس ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ کیوں؟

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنے آپ کو یوں ذلیل کرے۔ وہ مسخرہ لوگوں کو ہنسانا چاہتا تھا۔ دراصل اس کا یہ فعل غلط تھا اور وہ ابراہیم ادھم کی توہین کرنا چاہتا تھا۔ پھر غلطی پہ غلطی یہ ہوئی کہ ابراہیم ادھم نے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اسلام کہتا ہے کہ مومن کا نفس معزز اور محترم ہے' اسلام کی منطق کے مطابق ابراہیم ادھم پر واجب تھا کہ وہ وہاں اس مسخرے کا مقابلہ کرتا' اس کو روکتا' اپنا دفاع کرتا اور اپنی عزت و حرمت کا تحفظ کرتا۔

ایک اور صوفی کہتا ہے: ایک شخص نے ماہ رمضان المبارک میں مجھ کو اپنے ہاں روزہ افطار کرنے کی دعوت دی لیکن جب میں اس کے گھر گیا تو اس نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔ دوسری شام کو اس نے پھر دعوت دی۔ میں دوبارہ اس کے گھر گیا تو اس نے پہلے کی طرح میرا راستہ روک دیا۔ اس کے بعد تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے مجھ سے کہا کہ تم عجیب آدمی ہو۔ یہ بھی دیکھتے ہو کہ میں تمہیں اندر نہیں آنے دیتا۔ اس کے باوجود بار بار چلے آتے ہو ـــــــ ہاں کتے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ تاہم اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کو اس قدر ذلیل و خوار کرے۔

کیونکہ اسلام میں ہم ایک طرف تو اس جگہ پہنچتے ہیں جہاں نفس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نفس کے خلاف جنگ کرنی چاہیے اور اسے مار ڈالنا چاہیے' لیکن جب ہم ایک مقام پر جاتے ہیں تو وہاں اسلام میں اسی اندازے کے مطابق بلکہ اس سے بھی زیادہ "عزت نفس" "قوت نفس" اور "کرامت نفس" کی بات ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ مومن کا نفس معزز اور محترم ہے۔ یہاں تک کہ تمام اسلامی اخلاق کی بنیاد انسان کے کرامت نفس اور شرافت نفس کی طرف توجہ دینے پر ہے اور اسلام کہتا ہے کہ اپنے نفس کی کرامت اور شرافت کو ہرگز داغدار نہ کرو۔ اسلام ایک طرف تو کہتا ہے کہ نفس کے خلاف جہاد کرو اور دوسری طرف کہتا ہے کہ اپنے نفس کی شرافت کو بٹہ نہ لگاؤ" اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا دو نفس وجود رکھتے ہیں جن میں سے ایک کے خلاف جنگ کی جائے اور دوسرے کو قابل احترام سمجھا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دو نفس ــــ "دو شخص" کے معنوں میں وجود نہیں رکھتے۔ بلکہ نفس ایک ہی ہے اور اس ایک ہی نفس کے بلند اور پست درجے ہیں۔ یہ نفس اپنے بلند درجے میں صاحب شرف ہے اور پست درجے میں کمینہ ہے اور جب یہ اپنی گدڑی سے باہر پاؤں نکالنے لگے تو اسے روک دینا چاہیے۔ یہ ایک ایسی بات ہے' عرفاء کی زبان میں اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس لیے ان کے بیانات میں جہاں نفس سے جہاد کا ذکر آیا ہے' وہاں اس جہاد میں نفس امارہ کے ساتھ نفس شریفہ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے ــــ بلکہ نفس شریفہ کے ساتھ بھی جہاد کرنے کو کہا گیا ہے۔

لہذا ضروری ہے کہ ہم اس بات کو سمجھیں کہ انسان کی واقعی "خودی" کیا چیز ہے فلسفی اس بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کی "خودی" اس کی روح ہے۔

آج کل کے ماہرین نفسیات کم ازکم اس حد تک پہنچے ہیں کہ انسان کی "خودی" کا بیشتر حصّہ وہ ہے جس کے وجود کا خود اسے بھی علم نہیں یعنی وہ اس کے ظاہری شعور میں وجود نہیں رکھتا۔ یعنی آپ اپنی اس "خودی" و ذات کا جتنا احساس کرتے ہیں وہ آپ کی ذات کا ایک چھوٹا سا جزو ہے اور اپنی ذات کے ایک بیشتر حصّے کو آپ جانتے ہی نہیں ہیں۔

آجکل کے تحلیل نفس کے کچھ ماہرین بھی زیادہ گہرائی میں گئے ہیں اور انہوں نے فلسفیوں کی مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فلسفیوں نے انسان کی روح کو اس کی "خودی" قرار دے کر غلطی کھائی ہے اور وہ انسان کی روح کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں خودی اس سے کہیں زیادہ دقیق اور عمیق ہے۔ اس مقام پر عرفاء نے فلسفیوں کے مقابلے میں اپنا کمال فکر و نظر دکھایا ہے، شبستری نے کہا:

من تو برتر از جان و تن آمد
کہ جان و تن ز اجزای من آمد

تیری خودی (میں) تو تیرے بدن اور روح سے بلند تر ہے۔
کیونکہ روح و بدن تیری خودی کے حصے ہیں۔

عرفاء کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی حقیقی من (خودی) یعنی "میں" کو اس وقت دریافت کر لیتا ہے جب وہ خدا کو دریافت کر لیتا ہے اور "خودی" کا شہود خود

خدا کے شہود سے کسی وقت جدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :

۱۲۳ اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھلا بیٹھے تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔ یہی لوگ تو بدکردار ہیں۔ (سورۂ حشر۔ آیت ۱۹)

وہ اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ جہاں تک فلسفیوں نے اسے سمجھا ہے انسان کی "خودی" اس سے کہیں زیادہ عمیق ہے۔ چنانچہ محی الدین عربی جو اسلامی عرفان کا باوا آدم ہے "وہ بوعلی سینا جیسے فلسفیوں کی بڑی تحقیر کرتا ہے" وہ تمام عرفا جو ساتویں صدی کے بعد آئے اور نظری عرفان رکھتے تھے اسی کے مکتب کے شاگرد تھے۔ تاہم عرفان نے فکری نقطۂ نگاہ سے بہت وسعت پائی اور فارسی عربی دونوں زبانوں میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

مولوی معنوی نے یہ بات ایک مقام پر بڑے عجیب طریقے سے بیان کی ہے :

ای تو در پیکار خود را باختہ
دیگراں را تو ز خود نشناختہ
تو بہ ہر صورت کہ آئی بیستی
کہ منم این واللہ آں تو نیستی
یک زماں تنہا بمانی تو زخلق
در غم و اندیشہ مانی تا بہ حلق
این تو کی باشی کہ تو آں اوحدی
کہ خوش و زیبا و سرمست خودی

اے انسان! تو نے اس جنگ میں اپنے آپ کو گنوا دیا اور خود کو

دوسروں میں سے پہچانا نہیں ہے۔
تو جس صورت میں آیا یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ میں ہوں، مگر بخدا کہ
وہ تو نہیں ہے۔
اگر تو ایک مدت تک لوگوں سے الگ رہ کر گلے گلے تک فکروغم
میں ڈوب جا۔
یوں تجھے پتہ چلے گا کہ تو وہ شخص نہیں ہے جو اپنے حال میں
خوش اور بے فکر تھا۔ (مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۳۶۰)

قرآن مجید فرماتا ہے:

"(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے کہ دراصل گھاٹے میں تو وہی
لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کا گھاٹا کیا۔
(سورۂ زمر۔ آیت ۱۵)

سب سے بڑا جوا اور سب سے بڑی ہار یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہار جائے،
خدا کی طرف توجہ کہ جو عبادت کی روح اور حقیقت ہے۔ اس کا مآل اپنی اصلیت
اور اپنے نفس کو دوبارہ پالینا ہے۔

پس اس بنا پر عرفا نے نفس کا مسئلہ اس حد تک تو حل کر لیا ہے۔ تاہم ان
کے ہاں نفس کے خلاف جہاد کے معاملے میں ہم نفس کی اس کرامت، عزت اور شرافت
کا ذکر بہت ہی کم دیکھتے ہیں۔ جس کی بدولت انسان بلند مقامات پر پہنچتا ہے چنانچہ
عرفان میں اس مسئلے پر بہت کم بحث ہوئی ہے اور اس بارے میں انھوں نے
اسلامی احکام سے بہت کم فیضان حاصل کیا ہے۔
ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کے ساتھ ساتھ اسلام میں نفس کے متعلق یہ

مسائل بھی ہیں:

نفس کو برائی سے روکنا ۔۔۔ نفس برابر برائی پر اکساتا ہے ۔۔۔ جس نے نفس کو پاک رکھا وہ کامیاب اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد ہوا ۔۔۔ مرنے سے پہلے مر جاؤ وغیرہم۔ نیز اس ضمن میں کچھ اور چیزوں کو بھی مدنظر رکھا اور بالآخر عزت نفس کو مرکز توجہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:

۲۵ ۔ عزت تو خاص خدا، اس کے رسولؐ اور مومنوں کے لیے ہے۔ (سورہ منافقون - آیت ۸)

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

۲۶ ۔ اپنی حاجتیں پوری کرنے میں عزت نفس کا خیال رکھو۔ ہاں تو سارے کام ایک اندازے سے ہوتے ہیں۔

یعنی اگر تم حاجت رکھتے ہو تو دوسرے سے ذلت کے ساتھ حاجت طلب نہ کرو بلکہ عزت نفس کے ساتھ مانگو۔ یعنی اپنی عزت کو داغدار نہ کرو۔ اب ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ میں اپنے نفس کی خود پسندی کو شکست دینے کے لیے بھکاری کی شکل میں کچھ مانگنا چاہتا ہوں، لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اور کہتا ہے کہ اگر تم کوئی حاجت رکھتے ہو تو تمہارا سوال عزت نفس کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

امام علی علیہ السلام میدان جنگ میں فرماتے ہیں:

۲۷ ۔ تمہارا ان سے دب جانا جیتے جی موت ہے اور غالب آکر مرنا بھی جینے کے برابر ہے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۵۱ صفحہ ۱۹۴)

مرا عار آید از این زندگی
کہ سالار باشم کنم بندگی
تن مردہ و گریہ دوستاں!
بہ از زندہ و خندۂ دشمنان

مجھے ایسی زندگی سے عار آتی ہے کہ کسی کا غلام ہو کر سالار بنوں۔
میری میت پر دوستوں کا رونا، میری زندگی میں مجھ پر دشمنوں
کے ہنسنے سے بہتر ہے۔

امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

۱۲۸۔ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے
(حیاۃ الامام حسین جلد ۱ صفحہ ۱۸۳)

امام حسین علیہ السلام یہ نہیں فرماتے کہ نفس کے ساتھ جہاد کا تقاضا یہ
ہے کہ ہم یزید اور ابن زیاد کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور اس صورت میں
ہم اپنے نفس کے خلاف بہتر جہاد کریں گے۔ آپ نے یہ اس لیے نہیں فرمایا کہ
اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

آپ نے مزید فرمایا:

۱۲۹۔ آگاہ ہو جاؤ کہ کمینے باپ کے کمینے بیٹے ابن زیاد نے مجھے دو
باتوں کے بیچ لا ٹھیرایا ہے، یعنی جنگ یا غلامی! لیکن کہاں ہیں
اور کہاں غلامی؟ خدا اس پر راضی نہیں ہوتا کہ ہم غلامی کی ذلت
میں پڑیں۔ ہمارے لیے، خدا کے رسولؐ کے لیے اور مومنوں کے لیے
عزت ہی عزت ہے۔ ہاں ہم وہ ہیں کہ جن کا تعلق پاک و پاکیزہ سلسلے

سے ہے۔ (مقتل حسینؑ مقرم صفحہ ۲۸۷)

یعنی کہاں ہم کہاں ذلت پر راضی ہونا! خدا کی رضا یہ نہیں کہ ہم ذلت اٹھانے پر آمادہ ہو جائیں۔ پھر میرے کوئی ذاتی احساسات بھی نہیں کیونکہ خود میرا مکتب ہی مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ یعنی میرا خدا مجھے ذلت اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ میرا پیغمبر مجھے ذلت قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور میری تربیت مجھے ذلت میں پڑنے کی اجازت نہیں دیتی ...... میں علیؑ و فاطمہؑ کے دامن میں پروان چڑھا ہوں ......

"۱۳۲ میں ہرگز ذلت کا ہاتھ تمہیں نہیں دوں گا، غلاموں کی طرح نہیں بھاگوں گا، اطاعت قبول نہیں کروں گا اور ذلت پر راضی نہیں ہوں گا۔

ایسی تعبیرات قرآن، حدیث اور ائمہ علیہم السلام کے کلمات میں اور بالخصوص امام حسینؑ کے کلمات میں بہت زیادہ ہیں۔

میں نے مسجد جاوید میں ایک بات کہی تھی جس کی وضاحت کرنے کے لیے میں اسے یہاں دہرانے لگا ہوں:

"۱۳۳ میں نے ایک نشست میں کہا تھا کہ یہ جملہ "زندگی عقیدہ اور اس کے لیے جہاد ہے" جو کچھ عرصے سے امام حسینؑ کے نام سے معروف ہے، یہ کسی ماخذ میں نقل نہیں ہوا اور اس بنا پر اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ اس کے معنی بھی درست نہیں ہیں اور یہ امام حسین علیہ السلام کی منطق کے ساتھ موافقت بھی نہیں رکھتا۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ انسان کی زندگی ایک عقیدہ اور اس کی راہ میں جہاد سے عبارت ہے۔ اسلام میں عقیدے کی نہیں حق کی گفتگو ہے اور زندگی

یہ ہے کہ انسان حق کو دریافت کرے اور اس کے راستے میں جہاد کرے۔ یہ مسئلہ کہ عقیدے کی راہ میں جہاد کرنا چاہیے۔ دراصل فرنگیوں کی سوچ ہے جو بعد میں مسلمانوں میں بھی مشہور ہو گئی ہے۔ چونکہ میں نے دیکھا ہے کہ کچھ نوجوانوں کو میرا یہ کہنا برا لگا کہ یہ جملہ امام حسینؑ کا نہیں، لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی وضاحت کروں۔ ہم پرانی نسل (ساری نہیں) کے مقابلے میں نوجوان نسل کے لیے احترام کے قائل ہیں۔ کیونکہ ہم نوجوان نسل کو حقیقت کا خوگر سمجھتے ہیں نہ کہ متعصب جس نے ایک عقیدہ اپنالیا، خواہ وہ بغیر دلیل کے ہی کیوں نہ ہو۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ نوجوان نسل کے دماغ میں جو چیز بیٹھ جائے وہ نہیں نکل سکتی تو پھر ماننا پڑیگا کہ یہ نسل بھی پرانی نسل جیسی ہے یعنی ایک جملہ اسے اچھا لگتا تھا اور دوسرا آپ کو اچھا لگتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ بھی بغیر دلیل کے اپنے عقیدے سے چمٹے ہوئے تھے اور آپ بھی بغیر دلیل کے چمٹے ہوئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ اپنے ایک دوست کی زبان سے سن رہے ہیں کہ یہ جملہ نہ منطقی طور پر اسلام سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ہی کسی کتاب میں اس کا مدرک اور سند درج ہے۔ اب فرض کیجیے کہ مخالفوں اور دشمنوں میں سے ایک شخص آئے اور آپ سے پوچھے: جناب! یہ الفاظ امام حسینؑ نے کہاں کہے ہیں اور اس کا مدرک کیا ہے؟ امام حسینؑ نے یہ الفاظ کہے ہیں تو ان کا مدرک بھی ضرور ہوگا۔ لیکن جب وہ مدرک و مآخذ آپ کو نہیں ملے گا تو پھر آپ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے: جناب! یہ جملہ "اِنَّ الْحَیَاۃَ .... کہاں سے آیا ہے؟ آپ مجھے بتائیں تاکہ میں مخالف کو جواب دے سکوں اور اسے اس کا مدرک دکھا سکوں۔ اس وقت میں آپ سے کہوں گا، جناب! اس کا

کوئی مدرک نہیں ہے تب آپ کہیں گے : جناب! آپ نے مجھے اب تک کیوں نہیں بتایا؟ کیا آپ یہ کہیں گے یا نہیں؟ اس وقت آپ میرے ہی جیسے ایک شخص پر اعتراض کرتے ہوئے کہیں گے : جناب! آپ نے ہمیں اب تک کیوں نہ بتایا؟ آپ نے خاموشی اختیار کی اور آج ہمیں دشمن کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا ہے۔ اگر آپ اس جملے کے جنگی پہلو EPIC پر فریفتہ ہیں تو امام حسین ؑ نے کئی ایک ایسے جملے کہے ہیں جو اس جملے سے سو گنا بڑھ کر جنگی ہیں "زندگی عقیدہ اور اس کے لیے جہاد ہے" کیا یہ بالاتر ہے یا یہ جملہ کہ "عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے"

۱۳۲ "ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے اور جہنم میں جانے سے ذلت اٹھانا بہتر ہے"

کیا عقیدہ و جہاد کا جملہ بہتر ہے یا روز عاشور آپ کا یہ جملہ زیادہ وقیع ہے:

"دیکھو! بدنہاد باپ کے بدنہاد بیٹے (ابن زیاد) نے مجھے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ میں یا تلوار سونت لوں یا ذلت قبول کروں مگر کہاں میں اور کہاں ذلت! خدا اور رسول ؐ کو ہم اہلبیت کی ذلت ہرگز منظور نہیں"

کیا اِنَّ الْحَیَاۃَ ...... بہتر ہے یا وہ جملہ جو آپ نے خطبے میں فرمایا:

۱۳۳ "جو ہمارے لیے جان قربان کرنے اور خدا سے ملنے کے لیے تیار ہو، وہ ہمارے ساتھ چلے، میں انشاء اللہ کل صبح روانہ ہو رہا ہوں"

نیز دسیوں ایسے اور جملے بھی ہیں —— ہمارے لیے رجزیات کی کوئی کمی

نہیں ہے۔ اگر ہم رجزیات کے معاملے میں نادار ہوتے یعنی ہمارے پاس زندہ جنگی نعرے نہ ہوتے کیا ہم العیاذ باللہ کہہ کر ایک جملہ امام حسینؑ سے منسوب کر دیتے؟ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس اس قسم کے اتنے نعرے ہیں کہ دنیا چاہے تو ہم سے لے سکتی ہے۔ پھر ہم دوسروں کے نعروں کے پیچھے کیوں جائیں؟ اور وہ بھی ایسے نعروں کے پیچھے کہ جو درست بھی نہ ہوں۔ نوجوان نسل کے لیے مناسب نہیں کہ وہ تعصب سے کام لے۔ پس میں کہتا ہوں کہ یہ جملہ امام حسینؑ کا نہیں اور مجھے ننانوے فی صد یقین ہے کہ نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کا مدرک ڈھونڈ نکالے تو میں قول دیتا ہوں کہ اسی منبر سے اعلان کروں گا کہ میری بات غلط تھی۔ لہٰذا ہمیں وہ بات کہنی چاہیے جس کی سند ہو، نہ وہ کہ جس کی کوئی سند ہی نہ ہو۔ اس ذیل میں بہت زیادہ مطالب ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ وقت کا دامن ان کے بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

پس اس بنا پر نفس کے خلاف جنگ کرنے کے ساتھ ہی نفس کی عزت، شرافت اور کرامت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ہماری یہ گفتگو بجائے خود عرفان و تصوف کے مسلک پر ایک اور تنقید تھی۔ ہم نے اسے اسلام کی کسوٹی پر پرکھا اور دیکھا کہ نفس کے خلاف جہاد کے مسئلے میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ اس میں نفس کی عزت اور کرامت بھی پامال ہو گئی ہے۔ جب ہم ان کے اس نظریے کو اسلام کے معیار پر جانچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہاں سے اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

دسویں نشست

مختلف مکاتب فکر کے نظریات کی تفصیل (۴)

"اور ایسے بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہتیرے اللہ والوں نے جہاد کیا۔ پھر ان کو خدا کی راہ میں جو مصیبت پڑی اس پر نہ تو انہوں نے ہمت ہاری ___ نہ بودا پن کیا ___ نہ دشمن کے آگے گڑگڑائے اور خدا تو ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (سورہ آل عمران۔ آیت ۱۴۶)

کامل انسان، برتر انسان، مثالی انسان، بلند مرتبہ اور سر فراز انسان .... کے بارے میں جو مختلف مکاتب ہیں ان میں سے ایک ___ مکتب قدرت ہے۔ اس مکتب کی نظر میں ___ کامل انسان ___ مقتدر اور صاحب قدرت انسان کے مساوی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس مکتب کے نزدیک ___ کمال ___ طاقت کے مساوی اور ___ نقص ___ عجز و ناتوانی کے مساوی ہے۔

یعنی انسانوں میں جو زیادہ طاقتور ہے وہ زیادہ کامل ہے اور جو زیادہ

کمزور ہے وہ زیادہ ناقص ہے۔ نیز حق اور عدالت کی بنیادی طور پر کوئی حقیقت نہیں اور قوت و طاقت کے بغیر ان کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

ہم عموماً اسی طرح سوچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے قطع نظر کہ یہ قوت فتح مند ہو یا وہ قوت ——— ان میں سے ایک حق و عدالت اور دوسری باطل اور ظلم ہے۔ اب ممکن ہے کہ ایک موقع پر حق ——— باطل کو شکست دے اور اس پر فتح پائے یا معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی باطل ——— حق پر فتح پالے۔ البتہ قرآن کی منطق کے مطابق "آخری فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے" اور باطل کی فتح وقتی ہوتی ہے' قرآن کے نقطہ نظر کے مطابق یہ بات بے حد قابل توجہ ہے لیکن اگر دو طاقتیں ایک دوسرے کے مقابل آجائیں اور ایک طاقت دوسری کو شکست دیدے تو یہ کہنا قرآن کے نظریے کے مطابق نہیں کہ فتح پانے والی طاقت ——— حق ہے اور جو شکست کھا جائے وہ باطل ہے۔

جو کام ایک طاقتور اور مقتدر شخص کرے اس دلیل سے کہ وہ شخص طاقتور ہے ——— اس کا وہ کام عین عدالت ہے۔ یہ بھی ایک مکتب فکر ہے اور اس کی جڑیں سقراط سے قبل کے دور تک پہنچتی ہیں۔ سقراط ——— حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تقریباً چار سو سال پہلے گزرا اور اس وقت سے اب تک تقریباً ۲۴ سو سے ۲۵ سو سال گزر چکے ہیں۔ سقراط سے پہلے فلسفیوں کا ایک گروہ تھا جسے سوفسطائی کہا جاتا ہے اور وہ اجتماعی مسائل میں ایسا ہی نظریہ رکھتے تھے لیکن ان کا یہ نظریہ سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے فلسفیوں کے ظہور سے جو یونان میں ہی منسوخ ہو گیا اور پھر مسیحیت آگئی جو کلی طور پر اس طرز فکر کے

برعکس ہے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ مسیحیت طاقت کی تبلیغ نہیں کرتی بلکہ وہ کمزوری کا پرچار کرتی ہے۔ یعنی وہ کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے آگے کر دو اور اس کے مقابل اپنا دفاع نہ کرو۔ یہ ایک طرح سے کمزوری کی تبلیغ ہے۔ اوّلاً مسیحیت کے فروغ اور ثانیاً اسلام کے ظہور کے باعث دنیا میں اس قسم کے خیالات یعنی سوفسطائیوں کے نظریے کے لیے کوئی گنجائش نہ رہی۔

اگرچہ قدرت اور قوت کے بارے میں اسلام کی اپنی ایک خاص منطق ہے جس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ اس معاملے کو اس طرح پیش نہیں کرتا کہ قوت ـــــ حق و عدالت کے مساوی اور حق و عدالت ـــــ قوت کے مساوی ہیں جیسا کہ خود اہل یورپ بھی کہتے ہیں کہ "طاقت حق ہے" MIGHT IS RIGHT یعنی حق ہی طاقت ہے۔ یوں ایک مرتبہ پھر سرزمین مغرب میں یہی خیال زندہ ہو گیا کہ حق ـــــ طاقت کے مساوی ہے۔ پہلے پہل یہ خیال سیاست کے فلسفے میں ظاہر ہوا یعنی سیاست تک محدود رہا اور آگے نہیں بڑھا۔

اٹلی میں ایک عالم اور فلاسفر گزرا ہے جس کا نام میکیاولی تھا۔ اس نے اپنے سیاسی فلسفے کی بنیاد اقتدار اعلیٰ پر رکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سیاست میں جو واحد چیز ملحوظ خاطر رکھی جانی چاہیے وہ اقتدار اعلیٰ ہے۔ پس سیاست میں اس کے علاوہ کسی دوسرے اصول کے ذریعے سیاسی مقاصد حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

جھوٹ، فریب، مکر، جھوٹی قسمیں، خیانت کرنا، حق سے روگردانی

وغیرہ جیسے مسائل کو سیاست میں زیر بحث نہیں لانا چاہیے۔ اس کے علاوہ کچھ اور فلسفی بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے اس نظریے کو فقط سیاست میں پیش نہیں کیا بلکہ اسے ایک عام اخلاقی اصول کے طور پر پیش کیا اور سیاستدانوں کو کھلی چھٹی دیدی۔ یہاں تک کہ بنیادی طور پر وہ اس بات کے معتقد ہو گئے کہ اخلاق عالیہ اور مقام انسانیت کا ضامن بس میکیاولی کا نظریہ سیادت ہی ہے۔

نطشے ـــــ جرمنی کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے جو دنیا کے معروف فلسفیوں میں سے ہے اور اپنی زندگی کے آخری دور میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی طبیعت میں جنون کے آثار شروع ہی سے ظاہر تھے یہ شخص بہت بڑا مصنف ہے۔ اس نے طاقت کو اخلاق کی بنیاد قرار دیا اور "طاقت" کو ایک عام اخلاقی اصول کے طور پر پیش کیا۔

یہاں ایک تمہید ضروری ہے اور وہ یہ کہ تقریباً چار صدیاں پہلے یعنی سولہویں صدی عیسوی میں سائنس اور منطق میں ایک انقلاب رونما ہوا ہے۔ دنیا کے عظیم فلسفیوں میں سے ڈیکارٹ فرانسیسی اور بیکن برطانوی دو ایسے اشخاص ہیں جنہیں جدید علم و دانش کا پیشرو کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کا اور بالخصوص بیکن کا ـــــ علم کے بارے میں ایک نظریہ ہے۔ جس نے علم کے متعلق تمام گزشتہ نظریات کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ نظریہ جہاں علوم کی ترقی اور انسان کے فطرت پر غیر معمولی تسلط کا موجب قرار پایا ہے وہاں انسانوں کے فاسد اور گمراہ ہونے کا سبب بھی بنا ہے یعنی اسی نظریے نے انسان کو انسان کے ہاتھوں آباد کیا اور اسی نے انسان کو خود انسان کے ہاتھوں برباد اور

فاسد کر دیا ہے۔ وہ نظریہ کیا ہے؟

بیکن سے پہلے علم کے بارے میں بنی نوع انسان کے سربرآوردہ اشخاص فلاسفر اور بالخصوص بانیان مذاہب نے علم کو قدرت اور طاقت کے حصول کی خاطر نہیں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی خاطر استعمال کیا تھا یعنی وہ بزرگ اور خصوصاً بانیان مذاہب انسان کو علم حاصل کرنے کا شوق دلاتے ہوئے اپنے کلمات میں جس چیز پہ زور دیتے وہ یہ تھی: اے انسان! عالم بن اور یہ جان لے کہ علم تجھے حقیقت تک پہنچائے گا۔ علم انسان کے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور اسی بنا پر اس کو تقدس حاصل تھا اور اسے ایک مقدس حقیقت سمجھا جاتا تھا۔ علم انسان کی دنیاوی منفعتوں سے بلند اور مادی امور سے بلند تر تھا۔ چنانچہ علم کو ہمیشہ مال و دولت کے مقابلے پر رکھا جاتا تھا کہ آیا علم بہتر ہے یا مال؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری فارسی اور عربی دونوں زبانوں کی ادبیات میں یہ موازنہ کیا گیا اور علم کو دولت پر ترجیح دی گئی ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

علم داوند بہ ادریس و بہ قارون زر و سیم
آن یکی زیر زمین و آن دگری فوق فلک

حضرت ادریسؑ کو علم دیا گیا اور وہ اس کی برکت سے آسمان پر پہنچ چکے ہیں، ادھر قارون کو سونا چاندی ملا اور وہ اس کی نحوست کے ساتھ زمین میں دھنس گیا تھا۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے بھی علم اور مال کے درمیان موازنہ کیا اور علم کو مال پر ترجیح دی ہے۔ یعنی آپ علم کو ہمیشہ ایک مقدس چیز سمجھتے تھے اور اسے مادی امور اور مادی فوائد سے بلند تر گردانتے تھے۔

۱۳۵ اے کمیل! علم کی شناسائی ایک دین ہے کہ جس کی اقتدا کی
جاتی ہے۔ اس سے انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے اپنی
اطاعت منواتا ہے اور مرنے کے بعد نیک نامی حاصل کرتا ہے
یاد رکھو کہ علم حاکم ہوتا ہے اور مال محکوم!
(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ کلام ۱۴۷ صفحہ ۸۵۰)

۱۳۶۔ جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا مجھے اپنا غلام بنا لیا۔

آپ قرآن مجید کو بھی دیکھیں کہ اس نے علم اور اس کی تقدیس کو کس شان سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت آدمؑ کی خلقت" آپ کو اسماء کی تعلیم" ان کا علم کہ جس سے فرشتے بھی بے خبر تھے ـــــ اور فرشتوں کا انہیں سجدہ کرنا بھی ملاحظہ کریں:

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب
کے سب جھک گئے۔ مگر شیطان نے انکار کیا" غرور میں آگیا
اور کافر ہو گیا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۳۴)

یعنی اے ملائکہ" اے فرشتو! آدمؑ کو سجدہ کرو کیونکہ آدم وہ چیز جانتا ہے جو تم نہیں جانتے ہو۔

لیکن پھر وقت آگیا کہ جب بیکن اٹھا اور اس نے کہا: علم انسان کے لیے تفریح کا ذریعہ ہے ـــــ یہ کہنا کہ علم کے پیچھے اس لیے جائیں کہ ہم حقیقت کو دریافت کرنا چاہتے ہیں اور حقیقت کا دریافت کرنا بجائے خود ایک مقدس چیز ہے" یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ انسان کو چاہیے کہ علم کو زندگی کی خدمت پر لگا دے اور اچھا علم وہی ہے جو انسان کے کاروبار زندگی میں مددگار ثابت ہو۔

وہ انسان کو طاقت دے اور انسان کو فطرت پر مسلط کر دے۔

یہی وجہ ہوئی کہ علم نے اپنا آسمانی اور روحانی پہلو ——— زمینی اور مادی پہلو کے سپرد کر دیا یعنی علم اور تحقیق کا راستہ بدل گیا اور ان کا رخ زیادہ سے زیادہ فطرت کے اسرار و رموز دریافت کرنے کی جانب مڑ گیا۔ کس لیے؟ اس لیے کہ انسان فطرت پر مسلّط ہو جائے۔ چلیے وہ فطرت پر مسلط ہو گیا ——— تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ بہتر طور پر زندگی بسر کرے گا، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زندگی کے لیے زیادہ سہولتیں فراہم کرے گا۔

ہاں تو اس نظریے نے ایک لحاظ سے بنی نوع انسان کی بہت ہی عظیم خدمت انجام دی کیونکہ علم اس کائنات کے اسرار و رموز دریافت کرنے کے راستے پر لگ گیا ——— تاکہ انسان فطرت پر تسلط حاصل کرے اور اس سے بہرہ مند ہو۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو علم نے یہ جو کچھ کیا ——— بہت اچھا کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی علم نے اپنی تقدیس اور اپنا اعلیٰ مقام کھو دیا ہے۔ اس وقت بھی علوم دینیہ کے جو طلبا پرانے تعلیمی مراکز میں قدیم معیارات کے مطابق تعلیم پا رہے ہیں ان کے نزدیک علم کی وہی قدر و قیمت ہے جو مثلاً کتاب آداب المتعلمین اور کتاب منیۃ المرید میں بیان کی گئی ہے۔ ان کتابوں میں روایات، احادیث اور ایسی چیزیں موجود ہیں جن کے مطابق علم ایک مقدس اور پاکیزہ چیز ہے۔ ان روایات و احادیث میں حکم دیا گیا ہے کہ جب ہم کسی علمی مرکز میں سبق لینے جائیں تو ہمیں وضو کر کے اور پاک ہو کر جانا اور تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ وہاں کے استاد اور معلم طلبا کے نزدیک ایک خاص احترام اور جلال کے حامل ہیں۔ انہیں ایک خاص تقدس حاصل ہے اور وہ طلبا واقعی

دل کی گہرائیوں سے استاد کا ادب کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص دولت کی خاطر علم حاصل کرنا چاہے تو اسے اپنے دل میں شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں اس لیے علم حاصل کرتا ہوں تاکہ آئندہ اس سے مال و دولت کماؤں یا اگر معلم طلباء کو تعلیم دینا چاہے اور اس کا مقصد تعلیم کے بدلے میں دولت حاصل کرنا ہو تو وہ اسے علم کے مقام کی گراوٹ سمجھتا ہے لیکن جدید نظام تعلیم جو بیکن وغیرہ کی بتائی ہوئی ڈگر پر چل رہا ہے اس میں تعلیم و تعلم کا عمل اپنا تقدس مکمل طور پر کھو چکا ہے۔ ایک طالب علم جب علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے نزدیک یہ آئندہ زندگی میں دولت کمانے کی تیاری کا عمل ہوتا ہے۔ اس روش کے مطابق اگر ایک شخص سکول یا یونیورسٹی میں جاتا ہے تاکہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بن جائے اور بہتر زندگی کا سامان فراہم کرے یا ایک شخص بازار میں جاتا ہے تاکہ ایک تاجر کا شاگرد بن کر دولت کمانے کے قابل ہو جائے تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بھی روپے پیسے کے پیچھے جاتا ہے اور یہ بھی روپے پیسے کے پیچھے جاتا ہے وہ اپنے معلم کے بارے میں بھی کچھ اس انداز سے سوچتا ہے کہ یہ صاحب ہر مہینے اتنی ساری فیس لے لیتے ہیں اور فیس کی ادائیگی کے بارے میں اسے یہ الفاظ کہنے بھی چاہئیں۔ جیسا کہ عملی طور پر بھی ہم دیکھتے ہیں اور کوئی عجب نہیں کہ ایک شاگرد پیٹھ پیچھے اپنے استاد کو چند گالیاں دینے میں کوئی شرم محسوس نہ کرے اور اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

بیکن آیا اور اس نے کہا: علم طاقت کے لیے ہے ـــــ علم اس لیے ہے کہ طاقت کی خدمت کرے ـــــ دانائی صرف توانائی کے لیے ہے کسی

اور جبر کے لیے نہیں۔ ابتدا میں تو اس نظریے کے بُرے اثرات ظاہر نہیں ہوئے لیکن بتدریج جب انسان علم سے فقط طاقت چاہنے لگا تو نوبت یہاں تک آپہنچی کہ ہر چیز قدرت اور طاقت کی خدمت میں لگ گئی۔ اس وقت دنیا کا پہیہ اسی محور پر گھوم رہا ہے کہ علم مکمل طور پر طاقتوں کی خدمت میں لگا ہے۔ دنیا میں علم کبھی بھی اتنا قیدی نہیں بنا اور طاقتوروں کی خدمت میں نہیں جُتا رہا جتنا آج ہے یعنی دنیا کے صاحبانِ علم طاقتوروں کے قیدی ہیں۔ مثلاً آئن سٹائن کو لیجیے' اس کا علم کس کی خدمت میں ہے۔ وہ روزویلٹ کی خدمت میں ہے۔ یعنی آئن سٹائن ـــــ روزویلٹ کا خادم بن گیا ہے اور یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ خادم بنے یا نہ بنے۔ علم امپیریلزم کے کیمپ میں ہو یا سوشلزم کے کیمپ میں' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' کیونکہ اس وقت وہ ہر جگہ طاقت کی خدمت میں مصروف ہے۔ یہ علم نہیں بلکہ طاقت ہے جو اس دنیا پر حکم چلا رہی ہے' اس لیے آجکل ہمارا یہ کہنا کہ ہماری دنیا علم کی دنیا ہے' ہمیں اس بات میں تھوڑی سی تصحیح کر لینی چاہیے۔

ہماری دنیا علم کی نہیں بلکہ طاقت کی دنیا ہے' یعنی علم ہے لیکن آزاد نہیں ـــــ یہ علم' طاقت' اور جبر کی خدمت میں مصروف ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو اختراع یا انکشاف ہوتا ہے اسے طاقت کی خدمت پر لگا دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے انسانوں کو قتل کرنے کے لیے خطرناک اسلحہ تیار کیا جاتا ہے۔ یعنی علم پہلے وہاں جاتا ہے اور پھر کچھ بچ جائے تو انسان کے دوسرے کاموں کی خدمت میں صرف کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انکشاف بھی ہوتا ہے سوائے اس کے جو اس کے کام کا نہ ہو وہ طاقت کی خدمت میں ہی جاتا ہے۔

اگر وہ طاقت کے کام کا ہو تو پہلے اسے وہیں لے جایا جاتا ہے اور جب تک ضروری ہو اسے خفیہ رکھا جاتا ہے، کیونکہ طاقت کو اس کی حاجت ہوتی ہے۔ جب وہ یہاں ضرورت سے زائد ہو جاتا ہے تو پھر اسے زندگی کے دوسرے شعبوں کی خدمت میں بھیج دیا جاتا ہے۔

جو راستہ بیکن نے اختیار کیا ہے وہ لازمی طور پر اس راستے سے جا ملتا ہے جو نطشے اور میکیاولی نے ـــــ بالخصوص جو کچھ نطشے نے بنایا تھا۔

ایک اور نظریہ بھی دنیا میں پیدا ہوا اور وہ نطشے کے لیے ایک اور سہارا بن گیا ـــــ وہ ڈارون ازم کے اصولوں میں سے ایک اصول تھا۔

خود ڈارون ذاتی طور پر ایک متدین عیسائی تھا اور وہ ایک ایسا آدمی نہیں تھا جو خدا کا مخالف ہو۔ وہ ایک مذہبی آدمی اور مخلص عیسائی تھا۔ اس کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جانکنی کے عالم میں اس نے عیسائیوں کی مقدس کتاب اپنی چھاتی پر رکھی ہوئی تھی اور اسے بھینچ رکھا تھا۔ وہ خود بھی اپنے صریح کلمات میں خدا کے وجود کا اقرار، اعتراف کرتے ہوئے مسیح علیہ السلام سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دنیا میں ڈارون کے اصولوں سے ازحد غلط فائدہ اٹھایا گیا اور شاید وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو ـــــ مگر ہو گیا۔

مادہ پرستوں نے ڈارون کے اصول ارتقا کو خدا کی ہستی سے انکار کا ذریعہ قرار دیا اور یہ بجائے خود ایک داستان ہے۔ فلسفے سے ایک اور غلط فائدہ اخلاق یعنی ایک مثالی، برتر اور کامل انسان کی تعبیر کے بارے میں اٹھایا گیا، کیونکہ اسکا ایک اصول "تنازع بقا" یعنی اپنی بقا کی خاطر جنگ بھی تھا۔

ڈاردن نے جن چار اصولوں کی بنیاد رکھی ان میں سے ایک "حبِ ذات" ہے۔ یعنی ہر حیوان اپنی ذات سے محبت کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا "تنازع بقا" کا اصول ہے یعنی اس نے کہا کہ اس دنیا میں زندگی کی بنیاد تنازع بقا پر ہے۔ جاندار ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہیں اور جو زیادہ طاقتور ہے وہ باقی رہتا ہے۔

انہیں فطرت کی چھلنی میں جھٹکا جاتا ہے۔ یہ جنگ فطرت کی چھلنی ہے اور اس میں مسلسل چھانا جاتا ہے۔ اس جنگ میں جو حیوانات ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں اور فطرت ان کو چھانٹتی ہے۔ ان میں سے جو بہتر ہو اسے بقا کے لیے چن لیتی ہے۔ یعنی اس کو جس نے جنگ میں اپنی بہتر حفاظت کی ہو اور حریف کو ختم کر دیا ہو۔

اب ڈارون کے اس اصول پر اعتراضات کیے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ موجودات باقی رہتے ہیں لیکن اس کی وجہ بقا کے لیے قوی یا بہتر ہونا نہیں ہے۔ اس کے باوجود نطشے نے اس اصول سے نتیجہ اخذ کیا اور کہا ہے کہ تمام موجودات حتیٰ کہ انسان میں بھی تنازع بقا زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ چنانچہ وہ انسان جو زیادہ طاقتور ہو باقی رہتا ہے اور اسے باقی رہنا بھی چاہیے۔ پھر اس نے یہ بھی کہا ہے کہ فطرت برتر انسان کی جانب سفر کرتی ہے اور یہ وہی چیز ہے جس سے ہم "کامل انسان" مراد لیتے ہیں۔ تاہم وہ کہتا ہے: برتر انسان ــــــ سپرمین SUPERMAN اور کامل انسان کو کسی آئندہ وقت پر وجود میں آنا چاہیے۔

ہم اس سے سوال کرتے ہیں : کامل انسان سے کیا مراد ہے ؟

وہ کہتا ہے : زیادہ طاقتور انسان اور ایسا انسان جس میں ضعیف پرور اخلاق ہرگز موجود نہ ہوں۔

اس کی نظر میں ضعیف پرور اخلاق کونسے ہیں ؟ یہ وہی ہیں جنہیں ہم آجکل محبت کرنا، مہربانی کرنا، احسان کرنا اور خدمت خلق کرنا کہتے ہیں۔

وہ مزید کہتا ہے کہ یہ اخلاق نہیں ہیں کیونکہ انھوں نے ابوالبشر کو بلندی سے زمین کی پستی میں پہنچایا۔ یہی ہیں جو انسان کے ارتقا میں مانع ہیں اور یہی ہیں جو برتر انسان، طاقتور انسان اور زیادہ کامل انسان کے ظاہر ہونے میں مانع ہیں۔ کامل انسان وہی ہے جس میں کمزوری کی علامتیں اور وہ چیزیں جنہیں ہم کمال شمار کرتے ہیں ______ موجود نہ ہوں۔ لہٰذا وہ سقراط کا بھی دشمن ہے اور مسیح کا بھی دشمن ہے۔

وہ کہتا ہے : سقراط نے اپنے اصول اخلاق میں عفت، پاکیزگی، عدالت اور مہربانی وغیرہ کی تعلیم دی تو اس نے بہت برا کیا۔ بلکہ اس کے نظریے کے مطابق سقراط سے بھی بدتر حضرت عیسیٰؑ جنہوں نے محبت اور مہربانی کے ضمن میں یہ سب کچھ کہا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری کے نقاط ہیں اور انسان ان سے جس قدر دوری رکھتا ہو، اتنا ہی کمال کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ کیونکہ کمال کے معنی توانائی اور نقص کے معنی ناتوانی کے ہیں اور یہ چیزیں نقص سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اصل بات صحیح راستے سے کہاں تک ہٹ گئی ہے۔

زیادہ وضاحت کی خاطر ہم ان کے کچھ اقوال بیان کرتے ہیں جو تاریخ فلسفہ کی اکثر کتابوں میں نقل ہوئے ہیں۔ میں نے فروغی کو دوسروں سے بہتر

پایا ہے۔ لہٰذا میں آپ کی خاطر وہ اقوال پیش کرتا ہوں جو فروغی نے نقل کیے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "سیر حکمت در اروپا" میں کہتا ہے:

"دنیا کے تمام اہل دانش نے خود پرستی کو بُرا اور دوسرے پر شفقت کو اچھا سمجھا اور نفس کی کمزوری اور عیب گردانا ہے۔ چونکہ مسئلہ بحث طلب ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس بارے میں گفتگو کرنی چاہیے کہ آیا شفقت اور مہربانی نفس کی کمزوری ہے یا نہیں؟ اس نے شوپنہاور کے اس عقیدے کی تصدیق کی ہے کہ دنیا میں بنیادی چیز زندگی کی خواہش ہے۔ لیکن اس کے اس خیال کی مخالفت کی ہے کہ زندگی کی خواہش بری چیز ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ وجود ـــــ زندگی کا طالب ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے زندگی کی طلب بالکل درست ہے اور زندگی کی خواہش درحقیقت طاقت کی خواہش ہے۔

ڈارون کی آراء میں سے نطشے نے بقاء کی کوشش کو قبول کر لیا ہے اور اسے تنازع کے معنوں میں لیا ہے۔ گویا جس چیز کو دوسروں نے ڈارون کی فاسد رائے کا نتیجہ سمجھا، اس نے اسے درست قرار دیا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش کی حالت میں ہوں، طاقت حاصل کریں اور دوسروں پر غلبہ پائیں۔

عالم آخرت کے بیشتر خیرخواہوں نے اکثریت کے حالات کی رعایت کو واجب شمار کیا اور کہا ہے کہ دنیا کے امور کا دارومدار عوام کی اچھی حالت پر ہے۔ اس کے برعکس نطشے نے اکثریت کو ذلیل سمجھا ہے اور فقط اقلیت یعنی خواص کو خوشحالی کا حقدار شمار کیا ہے۔ نطشے کی سوچ کی بنیاد یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ طاقتور ہو اور اس کی زندگی از حد خوش اور پرمسرت ہو۔ نیز

اس کا نفس زیادہ شگفتہ اور زیادہ طاقتور ہو، نیز اس کا نفس میلانات اور مطالبات سے بھرا پڑا ہو۔

اس بارے میں بحث بیکار ہے کہ دنیا کی زندگی اچھی ہے یا بری ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ کوئی شخص بھی اس کا پتہ نہیں چلا سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں بہتر ہوتا کہ ہم دنیا میں آتے ہی نہ ہوتے، مجھے علم نہیں شاید ایسا ہی ہو لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہ اچھا ہوا یا برا ہوا۔ بہرطور میں اس دنیا میں آگیا ہوں اور اس کی اچھائی برائی کو نہیں جانتا۔ پھر بھی مجھے اس دنیا سے لطف اندوز ہونا چاہیے اور جتنا زیادہ لطف اندوز ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ یہ سوچنے کا وہی انداز ہے جو معاویہ کا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ہم دنیا کی نعمتوں کے مزے لوٹتے رہے اور لوٹتے رہیں گے۔ جو چیز اس مقصد کے حصول میں مددگار ہو وہ اچھی ہے ـــــ خواہ وہ سنگدلی، بے رحمی، مکر و فریب اور جنگ و جدال ہی کیوں نہ ہو۔ پھر جو چیز اس مقصد میں مزاحم ہو اور اس کے خلاف ہو وہ بری ہے ـــــ خواہ وہ سچائی، مہربانی، فضیلت اور تقویٰ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ بات غلط ہے اور عالم انسانیت کی ترقی کے منافی ہے کہ لوگ، قبیلے اور قومیں یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ اس کی بجائے لوگوں کے دو گروہ ہونے چاہییں۔ ایک وہ جو زبردست اور آقا ہوں ـــــ دوسرا وہ جو ماتحت اور غلام ہوں، شرافت اور بڑائی زبردست لوگوں کا حق ہے کہ وہی اس دنیا کے وجود میں آنے کا مقصد ہیں اور کمزور لوگ محض ان کی اغراض پوری کرنے کا ذریعہ ہیں۔ دنیا کی ترقی اور زندگی کی ہما ھمی بڑے اور زبردست لوگوں کی بدولت وجود میں آتی ہے جو محدود تعداد میں ہیں اور اکثریت کو چاہیے کہ ان

کے کاروبار کی ترقی کا وسیلہ بنے۔ انسانی معاشرہ اسی شریف طبقے کے کاروبار کی ترقی کے لیے تشکیل دیا گیا ہے اور جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے معاشرہ اس لیے نہیں ہے کہ ـــــ زیردستوں کی حفاظت اور پرورش کریں، بلکہ زبردست اور طاقتور لوگ جو کہ آقا ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ پرورش ہونی چاہیے۔ تاکہ ان میں سے برتر آدمی وجود میں آئیں اور انسان ترقی و عروج کے مدارج میں قدم رکھے" حکومت اور معاشرہ اس لیے ہیں کہ طاقتور لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ کمزور لوگ چوپایوں کا حکم رکھتے ہیں جنہیں طاقتور لوگوں کا بوجھ اٹھانا چاہیے۔" (سیر حکمت در یورپ حصہ سوم صفحہ ۱۹۸)

ادھر سعدی شیرازی کہتے ہیں:

گوسفند از برای چوپاں نیست

بلکہ چوپاں برای خدمت اوست

بھیڑیں، چرواہے کے لیے نہیں، بلکہ چرواہا بھیڑوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ہے۔

لیکن مکتب قدرت کہتا ہے کہ درحقیقت بھیڑ اس گڈریے کے لیے ہے یعنی زبردست اور طاقتور لوگ جو سردار اور "آقا ہیں" انہی کو پھولنا پھلنا چاہیے تاکہ ان میں سے برتر اشخاص وجود میں آئیں اور انسان اوج و عروج کے مدارج طے کرے۔ خود مغرب کے اہل دانش میں بھی نسل انسانی کی اصلاح اور بہبود کے بارے میں ایک بحث پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں الیکسس کارل نے اپنی کتاب "انسان موجود ناشناختہ" کے آخر میں اسی اصول کو اختیار کیا اور کہا ہے کہ نسلوں کی اصلاح ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کا نظریہ تو یہ ہے کہ

دنیا کے کمزور انسانوں کو سرے سے تولید نسل کا حق ہی نہیں دینا چاہیے۔

لوگ اب تک جن اخلاقی اصولوں کی پیروی کر رہے ہیں وہ عام لوگوں اور اکثریتی طبقے یعنی زیردستوں کے مفاد کی خاطر ترتیب دیے گئے ہیں اور زبردستوں اور شریف طبقے کے فائدے کے لیے نہیں ہیں۔ لہٰذا ان اصولوں کو ختم کر دینا چاہیے اور ایسے اصول اختیار کرنے چاہئیں جو شریفوں اور طاقتور لوگوں کے مفاد میں ہوں۔ نیکی، سچائی اور احسان کوئی حقیقی امور نہیں ہیں۔ ہاں جو چیز حقیقت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص طاقت کا طلبگار ہے۔

مذاہب نے بنی نوع انسان کو دھوکا دیا اور ان کو عدالت کے قیام اور زیردستوں کی حمایت کرنے کی دعوت دی ہے۔ مذاہب سے پہلے کے ادوار اچھے تھے کہ جب دنیا میں جنگل کا قانون جاری تھا اور جو زیادہ طاقتور ہوتا تھا وہ کمزور کو کھا جاتا تھا اور کمزور نسل معدوم ہوتی چلی جاتی تھی۔ ابتدائی زمانے میں دنیا طاقتور لوگوں کی مرضی کے محور پر گھومتی تھی اور کمزور ان کے ماتحت اور غلام تھے۔ تاہم طاقتور تھوڑے اور کمزور بہت زیادہ تعداد میں تھے' اس لیے انہوں نے حیلے' تدبیر اور دھوکے سے کام لے کر ان طاقتور لوگوں کو اپنی ترقی کا وسیلہ بنایا۔ چنانچہ انہوں نے مہربانی و شفقت' فروتنی و خیر خواہی اور عدالت و کرامت کے اصول کو نیکی راستی اور احسان کی شکل میں ان کے ذہنوں میں جلوہ گر کیا اور قبول کرایا۔ تاکہ اس طریقے سے وہ طاقتور لوگوں کی طاقت کو معتدل بنائیں اور ان کی غلامی سے نجات پائیں۔ انہوں نے اپنے اس مقصد کو مذاہب کے وسیلے سے حاصل کیا اور خدا کے نام اور حق کو ان مذاہب کا قلعہ پناہ گاہ قرار دیا۔

تاہم مکتب قدرت کے حامیوں کا یہ نظریہ کارل مارکس کے نظریے کے بالکل برعکس ہے جو کہتا ہے کہ مذہب کو طاقتور لوگوں نے کمزور لوگوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر اختراع کیا ہے جبکہ نطشے کہتا ہے کہ مذہب کو کمزوروں نے طاقتوروں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر اختراع کیا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں ہی مذہب کے مخالف ہیں لیکن ایک کا دعویٰ ہے کہ مذہب کمزوروں نے اختراع کیا، کیونکہ یہ اپنے آپ کو طاقتوروں کا طرفدار سمجھتا ہے۔ مگر وہ دوسرا جو اپنے آپ کو کمزوروں کے طرفدار کے طور پر پیش کرتا ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ مذہب کو طاقتوروں نے اختراع کیا ہے تاکہ کمزوروں کی شورش پر قابو پا سکیں اور پھر وہ سقراط، بدھ اور مسیح پر اعتراض کرتا ہے۔

وہ کہتا ہے: مسیحی اخلاق غلامی کا اخلاق ہے اور اس نے آقائی کے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ انسانی برادری، برابری اور صلح طلبی ــــــــ نیز عورتوں اور مزدوروں کے حقوق کی رعایت اور ایسی ہی دوسری باتیں جو آجکل کہی جا رہی ہیں ان کا ماخذ مذہب ہے جو دھوکے فریب اور کمزوری اور انحطاط کا موجب ہے۔ ان اصولوں کو ترک کر دینا چاہیے اور آقائی کی زندگی کے اصول اختیار کرنے چاہییں۔ خدا اور آخرت کی زندگی کا ذکر نہیں کرنا چاہیے اور مہربانی اور رقت قلب کو دل سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔

مہربانی کی بنیاد بے بسی پر ہے اور فروتنی و فرمانبرداری ــــــــ فرومایگی سے پیدا ہوتی ہے، نیز حلم و حوصلہ اور عفو و چشم پوشی ــــــــ بے ہمتی اور سستی کا نتیجہ ہیں۔ اس کی بجائے انسان کو مردانگی اختیار کرنی چاہیے تاکہ وہ "برتر مرد" کے رتبے پر پہنچے۔ برتر مرد وہ ہے جو اچھائی اور برائی سے

برتر ہو اور قوت و قدرت حاصل کرنے کا عزم و ارادہ رکھتا ہو۔

اہل یورپ کے درمیان ایسے بہت سے مکاتب پیدا ہوئے۔ مگر خوش قسمتی سے ہمارے درمیان ایسے مکاتب اور ایسی وبائیں پیدا نہیں ہوئیں۔ چنانچہ یورپی روح یہی ہے ـــــ وہ حقوق انسانی کا جو اعلامیہ دیتے ہیں وہ بھی محض دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے ہے۔ یورپی تربیت اور حقیقی یورپی اخلاق، میکیاولی کا اخلاق اور نطشے کا اخلاق ہے۔ آج کا فرنگی استعمار دنیا میں جو کام انجام دے رہا ہے وہ اسی بنیاد پر ہے اور فرنگی استعمار کی روح خواہ وہ امریکی ہو یا یورپی ـــــ یہی ہے اور اس کا اخلاق بھی یہی ہے۔

جب وہ ہمارے سامنے آتے ہیں تو حقوق انسانی کا دم بھرتے ہیں اور ہم ایسے بدبخت ہیں کہ ان کی باتیں دہراتے اور جگالی کرتے رہتے ہیں، خدا کی قسم! یہ غلطی ہے اور بہت بڑی غلطی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ امریکہ نے ویت نام میں کیا کیا؟ کیا اس نے نطشے کے فلسفے پر عمل کرنے کے علاوہ کچھ اور کیا ہے؟ ہرگز نہیں! یہ ٹھیک ٹھیک یہی فلسفہ ہے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رسل نے یہ کہا اور سارتر نے یہ کہا، حالانکہ وہ بھی اس کے ہم فکر ہیں اور تمام فرنگیوں کی سوچ کی بنیاد اسی پر ہے۔ بہت کم افراد ایسے ہوں گے جنہیں مستثنیٰ قرار دیا جا سکے اور جو اس انداز پر نہ سوچتے ہوں ان کا خون بھی شاید سرزمین مشرق سے ہوگا یا ان کی ماں لازماً یہاں سے گزری ہوگی (حاضرین کا قہقہہ) ورنہ ان سب کا تخم اور ضمیر ایسا ہی ہے۔

نطشے کہتا ہے: "نفس کشی کیوں کی جائے؟" اس کی بجائے نفس کو

پالنا چاہیے۔ دوسروں کی خدمت کیا چیز ہے؟ اس کی بجائے انسان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو چاہے اور اپنے آپ کو پوجے۔ نیز کمزور اور ناتواں لوگوں کو بے سہارا چھوڑ دینا چاہیے ـــــ برتر مرد وہ ہے جو طاقتور ہو اور طاقت کے ساتھ زندگی بسر کرے، اپنی خواہشات کو پورا کرے اور خوش رہے، اپنے آپ کو آقا اور مالک سمجھے، اس کی آقائی کی راہ میں جو بھی رکاوٹ در پیش ہو، اسے ہٹا دے، خطرے سے ہراساں نہ ہو اور جنگ سے نہ ڈرے۔

پھر وہ عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"عورت کی مرد سے برابری اور اس کے حقوق کی رعایت کا لازم ہونا بھی ایک غلط بات ہے۔ اصل چیز مرد ہے اور مرد کو چاہیے کہ جنگجو ہو عورت کا کام جنگجوؤں کو تفریح مہیا کرنا اور بچے پیدا کرنا ہے۔"

پس ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کامل انسان یعنی مثالی اور اعلیٰ انسان کو متعارف کرانے کا یہ بھی ایک معیار ہے جو مکتب قدرت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے مقابلے پر ایک اور مکتب ہے جو کمزوری کا پرچار کرتا ہے اور وہ نیکی اور خوبی کو کمزوری میں مضمر سمجھتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ ہوئے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ یہ اعتراض خصوصاً مسیحیت پر وارد ہوتا ہے کہ اس نے کمزوری پر مبنی اخلاق کا بہت زیادہ پرچار کیا ہے۔ یہی بات کہ اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اپنا بایاں گال بھی پیش کر دو ـــــ کمزوری کی تبلیغ ہے۔

اس معاملے میں اسلام کی منطق کیا ہے؟ کیا اسلام نے ان دونوں

میں طاقت کا پرچار کیا ہے یا کمزوری کا یا نہ طاقت کا اور نہ کمزوری کا؟ ہاں اس نے ایک اور لحاظ سے طاقت کا پرچار کیا ہے لیکن ایسی طاقت کا جو نطشے کی طاقت نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی طاقت ہے جس سے انسانیت کی اعلیٰ صفات ابھرتی ہیں۔ ایک ایسی طاقت کا جس سے مہربانی ابھرتی ہے، رحم ابھرتا ہے، شفقت ابھرتی ہے اور احسان ابھرتا ہے۔

اسلام میں طاقت اور توانائی کی دعوت دی گئی ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید اور روایات میں طاقت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور کچھ لوگ جنہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی دین نے اپنے پیروؤں کو طاقت اور توانائی کی جانب اتنی دعوت نہیں دی جتنی اسلام نے دی ہے۔

تاریخ تمدن کی گیارھویں جلد جو تمدن اسلام سے مخصوص ہے، اس میں ویل ڈورینٹ نے ایک جملہ کہا ہے: "کسی دین نے لوگوں کو طاقت اور قوت کی جانب اس قدر دعوت نہیں دی جتنی اسلام نے دی ہے۔" اس سلسلے میں بہت سے مطالب ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک مقام پر حضرت یحییٰ سے خطاب کیا گیا ہے:

(ہم نے کہا) اے یحییٰ! کتاب توریت کو قوت کے ساتھ تھام لو۔ (سورۂ مریم - آیت ۱۲)

آپ ایک اور جگہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کس جرأت کے ساتھ فرماتا ہے:

اور ایسے بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہتیرے اللہ والوں نے جہاد کیا۔ پھر ان کو خدا کی راہ میں جو مصیبت جھیلنا

پڑی، اس پر نہ تو انہوں نے ہمت ہاری ــــ نہ بودا پن دکھایا ــــ نہ دشمن کے آگے گڑگڑائے اور خدا تو ثابت قدم رہنے والوں سے الفت رکھتا ہے۔ (سورہ آل عمران۔ آیت ۱۴۶)

یعنی خدا فرماتا ہے کہ مومنین باہمت ہوتے ہیں اور وہ کمزوری و بزدلی کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔

۱۳۸ لہ خدا تو ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں یوں پرا باندھ کے لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ (سورہ صف۔ آیت ۴)

یعنی مومنین بڑے ثابت قدم ہوتے ہیں اور کوئی طاقت انہیں ان کی جگہ سے ہٹا نہیں سکتی۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دل ہیں۔ (سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

قرآن میں ایسی ہی اور بھی آیات ہیں جن میں شجاعت کو اسلام کی ایک قابلِ ستائش حقیقت کہا گیا ہے۔ عزت یعنی اونچا مقام رکھنا اور طاقت کا اس حد تک ہونا کہ انسان کو کوئی بھی دوسرا شخص ذلیل و خوار نہ کر سکے ــــ اسلام میں ایک ممدوح چیز ہے۔

قرآن مجید دشمن سے مقابلے کے بارے میں فرماتا ہے:

۱۳۹ لہ (مسلمانو) ان کفار کے مقابل جہاں تک ہو سکے زور بازو

اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے سامان مہیا کرو۔ اس سے تم
خدا کے اور اپنے دشمن پر دھاک بٹھا لوگے۔
(سورۂ انفال۔ آیت ۶۰)

دشمن کے مقابلے میں جتنی قوت ہو سکے بہم پہنچاؤ تاکہ وہ تمہاری
طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

قرآن یہ بھی فرماتا ہے:
"٭ جو لوگ تم سے لڑیں، تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو
اور زیادتی نہ کرو۔ خدا زیادتی کرنے والوں کو ہرگز دوست
نہیں رکھتا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۹۰)

یعنی دشمن سے لڑتے ہوئے بھی حق اور عدالت کو فراموش نہ کرو مثلاً
جب دشمن سے لڑو تو جنگ اس وقت تک جاری رکھو جب تک دشمن اسے جاری
رکھے۔ اگر دشمن اطاعت قبول کرے اور ہتھیار ڈال دے تو تم بھی ہتھیار استعمال
نہ کرو کیونکہ یہ بھی زیادتی اور تجاوز ہے۔ بوڑھوں کو مت قتل کرو، بچوں کو مت
قتل کرو، عورتوں کو مت قتل کرو اور ان سے معترض نہ ہو۔ جو لوگ میدان
جنگ سے چلے جائیں انہیں جانے دو اور جو شخص تم سے جنگ کرے فقط اس
کے ساتھ پوری قوت سے جنگ کرو۔

یہ ان احکام کا ایک سلسلہ ہے جو قرآن مجید میں ہیں۔ کیونکہ اس
طرح کی اور آیات بھی ہیں۔ اب ہم نمونے کے طور پر چند حدیثوں کی جانب
اشارہ کرتے ہیں، تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اسلام نے کس طرح بزدلی، خوف اور
کمزوری کی مذمت اور قوت و طاقت کی تعریف کی ہے۔ لیکن جس قوت اور

طاقت کی اسلام تعریف کرتا ہے وہ نطشے کے فلسفے سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی ـــــ کل رات میں اس کی مزید توضیح کروں گا۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

۱۴۱ـ مومن کے لیے دو چیزیں مناسب نہیں ہیں ـــــ یعنی کنجوسی اور بزدلی۔ (جامع السعادات جلد۲ صفحہ ۱۱۱)

ان کی مختصر تشریح یہ ہے:

۱۔ بخل اور وہ یہ ہے کہ روپیہ پیسہ اپنی جان سے عزیز تر رکھے۔

ب۔ خوف اور بزدلی، مومن بزدل نہیں ـــــ وہ بہادر اور طاقتور ہوتا ہے۔

رسول اکرمؐ اپنی ایک دعا میں فرماتے ہیں:

۱۴۲ـ اے پروردگار! میں دو چیزوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور وہ ہیں کنجوسی اور بزدلی۔ (جامع السعادات جلد۲ صفحہ ۱۱۱)

امام علی علیہ السلام مومن کے بارے میں فرماتے ہیں:

۱۴۳ـ مومن کا نفس پتھر سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

(نہج البلاغہ حکمت ۳۳۳ صفحہ ۹۱۵)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

۱۴۴ـ خدا نے ہر چیز میں اختیار مومن کو دیا ہے، سوائے ایک چیز کے جس کا اختیار اسے نہیں دیا گیا اور وہ ہے خوار و ذلیل ہونا ـــــ کیونکہ مومن ہمیشہ معزز ہوتا ہے اور وہ کبھی ذلت قبول نہیں کرتا۔ مومن پہاڑ سے بھی زیادہ بلند پایہ، زیادہ اونچا اور

زیادہ معزز ہوتا ہے، کیونکہ پہاڑ کو ایک کدال سے کھودا جا سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن کے دین میں سے کوئی چیز توڑی جائے۔ (سفینۃ البحار۔ مادۂ قوض)

یعنی یہ ناممکن ہے کہ مومن کے دین اور اس کی روح کا ایک بھی ٹکڑا کسی کدال سے کاٹا جائے، الگ کیا جائے اور اسے ریزہ ریزہ کیا جائے۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: خدائے تعالیٰ نے مومن کو تین خصلتیں دی ہیں:

(۱) —— دنیا اور آخرت میں عزت

(۲) —— دنیا اور آخرت میں نجات

(۳) —— ظالموں کے سینے میں ہیبت

(المواعظ العددیہ صفحہ ۱۰۳)

یعنی مومن کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ظالم اپنے دل میں اس کی ہیبت اور خوف محسوس کرتا ہے۔ نیز ہمیں غیرت کے بارے میں بھی کچھ روایات ملتی ہیں، کیونکہ غیرت بجائے خود ایک طاقت ہے اور بے غیرتی ایک قسم کی کمزوری ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: ابراہیمؑ پیغمبرِ غیور تھے اور میں ان سے زیادہ غیور ہوں۔ جو شخص مومنوں اور مسلمانوں کے بارے میں باغیرت نہ ہو خدا اس کی ناک کاٹ دیتا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ سعد غیور ہے —— میں اس سے زیادہ غیور ہوں اور میرا خدا بھی غیور ہے۔ اس موضوع پر بھی ہمارے پاس اور بھی بہت سی روایات موجود ہیں۔

اقبال پاکستانی نے ایک جملہ کہا اور یہ جملہ بڑا عمدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسولینی کے جواب میں کہا گیا ہے۔

مسولینی کہتا ہے: جس کے پاس لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے، اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے پاس روٹی ہو تو پھر اپنے پاس لوہا (طاقت اور اسلحہ) رکھ۔

اقبال نے کہا: جو بذات خود لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے۔

یعنی مسولینی اسلحہ پہ بھروسا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جس کے پاس مادی قوت ہے اس کے پاس روٹی ہے۔

لیکن اقبال روح پہ تکیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو شخص خود لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے۔

امیرالمومنین علؑ نے فرمایا:

مومن کا نفس پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ان جملوں کا مقصد اور مفہوم ایک ہی ہے

بہرحال اسلام قوت اور طاقت کی دعوت دیتا ہے اور ہم نہج البلاغہ میں دیکھتے ہیں کہ امیرالمومنینؑ نے طاقت اور قوت کی کس قدر دعوت دی ہے اور کمزوری کو اس کے لیے قطعاً مناسب نہیں سمجھا۔ آپ فرماتے ہیں:

۲۵؎ خدا کی قسم! جن افرادِ قوم پہ ان کے گھروں کے حدود کے اندر ہی حملہ ہو جاتا ہے وہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۷ صفحہ ۱۵۳)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

۲۶؎ ذلیل آدمی ذلت آمیز زیادتیوں کی روک تھام نہیں

کرسکتا اور حق تو بغیر کوشش کے نہیں ملا کرتا۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۹ صفحہ ۱۵۹)

خلاصہ یہ ہے کہ کمزور آدمی ظلم کو کبھی نہیں روک سکتا اور سعی و کوشش کے بغیر حق ہرگز حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اہل مغرب ایک جملہ کہتے ہیں: "حق لینے کی چیز" یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہ آیا حق لینے کی چیز ہے یا دینے کی چیز ہے؟ یعنی کیا حق ایک ایسی چیز ہے جو انسان اپنی خوشی سے حقداروں کو دیدیتے ہیں یا ایک ایسی چیز ہے جو حقداروں کو خود لینی چاہیے؟ بعض مکتب کہتے ہیں کہ حق دینے کی چیز ہے یعنی جس شخص نے لیا ہو اسے چاہیے کہ وہ واپس کرے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایسا نہ کرے" بہر حال حق دینے کی چیز ہے لینے کی نہیں۔

مسیحیت اس بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حق تمہیں دیا جائے ہم سفارش کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ حق تمہیں دیا جائے۔ لیکن تمہیں اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ انسانیت اور شان کے خلاف ہے" اس لیے ظاہر ہے کہ حق دینے کی چیز ہے مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حق فقط لینے کی چیز ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ جس شخص نے حق مار لیا ہو وہ دوبارہ آئے اور اسے واپس کر دے؟

اسلام کے نقطہ نگاہ کے مطابق "حق لینے کی چیز بھی ہے اور دینے کی چیز بھی ہے"۔ یعنی حق حاصل کرنے کے لیے دو محاذوں پر جنگ کرنی چاہیے کیونکہ اسلام کے مکتب کی بنیاد یہی ہے۔ جس شخص نے کسی کا حق چھینا ہو اسلام اسے اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے وہ حق ادا کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور پھر

وہ ادا کر بھی دیتا ہے لیکن اسلام اسی پر اکتفا نہیں کرتا اور اس کے ساتھ ہی اپنے حق سے محروم کیے گئے شخص سے کہتا ہے کہ حق لینے کی چیز ہے اور تمہیں اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہونا اور اسے واپس لینا چاہیے۔

ایک جملہ ہے جو امام علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام اپنے مشہور خط میں نقل کیا:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کئی موقعوں پر یہ فرماتے سنا: اس قوم میں پاکیزگی نہیں آسکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق نہیں دلایا جاتا۔"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ عہد نامہ ۵۳ صفحہ ۷۶۲)

یعنی کوئی امت اور کوئی قوم پاکیزگی، ترقی اور بہبود کے مقام پر نہیں پہنچتی مگر یہ کہ اس سے پہلے اس نے یہ مرحلہ طے کیا ہو کہ کمزور طاقتور کے مقابلے پر اٹھ کھڑا ہو اور اپنا حق یوں طلب کرے کہ اس کی زبان سے لکنت پیدا نہ ہو۔

پس جو کمزور اپنا حق طلب نہیں کر سکتا وہ اسے جانتا ہی نہیں ہے جس معاشرے میں کمزور لوگ اتنے ضعیف النفس ہوں کہ اپنے حقوق کا مطالبہ بھی نہ کر سکیں ـــــــ وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ گزشتہ زمانے میں ہمارے بزرگ مرد کیسے تھے؟ خود رسول اکرمؐ کیسے تھے؟

رسول اکرمؐ کی خصوصیات میں سے ایک روحانی قوت اور جسمانی طاقت تھی۔ آپ طاقتور تھے، شجاع تھے اور آپ قوت و شجاعت کی تعریف کرتے تھے۔ پس اسلام طاقت کو انسان کے لیے ایک قدر کے طور پر پہچانتا ہے۔

اسلام میں طاقت اور توانائی انسانی قدروں میں سے ایک قدر ہے اور اس کے ساتھ کئی اور قدریں بھی ہیں۔ یہ سب قدریں مل کر اسلام کا مطلوبہ کامل انسان تشکیل دیتی ہیں۔

نطشے نے تمام انسانی قدروں میں سے صرف یہی ایک قدر دیکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ ایک باغ میں سے فقط ایک پودے کی آبیاری کریں تو وہی بڑھے گا اور دوسرے بہت سے پودے خشک ہو کر رہ جائیں گے۔

نطشے کے مکتب اور اسلام میں یہ فرق ہے کہ اس کے مکتب میں انسانیت کو فقط ایک قدر حاصل ہے اور وہ ہے طاقت۔ تمام دوسری قدریں اس میں گم ہو جاتی ہیں اور اس کی حیثیت پیچھے چلی جاتی ہیں۔ لیکن اسلام میں طاقت انسان کی بہت سی بلند قدروں میں سے ایک قدر ہے اور جب یہ قدر دوسری قدروں کے ساتھ ملتی ہے تو ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

گیارھویں نشست

مختلف مکاتب فکر کے نظریات کی تفصیل (۵)

۱۲۸ـ اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور نیکی کرنے اور قرابتداروں کو کچھ دینے کا حکم کرتا ہے۔ وہ بدکاری، بُری حرکتوں اور سرکشی کرنے سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں آگاہ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۹۰)

گزشتہ نشست میں کامل انسان کے بارے میں طاقت و قوت کے نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی تھی۔ اس مکتب میں کمال فقط طاقت کے مساوی ہے اور نقص کمزوری کے مساوی ہے حتیٰ کہ اچھے اور برے کو بھی اسی پیمانے اور اسی معیار سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ اچھے کے معنی طاقتور اور اچھائی کا مطلب توانائی ہے اور بُرے کے معنی کمزور اور بُرائی کا مطلب کمزوری ہے۔ عام طور پر فلسفی اپنی بحثوں کی توجیہہ کمال اور نقص کی بنیاد پر اور متکلمین حسن و قبح (نیکی اور بدی) کی بنیاد پر کرتے ہیں جبکہ مکتب قدرت میں ان دونوں ہی

کو طاقت اور کمزوری کے معیار پر جانچا گیا ہے۔ فلسفی کہتے ہیں کہ کمال اور نقص ان کے نزدیک کمال کے معنی طاقت اور نقص کا مطلب کمزوری ہے۔

متکلمین کہتے ہیں حسن و قبح یا نیکی و بدی ــــ ان کے خیال میں نیکی کے معنی طاقت اور بدی کا مطلب کمزوری ہے۔ تاہم مکتب قدرت میں حق و باطل اور عدل و ظلم کو بھی قدرتی طور پر اسی پیمانے یعنی طاقت اور کمزوری کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے، یعنی حق ایسی چیز نہیں جو طاقت سے جدا ہو سکے اور باطل ایسی چیز نہیں جو کمزوری سے جدا ہو سکے۔

عدل اور ظلم کی بھی یہی صورت ہے، یعنی عدل کے معنی طاقت اور ظلم کا مطلب کمزوری ہے۔ لہٰذا اگر دو شخص آپس میں لڑ پڑیں اور ان میں سے ایک دوسرے سے زیادہ طاقتور ہو اور غالب آجائے تو اس مکتب کے مطابق وہی زیادہ کامل ہے۔

بہتر ہے نیز صاحب حق اور صاحب عدل بھی ہے، اس کے برعکس جو مغلوب ہو جائے اور شکست کھا جائے ــــ وہ ناقص ہے۔ مغلوب ہونا اور کمزور ہونا ایک نقص ہے اور اس کے معنی بُرا، ظالم اور باطل پر ہونے کے ہیں۔ بنا بریں اس مکتب میں دو غلطیاں وجود رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس مکتب میں طاقت کی قدر کے سوا تمام انسانی قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ طاقت خود ایک انسانی قدر ہے اور آجکل کی اصطلاح میں ایک خوبی ہے اور ہمارے اپنے فلسفیوں کی اصطلاح میں ایک کمال ہے ــ اس میں شک نہیں کہ طاقت ــــ کمال کے مساوی ہے، لیکن کمال ــــ طاقت کے مساوی نہیں ہے۔

لہٰذا ہمارے حکماء اور فلسفی ذات واجب الوجود کے بارے میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ وہ وجود محض ہے اور وجود محض کمال کے مساوی ہے۔ اس کے بعد وہ ہر اس چیز کو جو کمال کے مساوی ہو، ذات خدا کے لیے دلائل سے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ایک قدرت ہے۔ قدرت اپنی ذات کی حد تک کمال ہے اور وہ جو کچھ بھی ہے کمال ہے۔ جیسا کہ علم، ارادہ، اختیار اور زندگی کمال ہیں۔ لہٰذا انسان کے بارے میں بھی اس بات کی تردید نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے لیے بھی قوت اور قدرت ایک کمال ہے۔ کمزوری کی جانب میلان رکھنے والے مکاتب کہ جنہوں نے کمزوری کا پرچار کیا ہے وہ قطعی طور پر غلطی پہ ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ قدرت تنہا کمال نہیں ہے جیسے کہ حق تعالیٰ کی ذات میں بھی قدرت واحد صفت کمالیہ نہیں ہے۔ بلکہ ذات حق کی بہت سی صفات کمالیہ اور بہت سے اسمائے حسنیٰ ہیں۔ ان صفاتِ کمالیہ میں سے ایک قدرت ہے اور ان اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم قادر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کی صفت کمالیہ فقط قدرت ہی ہو۔

اس مکتب کی پہلی غلطی جو اگرچہ پہلی غلطی سے بڑی نہیں تو چھوٹی بھی نہیں ہے اور وہ خود قدرت کے بارے میں ہے۔ پھر نہ صرف یہ کہ اس مکتب میں قدرت کے علاوہ دوسرے کمالات اور قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بلکہ نظریۂ قدرت کا مدعی ہونے کے باوجود اس مکتب نے قدرت کو بھی ٹھیک طور پر نہیں سمجھا۔ کیونکہ اس نے قدرت کو صرف ایک چیز میں دیکھا ہے۔ یعنی اس کے دو مختلف درجوں میں سے صرف ایک درجے کو پہچانا کہ جو حیوانی قدرت ہے۔ حیوان کی قدرت اس زور سے عبارت ہے جو اس کے پٹھوں

میں ہوتا ہے۔ حیوان کی تمام قدرت عضلاتی ہے جو اس کے عضلات (پٹھوں) میں پائی جاتی ہے اور اس کی تمام خواہشیں بھی نفسانی خواہشیں ہوتی ہیں۔ انسان کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں پٹھوں کی قدرت کے علاوہ بھی قوت کا ایک مبدا وجود رکھتا ہے۔ یعنی بالفرض اگر ہم مکتب قدرت کے حامل ہوں تو نتیجہ وہ نہیں ہوگا جو نطشے نے اخذ کیا کہ جس کی بنا پر انسان کے لیے قدرت کے تابع ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا آپ قدرت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور جب آپ کو قدرت حاصل ہو جائے تو جو بھی کمزور ہو اس کے سر پہ ضرب لگائیں، اپنے نفس کی پرورش کریں اور اس دنیا کی مادی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں۔ لیکن نہیں ـــــ اس قدرت کا نتیجہ بھی یہ نہیں ہے!

اب میں اسلامی معیارات کے ساتھ ایک وضاحت کرتا ہوں اور رسول اکرمؐ کے بارے میں ایک داستان سے ابتدا کرتا ہوں:

حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ ایک دن رسول اکرمؐ مدینہ میں کسی جگہ سے گزر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ مسلمان نوجوان ایک پتھر کو وزن اٹھانے کی مشق کے طور پر اٹھا اٹھا کر اپنا زور آزما رہے WEIGHT LIFTING تھے۔ وہ ایک بڑا سا پتھر تھا اور اس کے ذریعے ان کے زور کا اندازہ کیا جا رہا تھا، جیسے آجکل وزن اٹھانے کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی کہتا تھا میں نے خوب وزن اٹھایا ـــــ اور کوئی کہتا ہے کہ میں نے خوب اٹھایا ہے۔

رسول اکرمؐ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس مقابلے کا ثالث بن جاؤں؟

یہ سن کر سبھی خوش ہوئے اور انہوں نے یہ تجویز مان لی۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:

اچھا تو میں تمہارا ثالث ہوں، اب تمہیں پتھر اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے ایک معیار مقرر کرتا ہوں جس سے پتھر اٹھائے بغیر ہی پتہ چل جائے گا کہ کون زیادہ طاقتور ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

وہ شخص جسے نفس ایک گناہ کی ترغیب دے، اس کے اندر گناہ کی خواہش بھی ہو اور پھر بھی وہ اس خواہش کا مقابلہ کرے۔ نیز کسی کو کوئی چیز پسند ہو کہ جس میں گناہ اور معصیت ہو، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے نفس کے مقابلے پر ڈٹ جائے تو وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

یہاں رسول اکرمؐ نے نفسانی خواہش کے مقابلے میں قوت ارادی کو پیش کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ زور فقط یہ نہیں ہے کہ ایک پتھر زمین سے اٹھا لیا جائے اور قدرت فقط یہ نہیں ہے کہ ایک بہت وزنی چیز کو اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا جائے کیونکہ یہ ایک ایسی قدرت ہے جو پٹھوں کے اندر ہوتی ہے اور یہ حیوانات کے پٹھوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ قدرت انسان اور حیوان کے درمیان مشترک چیز ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ قدرت کمال نہیں ہے ہے تو وہ بھی ایک کمال لیکن انسان کے بازوؤں اور اس کے بدن کے پٹھوں میں جو قدرت پائی جاتی ہے، اس سے بالاتر "قوت ارادی" ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشوں کا مقابلہ کر سکے۔

اسی منطق کی بنا پر اسلامی اخلاق اور بالخصوص ہماری عرفانی ادبیات میں ہمیشہ ان مسائل کو ایک قدرت کا نام دیا گیا ہے۔

رسول اکرمؐ نے مزید فرمایا:

۱۴۹۔ تمام لوگوں میں زیادہ شجاع، دلاور اور دلیر وہ شخص ہے جو اپنی نفسانی خواہشات پر غلبہ پا لے۔

(نہج الفصاحت۔ کلمہ ۲۹۹)

یہاں بھی شجاعت، قدرت اور غلبے کا مسئلہ ہے۔ جیسا کہ سعدی شیرازی نے کہا ہے:

گرت از دست برآید دہنی شیریں کن
مردی آن نیست کہ مشتی بزنی بر دہنی

یعنی مردانگی یہ نہیں ہے کہ انسان دوسرے کے منہ پر مکہ کھینچ مارے بلکہ حقیقی قوت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہش کے برخلاف دوسرے کا منہ میٹھا کر دے۔

مولوی معنوی کہتے ہیں:

وقت خشم و وقت شہوت مرد کو
طالب مردی چنینم کو بکو

جو طیش کی حالت اور نفسانی خواہش کی بھڑک کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہم جگہ جگہ ایسے ہی مرد کی تلاش میں ہیں۔

(مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۴۹۵)

یہاں وہ مردانگی کو اس طرح جانچتے ہیں ــــــ یعنی جب انسان کا غصہ

بھڑک اٹھے اور آگ کی بھٹی میں تبدیل ہو جائے تو مرد وہ ہے جو قوی ارادے کا مالک ہو اور یہ آگ کی بھٹی جو غصے کی آگ ہے، اس کا مقابلہ کرے ـــــ اسے کہتے ہیں مرد ـــــ اسے کہتے ہیں قوت اور قدرت ـــــ نیز جب شہوت جوش میں آجائے اور انسان کو بے اختیار کر دے تو قدرت یہ ہے کہ انسان اس وقت اپنی شہوت کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے۔ علمائے اخلاق نے جو اخلاقی خوبیاں بتائی ہیں اور نطشے نے اسے کمزوری کہہ کر ان کی نفی کی اور انہیں رد کر دیا ہے۔ اگر ہم ان کی صحیح جانچ پڑتال کریں تو ظاہر ہو گا کہ وہ سب قدرت اور قوت کی علامتیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ مانتے ہیں کہ بعض اوقات کچھ چیزیں جو درحقیقت قدرت نہیں بلکہ کمزوری ہیں، غلطی سے قدرت سمجھ لی جاتی ہیں۔ لہٰذا علمائے اخلاق نے ہمیشہ کہا ہے کہ جذبات کو عقل اور ایمان کے ساتھ توام ہونا چاہیے۔ یعنی صرف یہ کہ انسان کے جذبات یکلخت برانگیختہ ہو جائیں کافی نہیں ہے بلکہ انہیں عقل کی ترازو پر تولنا چاہیے کہ آیا یہ جذبہ بجا اور منطقی ہے یا نہیں؟ مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں:

ترحم بر پلنگ تیز دندان
ستمکاری بود بر گوسفندان

پھاڑ کھانے والے چیتے اور بھیڑیے پر رحم کرنا بیچاری بھیڑوں پر ظلم ہے۔

یعنی اگر آپ کسی شخص کو اس بھیڑیے پر رحم کھاتے ہوئے دیکھیں جس نے سیکڑوں بھیڑوں کو پھاڑ کھایا ہو تو جان لیں کہ یہ رحم بھیڑوں کے بارے میں ظلم کے برابر ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مثال ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ ایک ظالم

انسان پر رحم کھانا دراصل محکوم، مظلوم اور محروم لوگوں پر ظلم ہے۔ ظالموں پر کمزور لوگ ہی رحم کھاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ایک آیت ہے:

ایسے مرد و عورت کے بارے میں جو زنا کرے۔ چنانچہ اگر ایک بیوی والا مرد زنا کرے تو اسلام میں اس کی سزا سنگسار کرنا، قتل کر دینا اور مار ڈالنا ہے۔ نیز اگر شادی شدہ عورت زنا کرے تو اس کی سزا بھی سنگسار کرنا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کہتا ہے:

۵۱ اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکم خدا کے نافذ کرنے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا ترس لحاظ نہ ہونے پائے اور دونوں کی سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو وہاں موجود ہونا چاہیے۔

(سورۂ نور۔ آیت ۲)

یعنی مومنین کا ایک گروہ وہاں موجود ہونا چاہیے اور وہ لوگ جائیں اور انہیں قتل کرنے کے کام میں شرکت کریں۔ لیکن یہ ایک ایسا مقام ہے کہ وہ کمزور نفوس کے لوگ جو معاشرے کی بلند تر مصلحتوں کو نہیں سمجھتے، جب یہ دیکھتے ہیں کہ دو انسان مارے جانے والے ہیں تو ان کے جذبات ابھرتے ہیں کہ کیا ہی اچھا ہو کہ ان پر رحم کیا جائے۔

انہی جیسوں کے خیال کی تردید کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے کہ یہ موقع الٰہی سزا کے اجرا اور قانون خداوندی پر عمل کرنے کا ہے جو بنی نوع انسان کی بلند اور ہمہ گیر مصلحتوں کی بنیاد پر بنایا گیا ہے اور اس میں رحمدلی کی کوئی

گنجائش نہیں۔ کیونکہ یہ رحمدلی معاشرے پر ظلم ہے۔ یہ بات آجکل بھی بہت زیادہ زیر بحث رہتی ہے اور اکثر لوگ کہتے ہیں کہ پھانسی کیوں دی جائے؟ موت کی سزا میں کیا معقولیت ہے؟ موت کی سزا سراسر غیر انسانی فعل ہے۔ ان کی بات کا مطلب یہ ہے کہ مجرم نے خواہ کسی بھی جرم کا ارتکاب کیا ہو اسے موت کی سزا نہیں دینی چاہیے۔ پھر اس کی توجیہہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "مجرم کی اصلاح کرنی چاہیے" یہ ایک عجیب اور بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجرم کی اصلاح کرنی چاہیے اور ایسا نہیں ہونے دینا چاہیے کہ ان سے جرم سرزد ہو لیکن یا تو معاشرے میں ضرورت کے مطابق تربیت نہیں ہو پاتی جیسا کہ اکثر معاشروں کا حال ہے اور نہ صرف یہ کہ اصلاح کے عوامل وجود نہیں رکھتے بلکہ فساد اور بگاڑ کے عوامل وجود رکھتے ہیں۔ بالفرض اگر اصلاح کے کافی عوامل وجود رکھتے ہیں تو بھی معاشروں میں ہمیشہ انحراف کے عوامل بھی ہوتے ہیں اور وہ اصلاحی عوامل کے باوجود جرائم کے ارتکاب کا موجب بنتے ہیں۔ ان کا کیا علاج کرنا چاہیے؟ جونہی موت کی سزا منسوخ کی جائے گی اس کے ساتھ ہی وہ مجرم جن کی تمام کوششوں کے باوجود اصلاح نہ ہو سکی ہو یا معاشرے میں تربیتی عوامل وجود نہ رکھتے ہوں یا بالفرض موجود ہیں لیکن کافی نہیں ہیں تو وہ پہلے کی طرح جرائم میں سرگرم ہو جائیں گے۔

کیا یہ درست ہے کہ ہم آج اس بہانے کہ مجرم کی اصلاح کرنی چاہیے اسے چھوڑ دیں تاکہ وہ جرم کرے اور پھر اس کی اصلاح کریں؟ یہ تو ارتکاب جرم کے لیے مجرم کی حوصلہ افزائی کرنا ہے، کیونکہ وہ مجرم کہتا ہے: معاشرے نے آج تک میری اصلاح کے بارے میں نہیں سوچا، جب میں بچہ تھا تو

میرے باپ نے میری تربیت اور اصلاح نہیں کی اور جب میں بڑا ہو گیا تو بھی کسی نے میری اصلاح نہیں کی۔ بہتر ہو گا کہ میں جرم کروں اور مجھے گرفتار کر کے قید خانے میں بھیج دیا جائے اور وہاں میری تربیت اور اصلاح کی جائے تاکہ میں ایک اچھا آدمی بن جاؤں۔

نیز ایک اور مجرم کہتا ہے: چور کے ہاتھ کاٹنے کا کیا مطلب ہے؟ یہ ایک غیر انسانی فعل ہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کی بینائی کمزور ہے۔ آپ اخبارات میں جرائم کے صفحات پر نگاہ ڈالیں تو دیکھیں گے کہ چوری کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ کتنی کثیر مقدار میں مال لوٹا جاتا ہے' اس میں کتنے ہی اور جرائم بھی ہوتے ہیں اور کتنے انسان مارے جاتے ہیں۔ اگر چور کو قرار واقعی سزا دی جائے اور چور کو پورا پورا یقین ہو کہ اگر وہ چوری کرے گا تو پولیس اور قانون کے چنگل میں پھنس جائے گا۔ پھر قانون اس کی چار انگلیاں کاٹ دیگا اور جرم کا یہ داغ مرتے دم تک اس کے بدن پر رہے گا۔ بخدا اگر دو چوروں کو بلکہ ایک ہی چور کو ایک مرتبہ یہ سزا دی جائے تو چوری مکمل طور پر ختم ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے اس کا دروازہ بند ہو جائے۔

آج سے پچاس یا ساٹھ سال بیشتر جو حاجی مکہ گئے تھے' وہ جانتے ہیں کہ عربستان میں چوری کی وجہ بڑی عجیب تھی۔ حاجیوں کے وہ قافلے جن میں دو ہزار سے کم افراد ہوتے' وہ ان راستوں پر سفر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ حالانکہ وہ مسلح ہوتے تھے اور اپنے ساتھ فوجیوں کو لے جاتے تھے۔ اس کے باوجود بھی کوئی سال نہیں گزرتا تھا جب یہ نہ سنا جاتا ہو کہ بدوؤں نے حاجیوں کے قافلوں پر شبخون مارا' اتنے آدمیوں کو مار ڈالا اور اتنا مال لوٹ کر لے گئے۔

سعودی حکومت نے خواہ ہزاروں برے کام کیے ہوں لیکن کم از کم یہ اچھا کام کیا ہے کہ چور کو عرفات میں یا منیٰ میں یا نہ جانے کہاں لایا گیا۔ ان دنوں میں وہاں تمام حاجی موجود تھے اور قرآن کے حکم: "ان کی سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو وہاں موجود ہونا چاہیے" کے مطابق ان سب کی موجودگی میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، اور چور کا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا۔ پھر دیکھنے میں آیا کہ وہ سب لوگ جو چور تھے ان کی اصلاح ہو گئی اور آخر کار چوری کا خاتمہ ہو گیا۔ بلاشبہ ان میں سے کچھ لوگ سخت ناداری کی وجہ سے چوری کرتے تھے اور وہ ناداری اب بھی موجود ہے۔ کیونکہ فقط سعودی شہزادے ہی مالدار ہیں۔

پھر لوگوں نے دیکھا کہ حاجیوں کا سامان گر جاتا ہے اور کئی دن گزر جاتے ہیں لیکن کوئی شخص اسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارشاد قرآنی: "حکم خدا کے نافذ کرنے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا ترس و لحاظ نہ ہونے پائے" کے مطابق چوری کرنے والے کو صحیح مقام پر کاٹ دیا جاتی ہے یعنی یہاں رحم کھانا غیر منطقی ہے اور قساوت کے مواقع بھی اور ہوتے ہیں۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ مکتب قدرت جو ہمیشہ قوت کا دم بھرتا اور برتر مرد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس نے جہاں دوسری انسانی قدروں کو نہیں پہچانا خود قدرت کی حقیقت کو نہیں جانا کہ وہ کیا ہے۔ ہاں اصل طاقت اور قدرت یہ ہے کہ انسان دوسرے کی مدد کے لیے دوڑے اور حقیقی صاحب قوت و قدرت روح وہ ہے جو اپنے فرزندوں سے کہتی ہے:

ظالم کے دشمن اور مظلوم کے مددگار بنو۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ وصیت ۴۷ صفحہ ۷۴۷)

امام علی علیہ السلام اپنے دو عزیز فرزندوں حسن اور حسین علیہما السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

پیارے فرزندو! تمہاری قدرت اور تمہاری قوت کو ہمیشہ مظلوم کی مدد میں کام آنا چاہیے اور ظالم کے ساتھ جنگ میں صرف ہونا چاہیے۔ یہ ہے قدرت .... لیکن وہ دشمنیاں، حسد اور نفرتیں جو نطشے پیش کرتا ہے اتفاقاً وہ سب کی سب کمزوری سے جنم لیتی ہیں ۔ہاں تو جس آدمی کا دل ہمیشہ یہ چاہتا ہو کہ لوگوں سے انتقام لے، جو آدمی لوگوں کی برائی چاہتا ہو، جو شخص سیڈزم میں مبتلا ہو اور ہمیشہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہو، جیسا کہ نطشے نے کہا ہے، وہ ایسی باتیں قدرت کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ کمزوری کی بدولت کرتا ہے۔ کیونکہ انسان جتنا زیادہ صاحب قوت ہو اتنا ہی اس کا حسد اور کینہ کم ہوتا ہے۔

امام حسینؑ فرماتے ہیں: "طاقت و قوت کینے کو ختم کر دیتی ہے"

یہ جملہ بڑا عجیب ہے، جس کی بنیاد بے حد دقیق نفسیاتی مشاہدے پر رکھی گئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں طاقت کینے کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ یعنی جب انسان اپنے اندر طاقت محسوس کرتا ہے تو اس میں دوسروں کے لیے کینہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے برعکس کمزور آدمی ہے، یہ کمزور آدمی ہی ہے جو ہمیشہ دوسروں کے لیے کینہ رکھتا ہے اور ان سے حسد کرتا ہے۔

امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کا ایک جملہ غیبت کے بارے میں ہے

اور وہ بھی بڑا بیش بہا ہے۔ آپ سے پوچھا گیا: جو لوگ غیبت کرتے ہیں، جن کا جی چاہتا ہے کہ ہمیشہ دوسروں کی پیٹھ پیچھے بُرائی کریں اور دوسروں کی بدگوئی کر کے لذت محسوس کرتے ہیں، وہ کون لوگ ہیں؟

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: وہ وہی لوگ ہیں جو کمزور، عاجز اور ناتواں ہوتے ہیں۔

۱۵۲۔ کمزور آدمی کا یہی زور چلتا ہے کہ وہ پیٹھ پیچھے برائی کرے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ حکمت ۴۶۱ صفحہ ۹۵۲)

غیبت ایک کمزور انسان کی کوشش کی انتہا ہے، ایک قوی اور صاحب قدرت انسان جو اپنی روح میں قدرت کا احساس کرتا ہے اسے غیبت کرتے ہوئے شرم آتی ہے اور وہ غیبت کو گھٹیا اور کمزور انسانوں کا کام سمجھتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ امام علی علیہ السلام غیبت کو کمزوری پر مبنی قرار دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایک مقتدر روح ہرگز غیبت نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ آپ زنا کو بھی کمزوری کا نتیجہ قرار دیتے اور فرماتے ہیں:

۱۵۳۔ غیرت مند کبھی زنا نہیں کرتا۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۳۰۵ صفحہ ۹۰۷)

یعنی ساری دنیا میں ایک آدمی بھی جو اپنے اندر ذرہ بھر غیرت رکھتا ہے، اس نے کسی عورت سے زنا نہیں کیا اور دوسروں کی عزت پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔ ہاں وہ فقط بے غیرت آدمی ہیں جو یہ کام انجام دیتے ہیں۔

بے غیرت آدمی سے مراد وہ انسان ہے جو اپنے اندر کمزوری محسوس کرتا ہے یعنی وہ آدمی کہ اگر دوسرے اس کے ناموس کے ساتھ وہی کام انجام

دیں تو اسے تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ فقط بے غیرت لوگ ہیں جو زنا کرتے ہیں اور غیور لوگ ہرگز زنا نہیں کرتے لیکن نطشے ان قدروں کو نہیں پہچانتا اور وہ یہ کہتا ہے کہ قدرت کے معنی بازو کی قوت اور اسلحہ کی طاقت کے ہیں۔ قدرت کے معنی اپنے پاس لوہا ہونا اور اس کے ساتھ دوسروں کے سر پھوڑنا ہیں۔ اس کا سپرمین SUPERMAN ایک بہت بڑا حیوان ہے، وہ ایک ایسا مرد ہے جس کے بازوؤں میں بہت زیادہ زور ہے لیکن اسے روحانی قدرت اور قوت کی قطعاً کوئی خبر نہیں ہے۔

میں اسلام کے مکتب میں قدرت ایک انسانی قدر، ایک انسانی کمال اور کامل انسان کے چہرے کے خطوط میں سے ایک خط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کمزور انسان کو پسند نہیں کرتا اور خدا کو سست اور کمزور انسان اچھے نہیں لگتے۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام قدرت کو انسان کی واحد قدر نہیں سمجھتا اور وہ دوسری قدروں کا بھی قائل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے قدرت کی تعبیر نطشے اور سوفسطائی اور میکیاولی کی تعبیر سے مختلف ہے۔ اسلام انسان میں قدرتوں کا قائل ہے اور ان کو تقویت پہنچاتا اور ابھارتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اس سے مختلف ہے جو نطشے نے کہا ہے، کیونکہ اس میں معاشرے کی بھلائی ہے۔ بعد میں وہ کہتا ہے:

یہ جو انسان کا دل پسیجتا ہے تو یہ کمزوری کی وجہ سے ہے ــــ نہیں ــــ یہاں گفتگو فیاضی کی ہے، گفتگو سخاوت کی ہے اور گفتگو بھلائی کرنے کی ہے۔ نطشے صاحب! آپ معاملے کو اس طرف سے کیوں نہیں دیکھتے؟

آپ اس معاملے کو اس زاویے سے دیکھیے کہ ایک صاحب قدرت شخص کا فیض دوسروں کو پہنچتا ہے یا ایک کمزور شخص کا؟ کیا قدرت سے فیض پہنچایا جا سکتا ہے یا کمزوری سے؟ ہاں فیض قدرت ہی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔

ایک اور مکتب بھی ہے اور وہ مکتب محبت ہے کہ جس کا پرچار ہندوستان میں زیادہ ہوا ہے اور کسی حد تک مسیحیوں نے بھی اسے رواج دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسیحی اپنے مذہب کو مکتب محبت کہتے ہیں لیکن وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اب اس کو مکتب ضعف کا نام دینا چاہیے اور وہ مکتب اصل میں کمزوری کی ستائش کرنے والا ہے لیکن اہل ہند کے مکتب کو صحیح طور پر مکتب محبت کہا جا سکتا ہے۔ مکتب محبت میں انسان کا کمال خدمت خلق اور لوگوں سے محبت کرنے کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ یہ نطشے کے مکتب کے بالکل برعکس ہے اور اس نے جن چیزوں کی نفی کی ہے اس کے مقابلے میں ان کا اثبات کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جس کا فیض خلق خدا تک پہنچے اور انسانیت کے معنی خلق خدا کو فیض پہنچانے کے ہیں لیکن مغربی مکاتب جب انسانیت اور انسان کی جانب جھکاؤ کی بات کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد وہی لوگوں کی خدمت اور لوگوں سے محبت ہی ہوتی ہے۔

ہمارے مجلات اور جرائد جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیز انسانی ہے یا انسانی نہیں ہے تو انسانی ہونے سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ خلق خدا کے لیے نفع رساں ہے اور غیر انسانی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لیے مفید

نہیں ہے۔ پس اس بنا پر انسانیت اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ انسانوں کی اور تمام خلقِ خدا کی خدمت کی جائے۔ خود ہمارے شعرا نے اس سلسلے میں مبالغہ آمیز تعبیرات کی ہیں، مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں:

عبادت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

گدڑی اوڑھے ہوئے مصلّے پر بیٹھ کر تسبیح پھیرنا نہیں، بلکہ خلقِ خدا کی خدمت کرنا عین عبادت ہے۔

بلاشبہ اس میں سعدی کا ایک اور مقصد بھی ہے اور وہ ان صوفیوں پر تنقید کرنا ہے جن کا کام تسبیحیں پڑھنا، سجادہ پر بیٹھنا اور درویشی کی گدڑی اوڑھنا ہے اور لوگوں کو خیر و اصلاح کے کاموں سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ سعدی اگرچہ خود ایک درویش ہیں لیکن ان کا روئے سخن ان درویشوں کی طرف ہے کہ خدمتِ خلق کی بات جن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کئی مواقع پر یہی بات کچھ اور لوگوں نے اس سے مختلف تعبیرات کے ساتھ کہی ہے لیکن یہ تعبیرات درست نہیں ہیں مثلاً:

می بخور منبر بسوزاں، مردم آزاری مکن

شراب پیو، مسجد کا منبر جلاؤ ـــــ مگر لوگوں کو ستانے سے باز رہو۔

ان کے نقطۂ نگاہ کے مطابق دنیا میں فقط ایک بدی وجود رکھتی ہے اور وہ مردم آزاری ہے اور ایک نیکی وجود رکھتی ہے اور وہ لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔ چنانچہ مکتبِ محبت کے نقطۂ سے عالمِ بشریت میں

فقط ایک کمال وجود رکھتا ہے ـــــــ ایک ہی قدر وجود رکھتی ہے اور وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا ہے۔ نیز صرف ایک ہی نقص وجود رکھتا ہے ـــــــ ایک بدی وجود رکھتی ہے اور وہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس مکتب پر بھی تنقیدی نظر ڈالیں اور اس کی بھی جانچ پڑتال کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق خدمت خلق اور لوگوں کے ساتھ احسان ایک الٰہی اور انسانی قدر ہے۔ لوگوں سے محبت کرنا، ان کی خدمت کرنا اور ان سے ہمدردی رکھنا، اسلام کے نزدیک ایک کمال ہے، ایک قدر ہے اور ایک نیکی ہے لیکن اسلام سب کچھ چھوڑ کر فقط محبت اور احسان پر انحصار کرنے کے خلاف ہے:

> اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور نیکی کرنے اور قرابتداروں کو کچھ دینے کا حکم کرتا ہے۔ وہ بدکاری، بری حرکتوں اور سرکشی کرنے سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں آگاہ کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۹۰)

خدا تمہیں عدل کا حکم دیتا ہے یعنی تم سے لوگوں کے حقوق کی رعایت کرو، ان کے حقوق کی حد میں قدم نہ رکھو اور ان کے ساتھ احسان کرو۔ پھر نہ صرف یہ کہ لوگوں کے حقوق پر تجاوز نہ کرو بلکہ اپنے مشروع حقوق میں سے بھی انہیں کچھ دیدو۔

ایثار ایک قرآنی اصول ہے یعنی انسان جو چیز خود رکھتا ہو وہ اس کا اپنا مال ہو اور اسے اس کی اشد ضرورت بھی ہو، پھر بھی وہ اس چیز کے بارے میں دوسروں کی حاجت کو مقدم رکھے۔ ایثار انسانیت کے باشکوہ ترین

مظاہر میں سے ہے اور قرآن مجید نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔

ان انصار کے بارے میں جنہوں نے مہاجرین کو اپنے آپ پر مقدم رکھا، قرآن نے ایک جگہ یوں ارشاد فرمایا ہے:

۲۵ اور چاہے اپنے اوپر تنگی ہی ہو دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں۔ (سورہ حشر۔ آیت ۹)

اسی طرح وہ آیات ہیں جو امام علی مرتضیٰؑ، بی بی فاطمہ زہراؑ اور حسنین علیہم السلام یعنی اہل بیت کی شان میں نازل ہوئیں، ان میں فرماتا ہے:

۲۶ وہ اس (خدا) کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (کہتے ہیں) ہم تو تم کو بس خالص خدا کے لیے کھلاتے ہیں، ہم نہ تم سے بدلہ اور نہ شکر گزاری ہی چاہتے ہیں۔ (سورہ دہر۔ آیت ۸-۹)

حسنین علیہم السلام کی ایک بیماری سے صحت یابی کے بعد، جیسا کہ انہوں نے نذر مانی تھی، علیؑ، زہراؑ اور حسنینؑ روزہ رکھتے ہیں۔ پھر امام علیؑ جو لاتے ہیں اور بی بی زہراؑ اس کی روٹی پکاتی ہیں۔ افطار کے وقت ایک یتیم آتا ہے اور یہ سب اپنا کھانا اٹھا کر اسے دے دیتے ہیں۔ اگلی رات اور پھر اگلی رات کو بھی یہی صورت پیش آتی ہے، حتیٰ کہ مذکورہ آیت نازل ہوتی ہے۔ بہرحال مسئلہ ایثار کا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ایثار ایک بلند ترین انسانی قدر اور مقام ہے۔ اسلام نے بھی ایثار کی تعریف کی ہے اور بالعموم رحم اور مہربانی ایسی چیزیں ہیں جو اسلام کی طرف سے ہمیشہ پیش کی جاتی رہی ہیں۔

پھر ایک دن آپ سنتے ہیں کہ فلاں دوست کی خاطر انہوں نے کئی ہزار روپے خرچ کر دیے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسے سخاوت، انسان دوستی اور عاطفۂ اجتماعی قرار دیں لیکن یہ عاطفۂ اجتماعی نہیں ــــــ یہ خود غرضی ہے، یہ شہرت طلبی ہے اور وہ شخص ایسا اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنا نام بلند کرنا چاہتا ہے۔ اس شخص نے پہلے کئی ایک انسانوں کے حقوق پامال کیے اور پھر ایک شخص کے لیے کچھ رقم خرچ کر دی ہے ــــــ اسے انسان دوستی نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح ہم میں سے بعض افراد کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے ساتھ لگا لاتے ہیں اور اسے مہمان نوازی کا نام دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مرد ہیں اور مرد کے گھر کا دروازہ مہمانوں کے لیے کھلا رہتا ہے۔ یہ بذات خود اچھی بات ہے لیکن ہم اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے۔ وہ عورت جو ہمارے گھر میں ہے، شرعی طور پر ہم اسے حکم دینے کا حق نہیں رکھتے اور وہ مختار ہے کہ اگر اس کی مرضی نہ ہو تو ہمارے گھر کا کوئی کام نہ کرے لیکن ہم مہمانداری کا یہ تمام بوجھ اور مصیبت اس بیچاری عورت پر ڈال دیتے ہیں۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم تو بڑے مہمان نواز ہیں۔ مگر وہ مہمان نوازی جس کے نتیجے میں ایک انسان پر ظلم ہوتا ہو مہمان نوازی نہیں ہے۔

اب ذرا علی ابن ابی طالبؑ کو دیکھیے کہ آپ گھر کے کام میں اپنی زوجہ حضرت زہراؑ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یہ وہ کام ہیں جو ان پاک بی بی نے خود اپنی مرضی سے اپنے ذمے لیے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ تاکہ آپ کی عزیز شریکۂ حیات پر کام کاج کا سارا بوجھ نہ پڑے یہیں اگر کوئی انسان یہ چاہے کہ اس کے کام انسانی جذبے کی بنیاد پر ہوں تو پہلے

اسے عدالت کے مرحلے سے گزرنا چاہیے ۔ یعنی وہ عادل ہو اور کسی کے حق پہ تجاوز نہ کرے ۔ پھر اگر وہ اپنے مشروع حقوق میں سے ایثار کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے ۔

ہم کئی ایک بزرگ علماء کو جانتے ہیں جو اس بات کے پابند تھے کہ کسی کے حق پر معمولی سے معمولی تجاوز بھی نہ کریں ۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنے گھر میں بھی اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ کسی ایسے کام کے بارے میں جو خود ان سے متعلق ہو ایک بار بھی اپنی بیوی، بیٹی یا بیٹے کو حکم دیں ۔ البتہ ان کا یہ اصول اس کام کے متعلق تھا جو خود ان کے اپنے کرنے کا ہوتا تھا اور اس کام کے بارے میں نہیں جس سے دوسروں کی تربیت مقصود ہوتی تھی ۔

مرحوم حاج میرزا محمد تقی شیرازی جو بزرگ مراجع میں سے تھے، ان کے بارے میں مرحوم استاد حاج شیخ عبدالکریم حائری نے نقل کیا ہے : وہ اپنے کام کے لیے کبھی کسی کو حکم نہیں دیتے تھے ۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو ان کے گھر والوں نے ان کے لیے کھانا تیار کیا، بچے کھانا لے کر آئے اور ان کے نزدیک رکھ کر چلے گئے ۔ چونکہ وہ خود بیمار اور صاحبِ فراش تھے اس لیے اٹھ نہ سکے اور اسی طرح دو تین گھنٹے گزر گئے ۔ جب وہ لوگ ان کے پاس آئے تو دیکھا کہ کھانا ٹھنڈا ہو چکا ہے اور انہوں نے نہیں کھایا ۔ چونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی بچے کو آواز دیتے کہ آ کر یہ کام میرے لیے کرو اس لیے انہیں شبہ ہوا کہ آیا اس کام کے لیے ان کا کسی بچے کو بلانا جائز ہے یا نہیں ؟ پس ایثار اس وقت ایثار ہے جب خود نمائی اور خود غرضی کے لیے نہ ہو ۔

رسول اکرمؐ کے بعض اصحاب جو جنگ موتہ میں شریک تھے، ان کے بارے میں ایک داستان نقل کی گئی ہے جو واقعی بڑی حیرت انگیز ہے اور جو کچھ انہوں نے کر دکھایا اسے صحیح معنوں میں ایثار کہتے ہیں۔

جنگ موتہ میں کچھ اشخاص زخمی ہو کر گر گئے تھے۔ چونکہ زخمی کے بدن سے خون خارج ہو جاتا ہے، اس لیے اسے سخت پیاس لگتی ہے اور زخمی شخص کو پانی کی حاجت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کو زخمی ہونے اور بدن سے زیادہ خون بہ جانے سے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ تب ایک شخص نے پانی سے بھرا ہوا برتن اٹھایا اور ان زخمی مسلمانوں میں پانی تقسیم کرنے لگا۔ وہ ان کے قریب سے گزر رہا تھا تاکہ اگر کسی زخمی کو پانی کی ضرورت ہو تو اسے پلا دے۔ جب وہ ایک زخمی کے پاس پہنچا اور دیکھا کہ وہ پیاسا ہے تو اس نے اسے پانی پلانا چاہا۔ لیکن اس زخمی نے ایک اور زخمی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ پیاسا ہے۔ وہ فوراً اس زخمی کے پاس پہنچا، لیکن اس نے ایک تیسرے کے بارے میں کہا کہ وہ اس پانی کا مجھ سے زیادہ مستحق ہے۔ جب وہ پانی لے کر تیسرے شخص کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ دوسرے کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بھی مر چکا ہے۔ اسے کہتے ہیں ایثار اور قربانی ــــــ یعنی انتہائی ضرورت کے باوجود بھی دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم رکھنا!

وہ دو اعتراض جو ہم نے مکتب قدرت پر کیے تھے۔ بعینہ وہی دو اعتراض مکتب محبت پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ مکتب محبت بھی ایک قدر کا حامل ہے۔ یعنی اس نے باقی قدریں بھلا کر فقط خدمت و محبت کی قدر کو اپنا

لیا ہے۔ محبت انسان کے لیے کمال ہے اور فیاضی انسان کے لیے کمال ہے اور جیسے کہ فلسفیوں نے ثابت کیا ہے کہ فیاضی، جود اور بخشش صفات کمالیہ میں سے ایک صفت ہے جو ذات باری تعالیٰ کے لیے بھی ہے۔ لہٰذا ذات باری تعالیٰ خود فیاض علی الاطلاق ہے۔ کیونکہ فیاضی خود اس کی صفتِ کمال ہے۔ پس اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے یہ غلطی کی ہے کہ دوسری قدروں کو فراموش کر دیا اور کہا کہ خدمت خلق کے علاوہ کوئی دوسری چیز وجود نہیں رکھتی اور انسانیت اسی پر منحصر ہے۔

یہ ایک غلطی اور بہت بڑی غلطی ہے ـــــ جیسے کہ مکتب قدرت نے بھی ایسی ہی بڑی غلطی کی اور کہا تھا کہ زور اور قدرت ہی سبھی کچھ ہے۔ یوں انہوں نے انسان کی روحانی اور نفسیاتی قوتوں کو فراموش کر دیا تھا۔ چنانچہ خدمت خلق کے سلسلے میں بھی ایک ایسی ہی بڑی غلطی وجود رکھتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی وضاحت کر دوں۔

وہ لوگ نعرہ لگاتے ہیں: خدمت خلق کا مطلب کیا ہے؟ آپ بتائیں کہ کس چیز میں خلق کی خدمت؟ ذرا وضاحت کر دیں کہ کس چیز میں ہم خلق خدا کی خدمت کریں۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ خلق خدا کے پیٹ کی خدمت یعنی خلق خدا بھوکی ہے اور اس کے پیٹ کی خدمت کرنی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھوکے انسانوں کو سیر ہونا چاہیے۔ پھر خلق خدا کے تن کی خدمت کرنی چاہیے اور لوگ ننگے ہیں تو انہیں پوشاک مہیا ہونی چاہیے۔ انہیں گرمی اور سردی سے محفوظ ہونا چاہیے، اس لیے ان کے پاس رہنے کا ٹھکانا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انہیں آزادیٔ فکر وعمل میسر نہیں ہے اور وہ انہیں آزادی ملنی

چاہیے وغیرہ، سب کچھ درست ہے اور خلق خدا کی خدمت ہے۔ اس مقام پہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے: اس بات کا آخری نتیجہ کیا ہے؟ کیا بس یہی کہ ہم نے خلق خدا کی حاجتوں میں سے ایک حاجت پوری کردی؟ اور ہمارا یہ عمل احسان اور بھلائی ہے۔ لیکن اگر خلق خدا خود اس حالت میں ہو کہ خود اپنی خدمت نہ کرے، لوگ خود اپنے دشمن ہوں۔ یعنی وہ نادانی اور جہالت سے ایسے کام کریں کہ خود اپنے بدترین دشمن بن گئے ہوں۔ گویا کہ انہوں نے ایسا راستہ اختیار کر رکھا ہو کہ نہ فقط یہ کہ وہ اپنی خوش بختی کے راستے پر نہ ہوں بلکہ اپنی اور عالم بشریت کی تباہی کے راستے پر چل رہے ہوں۔ اس صورت میں کیا ان سب باتوں کے باوجود ہم اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہیں کہ خلق خدا کی خدمت کرنی چاہیے۔ ہمیں ان کے ہدف سے کیا غرض؟ ہمیں چاہیے کہ ان کے پیٹ کو سیر کردیں۔ جب ان کا پیٹ بھر جائے تو وہ کس راستے پر چلتے ہیں، ان کا ہدف کیا ہوتا ہے اور اس وقت وہ کس راستے پر چل رہے ہیں، کیا ان چیزوں سے ہمیں کوئی مطلب نہیں؟ یا بات یہ نہیں ہے اور انسانوں کی خدمت اس شرط کے ساتھ ہونی چاہیے کہ وہ حقیقت میں ان کی انسانیت کی خدمت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی خدمت کے ذریعے انسانیت کی خدمت ہو، یعنی انسانی قدروں کی خدمت ہو اور خلق خدا کی خدمت ہو۔

یہ وہ طریقہ ہے کہ اس میں ایک انسانی قدر دوسری انسانی قدروں کے راستے پر چلتی ہے۔ اگر وہ دوسری انسانی قدروں کے راستے پر نہ چلے تو پھر خلق خدا کی خدمت کرنا ایک پیسہ بھر بھی قیمت نہیں رکھتا۔ یہاں مجھے یہ بات کرنی چاہیے جو کچھ لوگ پوچھتے ہیں کہ جب لوگ خلق خدا کے خیر خواہ ہوں اور اس کی خدمت

کریں تو کیا درحقیقت خدا کے تمام احکام، ایمان کی اصل اور تمام عبادتیں اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں؟ ہاں ہمیں چاہیے کہ ایمان رکھتے ہوں تاکہ ایمان کے زیر سایہ خلق خدا کی خدمت کریں۔ کیونکہ عبادت کے زیر سایہ خلق خدا کی بہتر خدمت کی جا سکتی ہے۔ تمام اسلامی احکامات اور بنی نوع انسان کے بزرگوں کے تمام اقوال میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس چیز کی تمہید ہے کہ خلق خدا کی خدمت کی جائے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ خود خلق خدا بالآخر کیا بننا چاہتی ہے۔ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ خلق خدا کی خدمت کی جائے تو آخر خود خلق خدا کیا ہدف رکھتی ہے اور کیا چاہتی ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے! ایمان اور عبادت خدمت خلق کی تمہید نہیں ہے، بلکہ خدمت خلق ایمان اور عبادت کی تمہید ہے۔ خدمت خلق عقلمند ہونے، عالم ہونے اور دوسری قدروں کو اپنانے کا نام ہے۔ یعنی ہمیں مخلوق کی خدمت کرنی چاہیے تاکہ اسے ایمان، خداپرستی اور دوسری قدروں کی طرف مائل کر سکیں۔ خدمت خلق ایمان کیلئے تمہید اور بنیاد ہے نہ کہ ایمان اسکی تمہید ہے۔ خواہ ان میں سے کوئی بھی (دراصل) کسی دوسرے کی تمہید نہ ہو۔

اسلام کی نظر میں خدمت خلق ایمان کی تمہید ہے اور ایمان خدمت خلق کی تمہید نہیں ہے۔ اسلام کا مکتب یہی ہے اور وہ یہی بات کہتا ہے اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو اس کا یہی مفہوم نکلتا ہے۔ لیکن اگر مکتب خدمت و محبت کی بات مانی جائے تو ہمیں انسانوں کی انسانیت سے قطع کر کے انہیں دیکھنا ہوگا۔ گویا کہ ہمیں بوعلی سینا اور شومیے کو ایک ہی سطح پر رکھ کر دیکھنا چاہیے کیونکہ وہ دونوں انسان ہیں، دونوں پیٹ رکھتے ہیں، دونوں بھوکے ہیں اور ممکن ہے کہ ننگے بھی ہوں۔ مکتب محبت ان دونوں میں کوئی فرق

روا نہیں رکھتا کہ علم الحیات کے مطابق وہ دونوں ایک ہی طرح کے جذبات رکھتے ہیں۔ میں نے بعض چوٹی کے مجلات دیکھے ہیں جو اسلامی عرفان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عرفاء کوئی معمولی درجے کے لوگ نہیں بلکہ انہوں نے بڑی ہی بلند باتیں کہی ہیں۔ انہوں نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں کہ عرفان آخرکار خدمت خلق کی طرف توجہ کرتا ہے لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے! عرفان آخر میں یا وسط میں نہیں بلکہ ابتداء ہی میں خدمت خلق کی طرف توجہ کرتا ہے یعنی خدمت خلق عرفان کی انتہا نہیں اور یہ اس کے ابتدائی کاموں میں سے ہے۔ ہم اس مطلب کو اپنی تعبیر کے مطابق یوں بھی ادا کرسکتے ہیں کہ خدا کے نزدیک ہونا خدمت خلق کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ خدمت خلق خدا کے نزدیک ہونے کا وسیلہ ہے۔ پس مکتب محبت پر بھی دو اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ محبت کو انسانیت کی واحد قدر مانتے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ محبت کو انسانیت کی انتہا تصور کرتے ہیں۔ جبکہ اسلام ان دونوں نظریوں کو قبول نہیں کرتا۔ انسان اور اسلام محبت اور خدمت خلق کو قبول کرتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے لیکن یہ انسانی قدر ہے کہ جسے شروع ہی سے اختیار کرنا چاہیے نہ کہ یہ انسانیت کی سیر کا انتہائی مقام ہو۔ گویا کہ انسانیت کی سیر خدمت خلق سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اصلی ہدف اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

النصوص العربية

۱۔ وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ.

۲۔ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ.

۳۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ. وَلَا یَزِیْدُ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا.

۴۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا.

۵۔ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا.

۶۔ وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ. یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ. هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ.

۷۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ.

۸۔ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ.

۹۔ وَنَادَیْنَاهُ اَنْ یَّآ اِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا.

۱۰۔ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَّلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ.

۱۱۔ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا.

۱۲ه لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ. وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتَابِ وَالنَّبِيّٖنَ. وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ. وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ.

۱۳ه اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا الدُّنْيَا دَارُ مَجَازٍ وَالْاٰخِرَةُ دَارُ قَرَارٍ فَخُذُوْا مِنْ مَمَرِّكُمْ لِمَقَرِّكُمْ وَلَا تَهْتِكُوْا اَسْتَارَكُمْ عِنْدَ مَنْ يَّعْلَمُ اَسْرَارَكُمْ وَاَخْرِجُوْا مِنَ الدُّنْيَا قُلُوْبَكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَخْرُجَ مِنْهَا اَبْدَانُكُمْ فَفِيْهَا اُخْتُبِرْتُمْ وَلِغَيْرِهَا خُلِقْتُمْ.

۱۴ه لَنْ تُقَدَّسَ اُمَّةٌ لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيْفِ فِيْهَا حَقُّهٗ مِنَ الْقَوِيِّ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ.

۱۵ه هَجَمَ بِهِمُ الْعِلْمُ عَلٰى حَقِيْقَةِ الْبَصِيْرَةِ وَبَاشَرُوْا رُوْحَ الْيَقِيْنِ وَاسْتَلَانُوْا مَا اسْتَعْوَرَهُ الْمُتْرَفُوْنَ وَاَنِسُوْا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْهُ الْجَاهِلُوْنَ وَصَحِبُوا الدُّنْيَا بِاَبْدَانٍ اَرْوَاحُهَا مُعَلَّقَةٌ بِالْمَحَلِّ الْاَعْلٰى.

۱۶ه عَجَبًا لِّابْنِ النَّابِغَةِ يَزْعَمُ لِاَهْلِ الشَّامِ اَنَّ فِيَّ دُعَابَةً وَاَنِّى اِمْرُءٌ تِلْعَابَةٌ اُعَافِسُ وَاُمَارِسُ لَقَدْ قَالَ بَاطِلًا وَنَطَقَ اٰثِمًا.

۱۷ه هُوَ الْبَكَّآءُ فِى الْمِحْرَابِ لَيْلًا
هُوَ الضَّحَّاكُ اِنْ جَدَّ الضِّرَابُ

۱۸ه اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِىَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا. اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا.

۱۹؎ جَمَعتَ فِی صِفَاتِکَ الْاَضْدَادُ
وَلِهٰذَا عَزَّتْ لَکَ الْاَنْدَادُ

۲۰؎ خُلُقٌ یَخْجِلُ النَّسِیْمِ مِنَ اللُّطْفِ
وَبَعْثٌ یَذُوْبُ مِنْهُ الْجَمَادُ

۲۱؎ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ

۲۲؎ مَلَکَتْنِیْ عَیْنِیْ وَاَنَا جَالِسٌ فَسَنَحَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَاذَا لَقِیْتُ مِنْ اُمَّتِکَ مِنَ الْاَوَدِ وَاللَّدَدِ؟ فَقَالَ اُدْعُ عَلَیْهِمْ فَقُلْتُ اَبْدَلَنِی اللّٰهُ بِهِمْ خَیْرًا مِّنْهُمْ وَاَبْدَلَهُمْ بِیْ شَرًّا لَّهُمْ مِّنِّیْ

۲۳؎ دَعُوْهُنَّ فَاِنَّهُنَّ صَوَائِحُ تَتْبَعُهَا نَوَائِحُ۔

۲۴؎ وَمَا کُنْتُ اِلَّا کَقَارِبٍ وَّرَدَ وَطَالِبٍ وَّجَدَ

۲۵؎ مَازِلْتُ اَفْحَصُ عَنْ مَّکْنُوْنِ الْاَمْرِ وَاَبَی اللّٰهُ اِلَّا اِخْفَاءً۔

۲۶؎ خَلُّوْا سَبِیْلَ الْمُؤْمِنِ الْمُجَاهِدِ فِی اللّٰهِ لَا یَعْبُدُ غَیْرَ الْوَاحِدِ
وَیُوْقِظُ النَّاسَ اِلَی الْمَسَاجِدِ

۲۷؎ تَهَدَّمَتْ وَاللّٰهِ اَرْکَانُ الْهُدٰی وَانْطَمَسَتْ اَعْلَامُ التُّقٰی وَانْفَصَمَتِ الْعُرْوَةُ الْوُثْقٰی قُتِلَ ابْنُ عَمِّ الْمُصْطَفٰی قُتِلَ الْوَصِیُّ الْمُجْتَبٰی قُتِلَ عَلِیُّ الْمُرْتَضٰی قَتَلَهٗ اَشْقَی الْاَشْقِیَاءِ۔

۲۸؎ صَدِیْقُ کُلِّ امْرِیءٍ عَقْلُهٗ وَعَدُوُّهٗ جَهْلُهٗ۔

۲۹؎ اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ اَوْعِیَةٌ فَخَیْرُهَا اَوْعَاهَا

۳۰؎ اَللّٰهُمَّ بَلٰی لَا تَخْلُوا الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ اِمَّا ظَاهِرًا مَّشْهُوْرًا وَّاِمَّا خَائِفًا مَّغْمُوْرًا لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰهِ وَبَیِّنَاتُهٗ

وَكَمْ ذَا وَ اَيْنَ اُولٰئِكَ ؟ اُولٰئِكَ ـ وَاللهِ الْاَقَلُّوْنَ عَدَدًا وَّ الْاَعْظَمُوْنَ عِنْدَ اللهِ قَدْرًا يَحْفَظُ اللهُ بِهِمْ حُجَجَهٗ وَبَيِّنَاتِهٖ حَتّٰى يُوْدِعُوْهَا نُظَرَآءَهُمْ وَ يَزْرَعُوْهَا فِىْ قُلُوْبِ اَشْبَاهِهِمْ هَجَمَ بِهِمُ الْعِلْمُ عَلٰى حَقِيْقَةِ الْبَصِيْرَةِ ۔

۳۱؎ وَبَاشَرُوْا رُوْحَ الْيَقِيْنِ وَاسْتَلَانُوْا مَا اسْتَعْوَرَهُ الْمُتْرَفُوْنَ وَ وَاَنِسُوْا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْهُ الْجَاهِلُوْنَ ۔

۳۲؎ وَ صَحِبُوا الدُّنْيَا بِاَبْدَانٍ اَرْوَاحُهَا مُعَلَّقَةٌ بِالْمَحَلِّ الْاَعْلٰى ۔

۳۳؎ اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔

۳۴؎ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۔

۳۵؎ طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى

۳۶؎ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔

۳۷؎ وَمَا ظَنَنْتُ اَنَّكَ تُجِيْبُ اِلٰى طَعَامِ قَوْمٍ عَآئِلُهُمْ مَجْفُوٌّ وَغَنِيُّهُمْ مَدْعُوٌّ ۔

۳۸؎ وَلَوْ شِئْتُ لَاهْتَدَيْتُ الطَّرِيْقَ اِلٰى مُصَفّٰى هٰذَا الْعَسَلِ وَ لُبَابِ هٰذَا الْقَمْحِ وَنَسَآئِجِ هٰذَا الْقَزِّ وَلٰكِنْ هَيْهَاتَ اَنْ يَّغْلِبَنِىْ هَوَاىَ وَيَقُوْدَنِىْ جَشَعِىْ ۔

۳۹؎ وَلَعَلَّ بِالْحِجَازِ اَوِ الْيَمَامَةِ مَنْ لَّا طَمَعَ لَهٗ فِى الْقُرْصِ وَلَا عَهْدَ لَهٗ بِالشِّبَعِ ۔

۴۰؎ اَوَ اَبِيْتَ مِبْطَانًا وَّحَوْلِىْ بُطُوْنٌ غَرْثٰى وَاَكْبَادٌ حَرّٰى ۔

٤١ـه أَاَقْنَعُ مِنْ نَفْسِيْ بِاَنْ يُّقَالَ هٰذَا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا اُشَارِكُهُمْ فِيْ مَكَارِهِ الدَّهْرِ.

٤٢ـه وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ.

٤٣ـه مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ.

٤٤ـه سَنُرِيْهِمْ اٰيَاتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ.

٤٥ـه لَا يُعْرَفُ مَا هُنَالِكَ اِلَّا بِمَا هٰهُنَا

٤٦ـه اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ.

٤٧ـه مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا.

٤٨ـه اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ.

٤٩ـه سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ.

سَعِيْدًا .

۷۸ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ .

۷۹ هُوَالَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ .

۸۰ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّا اِبْلِيْسَ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ .

۸۱ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ .

۸۲ وَمَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا .

۸۳ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيَاتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى .

۸۴ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ .

۸۵ يَتَنَسَّمُوْنَ بِدُعَآئِهٖ رُوْحَ التَّجَاوُزِ .

۸۶ اِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى جَعَلَ الذِّكْرَ جِلَآءً لِّلْقُلُوْبِ تَسْمَعُ بِهٖ بَعْدَ الْوَقْرَةِ وَتُبْصِرُ بِهٖ بَعْدَ الْعَشْوَةِ وَتَنْقَادُ بِهٖ بَعْدَ الْمُعَانَدَةِ وَمَا بَرِحَ لِلّٰهِ عَزَّتْ اٰلَائُهٗ فِى الْبُرْهَةِ بَعْدَ الْبُرْهَةِ وَفِىْ اَزْمَانِ الْفَتَرَاتِ عِبَادٌ نَاجَاهُمْ فِىْ فِكْرِهِمْ وَكَلَّمَهُمْ فِىْ ذَاتِ عُقُوْلِهِمْ .

۸۷ اِبْتَدَعَ بِقُدْرَتِهِ الْخَلْقَ اِبْتِدَاعًا وَّاخْتَرَعَهُمْ عَلٰى مَشِيَّتِهٖ

اختراعاً ثُمَّ سلکَ بهم طریقَ ارادتِهِ و بعثهم سبیلَ محبّتِهِ

۸۸ھ صیرورۃُ الانسانِ عالماً عقلیّاً مضاهیاً للعالمِ العینی۔

۸۹ھ یا ایُّها الانسانُ انّکَ کادحٌ الیٰ ربّکَ کدحاً فملاقیه۔

۹۰ھ العبودیّةُ جوهرةٌ کنهها الرّبوبیّة۔

۹۱ھ قد افلحَ من زکّاها و قد خابَ من دسّاها۔

۹۲ھ من اخلصَ للّهِ اربعینَ یوماً فجّرَ اللّهُ ینابیعَ الحکمةِ من قلبِهِ علیٰ لسانِهِ۔

۹۳ھ قل انَّ صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للّهِ ربِّ العالمین

۹۴ھ اتیناهُ رحمةً من عندنا و علّمناهُ من لدنّا علماً۔

۹۵ھ لولا انَّ الشّیاطینَ یحومونَ حولَ قلوبِ بنی آدمَ لنظروا الیٰ ملکوتِ السّموات۔

۹۶ھ لولا تمریغٌ فی قلوبکم او تزیدکم فی الحدیثِ لسمعتم ما اسمع۔

۹۷ھ لولا تکثیرٌ فی کلامکم و تمریجٌ فی قلوبکم لرأیتم ما اری و لسمعتم ما اسمع۔

۹۸ھ و لقد سمعتُ رنّةَ الشّیطانِ حینَ نزلَ الوحیُ علیهِ صلّی اللّهُ علیهِ و آلِهِ فقلتُ یا رسولَ اللّهِ ما هذهِ الرّنّة؟ فقال: هذا الشّیطانُ قد ایسَ من عبادتِهِ انّکَ تسمعُ ما اسمعُ و تریٰ ما اریٰ الّا انّکَ لستَ بنبیٍّ و لٰکنّکَ لوزیرٌ و انّکَ لعلیٰ خیرٍ۔

۹۹ھ لصافحتکم الملائکةُ و لمشیتم علی الماء۔

۱۰۰؎ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ.

۱۰۱؎ قَدْ أَحْيَا عَقْلَهُ وَأَمَاتَ نَفْسَهُ حَتَّى دَقَّ جَلِيلُهُ وَلَطُفَ غَلِيظُهُ وَبَرَقَ لَهُ لَامِعٌ كَثِيرُ الْبَرْقِ فَأَبَانَ لَهُ الطَّرِيقَ وَسَلَكَ بِهِ السَّبِيلَ وَتَدَافَعَتْهُ الْأَبْوَابُ إِلَى بَابِ السَّلَامَةِ وَدَارِ الْإِقَامَةِ وَثَبَتَتْ رِجْلَاهُ بِطُمَأْنِينَةِ بَدَنِهِ فِي قَرَارِ الْأَمْنِ وَالرَّاحَةِ بِمَا اسْتَعْمَلَ قَلْبَهُ وَأَرْضَى رَبَّهُ.

۱۰۲؎ أَيَكُونُ لِغَيْرِكَ مِنَ الظُّهُورِ مَا لَيْسَ لَكَ حَتَّى يَكُونَ هُوَ الْمُظْهِرَ لَكَ مَتَى غِبْتَ حَتَّى تَحْتَاجَ إِلَى دَلِيلٍ يَدُلُّ عَلَيْكَ وَمَتَى بَعُدْتَ حَتَّى تَكُونَ الْآثَارُ هِيَ الَّتِي تُوصِلُ إِلَيْكَ عَمِيَتْ عَيْنٌ لَا تَرَاكَ عَلَيْهَا رَقِيبًا.

۱۰۳؎ وَلَا تُدْرِكُهُ الْعُيُونُ بِمُشَاهَدَةِ الْعِيَانِ وَلَكِنْ رَأَتْهُ الْقُلُوبُ بِحَقَائِقِ الْإِيمَانِ.

۱۰۴؎ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَلُيُوثٌ بِالنَّهَارِ.

۱۰۵؎ التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ.

۱۰۶؎ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ.

۱۰۷؎ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ.

۱۰۸؎ دَوَاؤُكَ فِيكَ وَمَا تُبْصِرُ وَدَاؤُكَ مِنْكَ وَمَا تَشْعُرُ
وَأَنْتَ الْكِتَابُ الْمُبِينُ الَّذِي بِأَحْرُفِهِ يَظْهَرُ الْمُضْمَرُ
أَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ وَفِيكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ

۱۰۹؎ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ.

۱۱۰؎ اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ

۱۱۱؎ اَلدُّنْيَا مَتْجَرُ أَوْلِيَاءِ اللّٰهِ

۱۱۲؎ أَيُّهَا الذَّامُّ لِلدُّنْيَا الْمُغْتَرُّ بِغُرُورِهَا الْمَخْدُوعُ بِأَبَاطِيلِهَا أَتَغْتَرُّ بِالدُّنْيَا ثُمَّ تَذُمُّهَا أَنْتَ الْمُتَجَرِّمُ عَلَيْهَا أَمْ هِيَ الْمُتَجَرِّمَةُ عَلَيْكَ؟

۱۱۳؎ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ.

۱۱۴؎ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ.

۱۱۵؎ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ.

۱۱۶؎ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ نَارٌ حَامِيَةٌ

۱۱۷؎ فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ.

۱۱۸؎ أَعْدَىٰ عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ.

۱۱۹؎ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ.

۱۲۰؎ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ.

۱۲۱؎ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ.

۱۲۲ھ مَرْحَبًا بِقَوْمٍ قَضَوُا الْجِهَادَ الْاَصْغَرَ وَبَقِيَ عَلَيْهِمُ الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ۔

۱۲۳ھ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔

۱۲۴ھ قُلْ اِنَّ الْخَاسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ۔

۱۲۵ھ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔

۱۲۶ھ اُطْلُبُوا الْحَوَائِجَ بِعِزَّةِ الْاَنْفُسِ فَاِنَّ الْاُمُوْرَ تَجْرِيْ بِالْمَقَادِيْرِ

۱۲۷ھ اَلْمَوْتُ فِيْ حَيَاتِكُمْ مَقْهُوْرِيْنَ وَالْحَيَاةُ فِيْ مَوْتِكُمْ قَاهِرِيْنَ۔

۱۲۸ھ اَلْمَوْتُ فِيْ عِزٍّ خَيْرٌ مِّنْ حَيَاةٍ فِيْ ذُلٍّ

۱۲۹ھ اَلَا وَاِنَّ الدَّعِيَّ بْنَ الدَّعِيِّ قَدْ رَكَزَنِيْ بَيْنَ اثْنَتَيْنِ بَيْنَ السِّلَّةِ وَالذِّلَّةِ وَهَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ يَاْبَى اللّٰهُ ذٰلِكَ لَنَا وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَحُجُوْرٌ طَابَتْ وَطَهُرَتْ۔

۱۳۰ھ لَا وَاللّٰهِ لَآ اُعْطِيْكُمْ بِيَدِيْ اِعْطَآءَ الذَّلِيْلِ وَلَآ اَفِرُّ فِرَارَ الْعَبِيْدِ۔

۱۳۱ھ اِنَّ الْحَيَاةَ عَقِيْدَةٌ وَّجِهَادٌ۔

۱۳۲ھ اَلْمَوْتُ خَيْرٌ مِّنْ رُكُوْبِ الْعَارِ
وَالْعَارُ اَوْلٰى مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ

۱۳۳ھ فَمَنْ كَانَ بَاذِلًا فِيْنَا مُهْجَتَهٗ مُوَطِّنًا عَلٰى لِقَآءِ اللّٰهِ نَفْسَهٗ فَلْيَرْحَلْ مَعَنَا فَاِنِّيْ رَاحِلٌ مُّصْبِحًا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ۔

۱۳۴ھ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ

يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ ۔

۱۳۵؎ يَاكُمَيْلُ (ابْنَ زِيَادٍ)! مَعْرِفَةُ الْعِلْمِ دِيْنٌ يُّدَانُ بِهٖ بِهٖ يَكْسِبُ الْإِنْسَانُ الطَّاعَةَ فِيْ حَيَاتِهٖ وَجَمِيْلَ الْأُحْدُوْثَةِ بَعْدَ وَفَاتِهٖ وَالْعِلْمُ حَاكِمٌ وَّالْمَالُ مَحْكُوْمٌ عَلَيْهِ ۔

۱۳۶؎ مَنْ عَلَّمَنِيْ حَرْفًا فَقَدْ صَيَّرَنِيْ عَبْدًا ۔

۱۳۷؎ يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ ۔

۱۳۸؎ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۔

۱۳۹؎ وَأَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ۔

۱۴۰؎ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۔

۱۴۱؎ لَا يَنْبَغِيْ لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَّكُوْنَ بَخِيْلًا وَّلَا جَبَانًا ۔

۱۴۲؎ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ ۔

۱۴۳؎ اَلْمُؤْمِنُ نَفْسُهٗ أَصْلَبُ مِنَ الصَّلْدِ ۔

۱۴۴؎ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ فَوَّضَ إِلَى الْمُؤْمِنِ أُمُوْرَهٗ كُلَّهَا وَلَمْ يُفَوِّضْ إِلَيْهِ أَنْ يَّكُوْنَ ذَلِيْلًا أَمَا تَسْمَعُ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ فَالْمُؤْمِنُ يَكُوْنُ عَزِيْزًا وَلَا يَكُوْنُ ذَلِيْلًا إِنَّ الْمُؤْمِنَ أَعَزُّ مِنَ الْجَبَلِ اَلْجَبَلُ يُسْتَفَلُّ مِنْهُ بِالْمِعْوَلِ وَالْمُؤْمِنُ لَا يُسْتَفَلُّ مِنْ دِيْنِهٖ شَيْءٌ ۔

۱۴۵؎ فَوَاللّٰهِ مَا غُزِيَ قَوْمٌ قَطُّ فِيْ عُقْرِ دَارِهِمْ إِلَّا ذَلُّوْا ۔

۱۴۶ لَا يَمْنَعُ الضَّيْمَ الذَّلِيْلُ وَلَا يُدْرِكُ الْحَقَّ اِلَّا بِالْجِدِّ.

۱۴۷ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِیْ غَيْرِ مَوْطِنٍ لَنْ تُقَدَّسَ اُمَّةٌ لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيْفِ فِيْهَا حَقُّهٗ مِنَ الْقَوِيِّ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ.

۱۴۸ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ يَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ

۱۴۹ اَشْجَعُ النَّاسِ مَنْ غَلَبَ هَوَاهُ.

۱۵۰ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ.

۱۵۱ كُوْنَا لِلظَّالِمِ خَصْمًا وَّلِلْمَظْلُوْمِ عَوْنًا.

۱۵۲ اَلْغِيْبَةُ جُهْدُ الْعَاجِزِ.

۱۵۳ مَا زَنٰی غَيُوْرٌ قَطُّ.

۱۵۴ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ.

۱۵۵ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا.